پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

ابتدائیہ

سچی کہانیاں

مغرب سے انتخاب

ناول

مستقل سلسلے

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز، ای میل Info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

کچھ توجہ ادھر بھی ......!!

بھارت نے کبھی بھی پاکستان کے وجود کو خوش دلی سے تسلیم نہیں کیا۔ وہ دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا بلکہ اپنی سازشوں کی منصوبہ بندی پر ہر سال کروڑوں روپے خرچ کرتا ہے جو ان کے دفاعی بجٹ کا حصہ ہوتا ہے۔ اب تک جتنی وارداتیں بھارت کے مختلف شہروں میں ہوئی ہیں چاہے وہ ممبئی دھماکے ہوں یا مکہ مسجد اجمیر یا مالی گاؤں میں ہونے والے بم دھماکے۔ گجرات کا قتل عام ہو یا سمجھوتہ ایکسپریس کی آتش زدگی ان سب کا ملبہ بھارتی حکمران بڑی آسانی سے بلاتحقیق پاکستان پر ڈال دیتے ہیں اور عالمی سطح پر پاکستان کو بدنام کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں اور جب تمام تر تحقیقات کے بعد خود ان کے منہ پر سیاہی پھیلتی نظر آتی ہے تو کان دبا کر رہ جاتے ہیں۔ اب تک جتنے بھی حادثات بھارت میں رونما ہو چکے ہیں ان سب کا الزام بلاتحقیق اور بعد از تحقیق وہ پاکستانی تنظیموں خصوصاً لشکر طیبہ، حرکت الجہادِ اسلامی وغیرہ پر ڈال کر اپنا منہ کالا کر لیتے ہیں۔

امریکا جس کی آج کل ساری توجہ بھارت پر مرکوز ہے اس کی حمایت میں امریکہ نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں اگر بھارتی حکمران سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہتے ہیں تو امریکا اس کی آنکھ بند کر کے تصدیق کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہوتا ہے۔ اس کے پسِ پردہ کیا امریکی مفادات ہیں اسے سمجھنا ہوگا۔ جس طرح امریکا، کو سوویت یونین متحدہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا ایسے ہی چین، امریکی آنکھوں میں کھٹکتا رہتا ہے۔ پہلے امریکا نے پاکستان کے توسط سے روس کے ساتھ چین کا بھی راستا روکنے کی کوشش کی روس کو تو پاکستان کے توسط سے منتشر کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن چین پر اس طرح کا ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ اب بھارت پر اس کی کرم فرمائیاں صرف اس لیے بڑھ رہی ہیں کہ اس کی طویل سرحدیں چین سے ملحق ہیں اور بھارت خود بھی چین دشمنی میں امریکا سے دو ہاتھ آگے ہی ہے جب کہ پاکستان نے شاہراہ قراقرم بنا کر چین سے دوستی تجارت اور اخوت کے رشتے کو اور مضبوط اور مستحکم کر لیا ہے۔ پاکستان کا یہ عمل امریکا اور اس کے نئے حلیف بھارت کو پسند نہیں ہے۔ پہلے بھارت، امریکا اور اسرائیل کے گٹھ جوڑ سے بلوچستان میں آگ و خون کی ہولی کھیل رہا تھا اور بلوچستان کو مشرقی پاکستان کی طرح الگ کر دینے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا لیکن غیور بلوچوں پر قابو پانے

میں بھارت کو اس طرح کامیابی نہیں ملی جیسے مشرقی پاکستان میں انہیں ملی تھی۔ اب سنا ہے کہ بھارت کی مدد اور تعاون سے امریکا نے پاکستان میں ایک نیا محاذ کھولا ہے شاہراہ قراقرم کو تہس نہس کر دینے اور پاکستان چین کی اس عظیم شہہ رگ کو کاٹ دینے کی مذموم سازشیں ہو رہی ہیں۔ پہلے قدرتی آفات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برساتی پانی کا رخ موڑ کر شاہراہ قراقرم کو ایک بڑی جھیل میں تبدیل کر کے آمد و رفت کا سلسلہ معطل کر دیا۔ اب گلگت بلتستان میں حکومت مخالف تنظیمیں قائم کر کے انہیں فنڈ فراہم کیے جا رہے ہیں تاکہ پاکستان اور چین کے درمیان تجارت کو روکا جا سکے اور دونوں ملکوں کے درمیان قائم ہونے والا نیا تجارتی راستا جو گوادر پورٹ سے چین کو تجارتی راہ داری مہیا کرے گا۔ خصوصاً چین کے وہ علاقے جو گلگت بلتستان سے ملحق ہیں جہاں اسے اپنے اندرونی راستوں سے ضروریات زندگی پہنچانے میں دشواری ہوتی تھی۔ اب اسے گوادر بندرگاہ کے باعث وہاں تک رسائی میں سہولت میسر آئے گی لیکن امریکا اور بھارت کو یہ پسند نہیں چنانچہ انہوں نے اس منصوبہ کو روکنے اور پاک چین تعلقات میں رخنہ ڈالنے کے لیے بلوچستان کے بعد گلگت اور بلتستان کو اپنے نشانے پر رکھ لیا ہے۔ وہاں حکومت کی مخالف تحریکوں کو ہَوا دی جا رہی ہے اور چین کی پاکستان میں بڑھتی ہوئی مقبولیت سے نا صرف بھارت بلکہ امریکا بھی خوف زدگی کا شکار ہو رہا ہے اور اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آیا ہے۔ امریکا میں موجود بلاورستان نیشنل فرنٹ نامی تنظیم کو فعال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس کی سرپرستی امریکی یہودی کر رہے ہیں دوسری طرف گلگت بلتستان کو الگ صوبہ بنانے کی بات بھی بھارت کو پسند نہیں آ رہی۔ ان کے خیال میں تو وہ مقبوضہ کشمیر کا حصہ ہے جس پر خود بھارت کا حق بنتا ہے۔ اس لیے شاید اب بھارتی سازشوں کا مرکز بلوچستان سے تبدیل ہو کر امریکی سرپرستی میں گلگت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارتی حکمران مسلسل یہ کہہ رہے ہیں کہ گلگت میں چینی افواج موجود ہیں جیسا کہ بھارتی فوج کے جنرل کے ٹی پارنائیک کا بیان بھی آیا کہ پاکستان کے شمالی علاقوں میں چینی افواج موجود ہیں حالانکہ چینی افواج تو اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے اپنی سرحدوں میں ہی ہوں گی۔ بھارت اور امریکی یہودی جو اسرائیلی مفادات کے لیے بے دریغ اربوں ڈالر خرچ کر رہے ہیں جنہیں پاکستان کی ایٹمی قوت سے بھی نام نہاد خطرہ لگا رہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ پاکستان اپنے پڑوسیوں سے مل کر رہے اور خطے میں امن و سکون قائم ہو سکے۔ اللہ پاکستان کی حفاظت فرمائے اور پاک چین دوستی کو دشمنوں کی نظرِ بد سے محفوظ رکھے آمین۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

عمران احمد

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ میں نے خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے آپ ارشاد فرماتے تھے کہ "جو کوئی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت و بندگی کے لائق نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں تو اللہ نے اس شخص پر دوزخ کی آگ حرام کردی ہے۔" (مسلم)

عزیزان محترم...... سلامتؑ باشد

ماہ اپریل کا شمارہ حاضر خدمت ہے۔

ہمارا شہر کراچی جو کبھی عروس البلاد، روشنیوں کی دلہن تھا غریبوں کا ان داتا تھا جہاں کبھی دن تو دن راتیں بھی جاگتی تھیں جو پورے ملک کو ستر فیصد ریونیو دیتا تھا۔ جو ماؤں کے خوابوں کو تعبیر دیتا تھا۔ جو بیٹیوں، بہنوں کے ارمانوں کو سنہرے رنگ عطا کرتا تھا آج لہولہو ہے کہیں بم دھماکے ہیں تو کہیں گولیوں کی گھن گرج۔ آج مائیں سہاگنیں اور بہنیں اپنے بچوں اپنے سہاگ اور کڑیل بھائیوں کو امام ضامن باندھ کر رخصت کرتی ہیں کہ نا معلوم شام کو ان کا چہرہ دیکھنے کو ملے نہ ملے۔ ایک دوست کا واہ کینٹ سے فون آیا وہ پوچھ رہے تھے کہ ان واقعات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے کون ذمہ دار ہے اس خون خرابے؟ کوئی اسے غیر ملکی ہاتھ کی کارستانی قرار دیتا ہے تو کوئی اسٹیبلشمنٹ کو الزام دیتا ہے۔ کسی کی رائے ہے کہ یہ اللہ کا عذاب ہے جو ہم پر نازل ہو رہا ہے کیا واقعی یہ سب سچ ہے؟ مگر یہ اللہ کا عذاب کیسے ہوسکتا ہے، ہم تو اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ امت ہیں جس کے بارے میں صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک محفل میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا تھا۔ بتاؤ سب سے زیادہ مجھ سے کون پیار کرتا ہے۔ صحابہ نے فرمایا یا رسول اللہ ہم۔ آپ نے تین مرتبہ سوال کیا اور پھر فرمایا میری وہ امت جس نے نہ تو مجھے دیکھا اور سنا ہوگا بلکہ میرے بارے میں پڑھ کر وہ مجھ پر جان تک نثار کرنے کو تیار ہوں گے۔ ان کا اشارہ ہمارے دور یعنی ہماری طرف تھا۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی جان سے زیادہ پیار کرتے ہیں پھر اللہ نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ پچھلی امتوں کی طرح ہم پر کوئی عذاب نہیں نازل کرے گا۔ یعنی ہم اللہ کے عذاب کا شکار بھی نہیں۔ پھر یہ سب کیا ہے؟ ہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ضرور کہا ہے کہ جیسی قوم ہوگی اس پر ویسے ہی حکمران مسلط کیے جائیں گے۔ اگر یہ عذاب ہے تو خود ہمارا اپنا تخلیق کردہ ہے۔ ہم بلاسٹ کرنے والے باہر سے نہیں آ رہے۔ فائرنگ کرنے والوں نے سلیمانی ٹوپی نہیں پہن رکھی۔ ہم سب کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ بس ان کی طرف انگلی نہیں اٹھاتے دوسرے لفظوں میں ہم سب اس میں ملوث ہیں۔ محترم معراج خالد مرحوم نے جب وہ نگراں وزیر اعظم تھے کیا خوب کہا تھا کہ بحیثیت قوم ہم خود کرپٹ ہیں یہ الگ بات ہے، ہم اپنے گریبانوں میں جھانکنا پسند نہیں کرتے فرصت کی چند گھڑیوں میں سے کچھ لمحے کشید کر کے اپنے گریبانوں میں ضرور جھانکیے اصل مجرم آپ کو نظر آجائے گا۔

عالیہ انعام الٰہی...... کراچی۔ محترم عمران بھائی! السلام علیکم۔ امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ کی طرح دعا گو ہوں کہ وہ آپ کی ترقی اور کامرانی کو قائم و دائم رکھے آمین بھاگتے دوڑتے آج کل کے حالات میں ایک وسیع حلقے کو نئے افق کے دامن سے جوڑے رکھنا ایک کارنامہ ہی تو ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے دور میں قلم کاغذ سے رشتہ استوار رکھنے کی بڑی وجہ "نئے افق" کی صورت میں آپ کی کاوشوں ہی کی وجہ سے ہے۔ یوٹیوب پر اکثریت نجانے کیسی کیسی ویڈیوز اور تصاویر سے استفادہ کرتی ہے۔ ایسے میں ہمیں تو نئے افق کا سرورق ہی خاصا متاثر کن معلوم دیتا ہے۔ اس ماہ بھی جلتی ہوئی مشعلوں، تاریک سی پگڈنڈی، ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں آسمان کو چھوتا ہوا پہاڑ اور خوفناک تاثر والی آنکھیں لیے بھیڑیا کسی بھرپور پراسرار فلم کا منظر پیش کرتا ہوا محسوس ہوا۔ تخیلات کی دنیا میں رہنے والے اس بھرپور منظر نامے کے باعث خود کو کسی بھی دنیا میں جوانوکھی ہے اور پراسرار بھی گھومتے ہوئے محسوس کر سکتے ہیں۔ دستک مشتاق انکل کی دانش وری جو سوچنے کے در وا کرتی ہے ہمیشہ کی طرح پراثر اور پر مغز رہی۔ گفتگو میں ادارے کی جانب سے ہماری دادی کے لیے تعزیت کے الفاظ نے دل کو بڑا کر دیا اور صدمے کو سہنے کی طاقت کو بڑھا دیا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ محمد سلیم اختر کی والدہ کے انتقال

کی خبر بھی انتہائی دکھ میں مبتلا کر گئی اللہ مرحومہ کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین اور ان کے تمام پیارے رشتوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ماؤں کا چلے جانا ایسا ہی ہوتا ہے کہ جیسے دنیا کا ختم ہو جانا اور اس مرحلے کو جھیلنا بڑا ہی کٹھن ہوتا ہے اللہ سب کی ماؤں کو سلامت رکھے۔ شہناز باجی کے قلم کی شمولیت محفل کی رعنائی کو بڑھا دیتی ہے۔ شاذ بھائی کی غیر حاضری تو میری غیر حاضری سے بھی زیادہ طویل ثابت ہوتی ہے اب اللہ نے ان کو خوشی دکھائی ہے تو دل کو واقعتاً بڑی خوشی ہوئی ہے۔ زوبیہ کو بھی بہت مبارک ہو اللہ ان کے آنگن کو خوشیوں کی آماجگاہ بنائے رکھے آمین۔ شاذ بھائی اب اگر بھابی کی ناز برداریوں سے فرصت مل جائے تو محفل میں بھی قدم رنجہ فرما دیں کہ بہت سے لوگ یاد کرتے ہیں۔ شاید بھائی اپنے قلم کی تمام تر خوب صورتی کو جملوں کی صورت میں مربوط کیے نظر آئے ان کے لکھنے کا انداز اور الفاظ کا چناؤ بڑا خوب صورت ہوتا ہے میں تو شاید کبھی بھی ایسا نہ لکھ سکوں۔ شمی کی غیر حاضری دل کو کافی کھلی بہت سارے لوگ غیر حاضر تھے سب کے لیے نیک تمنائیں اور دعائیں کرتے ہیں۔ اقرأ کا سلسلہ نئے افق کے ماتھے پر جھومر کی مانند جگمگاتا محسوس ہوتا ہے۔ جو ہماری تربیت کا سامان پیدا کرتا ہے۔ چچا چراندی میں دہلی کی زبان کی عکاسی کا نیا سلسلہ بڑا زبردست آئیڈیا ہے مگر مشتاق انکل سے بڑی معافی کے ساتھ کہوں گی کہ کردار کے حوالے سے گفتگو تہذیب کے دائرہ کار سے باہر نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ہمارا خود کا تعلق دلی سے ہے۔ بچپن سے گھر میں دلی سے مہمانوں کی آمد و رفت اپنے گھر میں دیکھتے رہے ہیں۔ ان کے مخصوص لہجے سے آشنا رہے ہیں۔ ہماری دادی خاص دہلی والوں کی آئینہ دار شخصیت تھیں اور ان کو دیکھتے ہی ہر کوئی پہچان جاتا تھا کہ ان کا تعلق دلی سے ہے۔ چاچا چراندی کی گفتگو میں دلی کی اردو زبان کی شائستگی کے بجائے ممبئی کی ٹپوری زبان کا اثر زیادہ دکھائی دیا۔ اگر میرا تجزیہ غلط ہے تو کان پکڑ کر معافی مانگتی ہوں کہ آپ کا تجربہ اور آپ کا مشاہدہ بے شک بہت ہے اور میں ایک حقیر اور ناچیز صفحات پر چند آڑھی ٹیڑھی لکیریں کھینچنے والی امید ہے کہ درگزر فرمائیں گے۔ (بی بی! چچا چراندی میں دلی کے کرخنداروں کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ یہ ادبی زبان نہیں، مشتاق احمد قریشی صاحب کا تعلق بھی خاص دلی سے ہے اور وہ دلی کے تمام لہجوں کو جانتے پہچانتے اور اس پر عبور رکھتے ہیں) "مفرور" نوشاد عادل کا تیز رفتار ناول کہ جس کے ساتھ ساتھ بھاگتے بھاگتے سانس پھول گیا اور منزل تک پہنچ کر دل سے صدا آئی دھت تیرے کی اب ایک ماہ مزید انتظار کرو۔ آپ بھی نہ ایک ہی دفعہ مکمل نہیں کراتے اب سی این جی کے انتظار میں لمبی لائن میں کھڑے رہو۔ باقی آئندہ کا دم چھلا لگا کر بد مزہ کر دیا۔ "ملکہ جہنم" نام سے لگا کوئی ڈراؤنی تحریر ہوگی مگر یہ تو واقعی میں بہت خوفناک ثابت ہوئی کہ حالات اور ہوس کے عفریت کے ہاتھوں روندی جانے والی معصوم لڑکی واقعتاً انتقام سے بھرپور چڑیل بن گئی تھی۔ یہ تحریر رونگٹے کھڑے کرنے کو کافی تھی کہ انسان اپنے منصب سے ہٹ کر درندہ بن جائے تو اس سے بڑا عفریت شاید ہی دنیا میں کوئی دوسرا ہو۔ "غلط فہمی" ابتدا میں تو لگا کہ کوئی حادثہ ہے مگر ختم ہوتے ہوتے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر گیا۔ انسانی عقل بھی کیسی تماشے کی چیز ہے ہر منظر دیکھ کر افسانے گھڑ لیا کرتی ہے۔ "تلاش ہتی" محرومیوں کی آنچ میں سلگتے ہوئے دلوں کی آئینہ دار تحریر تھی جس نے آنکھوں کے گوشوں کو نم کر دیا ہم میں سے ہر کوئی نجانے کون کون سی محرومی کی بھٹی میں سلگ رہا ہوتا ہے اور ہمیں خود بھی احساس نہیں ہوتا۔ ہم زندہ تو ہوتے ہیں مگر اصل میں زندگی ہم سے کہیں کھوگئی ہوتی ہے۔ بس جینا جیسے عادت سی بن جاتی ہے۔ مگر تمام رعنائیوں اور تمام جزئیات کے ساتھ جینا کسی کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ "زرق برق" پر اثر اور سادہ رہی حالانکہ موضوع کے اعتبار سے عام سی تھی۔ "اندھا اعتماد" معاشرے کی بگڑتی ہوئی قدروں کی کریہہ صورتی کا آئینہ تھی جو اچھی رہی۔ "ٹھوکریں" بے راہ روی کی دلدل میں اترتے ہوئے ناعاقبت اندیشوں کا قضیہ تھی جنہیں حالات کی طرف سے دی گئی کوئی رعایت بھی راس نہیں آئی۔ "آدھی پٹری" ریاض بٹ کی ہمیشہ کی طرح پہلیاں بجھواتی ہوئی ذہنی جمناسٹک کراتی ہوئی تحریر تھی۔ "آخری خط" اخلاقی تدریس کا مرقع معلوم دی جو کافی پسند آئی۔ "شکنجہ" کا انجام چونکا دینے والا تھا جو تحریر پڑھنے والے کے ذہن میں پہلے ہی سے اپنے انجام کی جانب اشارہ دے رہا تھا۔ "سزا" بہترین سچی کہانی ثابت ہوئی کہ موضوع کا انتخاب بالکل الگ اور انوکھا تھا۔ "ساز تمنا" شروع سے لے کر آخر تک اپنے شکنجے میں لیے رہی۔ جنگ جیسی نفرت انگیز اور بھڑکتی ہوئی آگ میں محبت کے جو شگوفے کھلے وہ انتہائی حسین معلوم دیے۔ اعتماد اور بھروسا پارہ پارہ ہو کر بکھرنے سے بچ گیا اور ایک انوٹ رشتے میں ڈھل گیا۔ یہ تحریر مدتوں یاد رکھے جانے کے قابل رہی۔ عمران بھائی تبصرہ کافی طویل ہو گیا ہے اس لیے اختتام کرتی ہوں۔ غلطیوں کے لیے معافی اور دعا کی درخواست کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔ اللہ حافظ

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ السلام علیکم! اسی طرح چپکے چپکے انسانیت کے دشمن ان پر سکون،

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوب صورت اور صاف ستھرے شہروں ملکوں کو نیست و نابود کرنے کی مذموم حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ نجانے دنیا کے ٹھیکیداروں کو کون سی غلط فہمی ہے کہ وہ پوری دنیا کے حکمران ہیں نہیں ہر گز نہیں۔ جب قومیں قعر مذلت میں خود ہی گرنا چاہتی ہیں تو دوسروں کے لیے مواقع پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ فرقہ وارانہ فسادات صرف دو گروہوں کو جنگ کرنے پر اکسانے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ مگر کاش ہم خود بھی فرقہ واریت کی ذہنی و جسمانی دلدل سے نکلنے کی کوشش کریں اور یہ نہ کہیں کہ میرے مسلمان ہونے کے علاوہ باقی سب کافر۔ ہم فرقوں میں اس برے طریقہ سے بٹ گئے ہیں کہ ہماری اصل شناخت ہی گم ہو کر رہ گئی ہے۔ عام زندگی میں ہمیں ان سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ تم کون ہو؟ اگر کوئی جواب دے کہ مسلمان ہوں تو سننے والا مطمئن نہیں ہوتا اور مزید کریدتے ہوئے پوچھتا ہے کہ سنی ہو یا شیعہ؟ یہ لمحہ فکریہ ہے۔ ہم سب کے لیے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر معافی مانگیں اور لاحول ولا قوۃ کا بکثرت ورد کریں کہ ان تمام مشکلات پر قابو پا سکیں۔ فہرست پر نظر پڑی تو دل کو زبردست اطمینان ہوا۔ دستک تو یادگار چیز تھی اور اقرأ سبحان اللہ۔ جزائے خیر اللہ دے۔ گفتگو کی محفل بھی خوب سجی ہے پہلے تو عالیہ انعام الہیٰ کی دادی صاحبہ اور محمد سلیم اختر کی والدہ محترمہ کے بچھڑ جانے پر بے حد افسوس ہوا ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ کریم ان کو بخشے اور لواحقین کو صبر جمیل دے آمین ثم آمین۔ اس دفعہ سب سے پہلے گفتگو میں ریاض حسین قمر کا ذکر کہ تبصرہ تو اے ون تھا مگر انہوں نے جن جذبات و خیالات کا اظہار (میرے تبصرہ پر عبداللہ شاہد کے رویہ اور پھر بھی ہم دونوں کی تنقید ایک دوسرے پر جس پر محترمہ بہن شہناز بانو نے بھی ختم کرنے کا لکھ دیا تھا) کیا ہے مجھے بے حد متاثر کر گیا اور پھر عبداللہ شاہد کے بھرپور تبصرے میں بھی اس نے بہت اچھے الفاظ میں یاد کیا ہے ایک اور بات بھی عمران جی قارئین کی خدمت میں عرض ہے کہ میرے موجودہ تبصرہ میں تلخی و تنقید کی بھرمار ہے اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں اور عبداللہ شاہد سے بھی۔ مجھے افسوس ہے کہ بات لمبی چلی گئی تھی لیجیے بقول ریاض جی کے میں ان کے ساتھ بغلگیر ہو گیا ہوں اور آئندہ صرف اجلی مثبت اور معیاری تنقید کی جائے گی تاکہ مصنف اس سے کچھ سیکھے اور اس کی نگارشات پر نکھار آئے۔ معیار بے حد اچھا ہوتا چلا جائے۔ امید ہے کہ شاہد جی بھی اس کو دل و جان سے قبول کریں گے۔ میں ریاض جی کا ایک دفعہ پھر شکر گزار ہوں کہ لیجیے آپ کا مان رکھ لیا گیا اور کوئی حکم اور اب۔ بہن شہناز بانو کے تبصرہ کا ذکر ہمارے لکھاری اگر تبصرہ کرتے ہیں تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے اور وقت نکالنا بھی کار دار ہے ان کا شکریہ اور خاص طور پر ہماری لکھاری خواتین اگر تبصرہ غزل وغیرہ کہتی ہیں تو گھر کے تمام کام کاج بچوں کی خدمت (خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے) اور ہزاروں گھر کے کام تو پھر یہ ہمت ہی ہے نا اور خلوص کی انتہا کہ کم سے کم وقت میں بھی اپنے قارئین کے لیے ٹائم نکال کر تبصرہ بھیج دیتی ہیں۔ بہن آپ کی دعاؤں کا طالب تو ہمیشہ سے ہوں اور آپ کے بہترین خلوص کا بھی دعاؤں کے لیے بے حد شکریہ۔ اسعد کا پنڈی کا ٹور ہوا تو منتظر رہوں گا ہاں جی آپ کی اطلاع برائے شہنی ارشاد ہماری بیٹی کو پیشگی مبارک باد اور ڈھیروں دعائیں۔ انہیں بہت سے قارئین کی دعائیں یقیناً کامیابی سے ہمکنار کریں گی۔ عصمت اقبال عین جی میرے مشورے پر عمل کریں گی شکریہ۔ اس دفعہ غزل وغیرہ نہ تھی؟ غیر حاضری ہوئی نا۔ ریحانہ سعیدہ جی آپ کی کہانی بھی زبردست تھی۔ معاشرے کے اس ناسور سے نہ جانے کتنے گھر اجڑے اور لوگوں کی تمناؤں کا گلا گھونٹا گیا۔ حساس موضوع پر یہ خوب صورت کہانی تھی۔ سبق آموز اور نصیحت پکڑنے والی۔ ریحانہ بیٹی آپ کی آزاد نظم پہلے نمبر پر رہی اور یہ آزاد نظم بھی بے حد اچھی تھی۔ زبردست رہی دلوں میں اترنے والی۔ اس دفعہ نازش غیر حاضر رہیں۔ عالیہ انعام صاحب کا بھرپور تبصرہ تھا حالات حاضرہ پر بھرپور نظر تھی۔ اللہ کریم فضل کرے آمین۔ مگر پورے تبصرہ میں ہمارا ذکر تک نہ تھا؟ محمد اسلم جاوید صاحب غزل زبردست رہی تبصرہ مختصر مگر جامع تھا اور جناب ریاض بٹ جی آپ کے الفاظ میرے لیے سرمایہ ہیں اور ناچیز کے لیے انمول موتی۔ اس دفعہ بھی "آدھی پٹری" پہلے سے بھی عمدہ رہی۔ جامع مختصر اور اختتام بھی جھٹکا دینے والا۔ واہ بٹ جی زبردست۔ آپ کی کہانی کا ہر ماہ منتظر رہتا ہوں اور تبصرہ پر آخر میں شعر تو سوچوں کے کئی در وا کر گیا ماشاء اللہ۔ سید عبداللہ شاہد کا زبردست تبصرہ بھی حالات حاضرہ پر عمیق نظر اور تبصرہ کہانیوں پر بے لاگ تحریر بڑا خوب رہا۔ اتنا تفصیلاً تبصرہ بھی انتہائی اچھی معلومات دے جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کبھی کبھی عرصہ دراز کے بعد ایک ڈائجسٹ شائع ہوتا تھا تو آپ کا تبصرہ تب بھی خوب ہوتا تھا وہی یادیں در آئیں ضرور آئیں بھئی۔ ہاں ایک وضاحت کرتا چلوں کہ چھ سات سال سے ہمارا میگزین 18 سے 21 تاریخ کے درمیان ہی آ رہا ہے۔ شجاع جعفری جی آپ تشریف لے آئیں بمع اپنی تخلیقات کے۔ شائع بھی ہو جائیں گی اور ہمیں بھی نیا مواد پڑھنے کو ملے گا۔ آخر میں سرور شاذ اور زوبیہ بیٹی کو بیٹے کی مبارک باد بمع بے حد دعاؤں کے۔ ہاں زوبیہ تم تو خوب صورت آزاد نظم کے ساتھ حاضر ہوئیں اور ہمارے سرور شاذ ابھی بھی ایک مخصوص

خول سے نہیں نکلے؟ دنیا کو زیر خود کرنا ہوتا ہے نہ کہ وہ آپ کو دبوچ لے۔ چلیے آغاز کیجیے۔ کھلے دل سے کھلے ذہن سے اور اپنی جگہ آپ بنا کر شہرت کی بلندی کی طرف بڑھتے چلے جائیں۔ یہ تو زوبیہ بیٹی بھی ان سے کروا سکتی ہے ہم کیا امید رکھیں؟ اس دفعہ سب سے بڑی اور خاصے کی چیز تو محترم مشتاق صاحب کا پچا چراندی رہا۔ نیا ذائقہ نیا خیال اور زبان کو پڑھ کر ایک نئی چاشنی ملی۔ زبردست اور بے حد مزہ دے گیا۔ بالکل عمران جی ان سے ہر ماہ ایسی تحریر ضرور لیا کریں اور بے حد یادگار شاہکار تھا۔ کہانیوں میں ایم الیاس کو حاضر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ بھائی مدتوں کے بعد تشریف آوری کا بے شکریہ۔ امید ہے کہ آپ ہر ماہ آیا کریں گے۔ شکنجہ زبردست اور اختتام کے لحاظ سے بڑی منفرد کہانی رہی۔ ایسا انجام جمال کب سوچ سکتا تھا۔ جیسے کو تیسا نا۔ محمد سلیم اختر تو اچھے لکھاری ہیں اور ٹھوکریں بھی ان کا بولتا ہوا شاہکار ہے۔ اس کے علاوہ اندھا اعتماد آخری خط اور سزا بھی ذہنوں کو جھنجوڑنے والی داستانیں رہیں۔ خلیل جبار ذرا وقفہ دیتے ہیں آنے میں اور غزالہ جلیل راو بڑی ہی دیر کے بعد تشریف لائیں۔ باقاعدہ آیا کریں۔ بدیسی کہانیوں میں تینوں ہی بہت خوب تھیں۔ پھر بھی غلط فہمی بیسٹ رہی اور ناول میں مغرور کی پہلی قسط حسب معمول نوشاد عادل کی چونکا دینے والی تحریر سے مزین تھی۔ راحیلہ تاج کی ساز تمنا بھی دل پر اثر کرنے والی کہانی رہی۔ گردش تو بڑے ٹھوس قسم کی روانی سے چل رہی ہے اور اگلی قسط کا انتظار رہتا ہے۔ شہناز بانو کی ہمت کی داد کہ اتنا اچھا ناول قارئین کے لیے وقت نکال کر تحریر کر رہی ہیں۔ گنگا کے پجاری ابھی زیر مطالعہ ہے۔ روحانی علاج تو عوام کی خدمت ہی کر رہا ہے۔ خوش بوئے سخن بھی تمام کا تمام قابل مطالعہ ہے۔ عمر اسرار خاصی عرق ریزی سے چناؤ کرتے ہیں اور ان سیٹ میں زبردست کاوش تھی۔ رانا حنیف عاطر خوب غزل لائے۔ تنزیلہ ہاشمی خاصے عرصہ دراز کے بعد جلوہ گر ہو رہی ہیں اور فوزیہ سحر کائنات بھی زبردست نظم کے ساتھ براجمان تھیں۔ ذوق آگہی بھی بہت اچھا رہا۔ امام غزالی کے اقوال شائع کرنے کا شکریہ۔ امید ہے قاری بور نہیں ہوئے ہوں گے۔ بے حد دعاؤں کے ساتھ اللہ حافظ۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہ مارچ کا شمارہ منفرد اور دیدہ زیب سرورق لیے حیرت انگیز طور پر انیس فروری کو ہی دستیاب ہو گیا۔ ابھی تو تازہ تازہ آنکھوں میں انتظار کے دیپ جلائے تھے۔ بہر حال بڑی مہربانی اور دل سے شکریہ عمران بھائی اور ادارے کا جو متواتر میری تحریر کردہ کہانیاں شائع کر رہے ہیں۔ قارئین تھوڑا سا انتظار کر لیں۔ میں ایک بات بلکہ خوشی آپ سے شیئر کروں گا۔ آپ سب قارئین کی دعوت ہے کہ اس کے متعلق سوچیں اور لکھیں میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کون حقیقت تک پہنچتا ہے۔ اس بار مشتاق احمد قریشی صاحب دستک کے ذریعے دو قومی نظریہ پر سیر حاصل بحث کر رہے ہیں۔ معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ جو ہم تک پہنچا ہے ویل ڈن۔ ہمیں اس دو قومی نظریے کی حفاظت اپنی جان سے بھی زیادہ کرنی چاہیے اب بڑھتے ہیں اپنی محفل کی طرف یہاں محمد سلیم اختر کی والدہ اور عالیہ انعام بہن کی دادی کی وفات کی صورت میں دو اندوہناک اطلاعتیں پڑھنے کو ملیں۔ خدا بزرگ و برتر سے دعا گو ہوں کہ خدا مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین ثم آمین۔ شہناز بانو بہن کا خط میری نظروں کے سامنے ہے نظریں لفظوں پر دوڑ رہی ہیں۔ بہن غم اور خوشی دھوپ چھاؤں کی طرح ہماری زندگی کے ساتھ ساتھ ہیں۔ بیٹے کی امتحان میں پاس ہونے کی خوشی مبارک ہو۔ آپ نے میری کہانی پر سیر حاصل تبصرہ لکھا ہے۔ بہن میں اپنی ہر کہانی میں لکھتا ہوں کہ میرے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں کہانی لکھنے کے لیے صفحات مختص ہیں عمران بھائی نے کہانی ذرا مختصر لکھنے کے لیے کہا ہوا ہے۔ بعض اوقات دریا کو کوزے میں بند کرنا پڑتا ہے کچھ کہانیاں پھیلاؤ چاہتی ہیں اس وجہ سے تشنگی کا احساس رہتا ہے۔ آپ عمران بھائی سے گزارش کر کے دو چار صفحات بڑھانے کی سفارش کر دیں مہربانی ہو گی۔ بہر حال آپ کا شکریہ میں بالکل بھی ناراض نہیں ہوں۔ میری مجبوری کو مد نظر رکھا کریں میں نے آپ کی باتیں پلے سے باندھ لی ہیں۔ عصمت اقبال عین۔ بہن بھائی کو یاد رکھنے کا شکریہ میں اچھی تحریر کی تعریف کرنے میں ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیتا۔ ریحانہ سعیدہ میری کہانی پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ عالیہ انعام بہن ہم سب آپ کے دکھ میں شریک ہیں۔ آپ ہمت والی ہیں خدا آپ کو یہ صدمہ اور دکھ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب اس بار بھی میرا مان بڑھا رہے ہیں۔ بھائی کہانی پسند کرنے کا شکریہ اور آپ کی عنایتوں کا بار تو مجھ سے اٹھایا نہیں جا رہا۔ اپنا موبائل نمبر دے دیں۔ ملاقات کا دن اور وقت بتا دوں گا۔ سید عبداللہ شاہد میری کہانی کو اس حد تک پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ بھی اچھا لکھتے ہیں۔ آپ کی نئی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ سرور شاذ اور زوبیہ شاذ بیٹا پیدا ہونے کی خوشی مبارک ہو۔ یہی تو اس محفل یعنی گفتگو کا خاصا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے ہیں خدا بزرگ و برتر سے دعا گو ہوں کہ وہ باری تعالیٰ آپ کو ایسی ہی ہزاروں خوشیاں دیکھنا نصیب کرے آمین۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

طرف۔ سچ بیانیاں سب کی سب اچھی ہیں۔ زرق برق ریحانہ سعیدہ اندھا اعتماد خلیل جبار ٹھوکریں محمد سلیم اختر آخری خط محمد ثقلین شکنجہ ایم الیاس اور سزا غزالہ جلیل راؤ سب اپنی اپنی جگہ پلاٹ اور منفرد انداز تحریر کی وجہ سے پسند آئیں۔ مغربی ادب سے انتخاب بھی خوب ہے۔ ناول مغرور اور ساز تمنا ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اب بات ہوجائے گردش کی بہن یہ قسط زیادہ تر مہوش اور ڈاکٹر شاہ زمان کے گرد گردش کر رہی ہے۔ بہت اچھی طرح لکھا ہے اور تفصیل سے لکھا ہے۔ ویل ڈن۔ گنگا کا پجاری کی کیا تعریف کروں کیونکہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے آخر میں ایک وضاحت کردوں کہ اس بار میری کہانی کا نام آدھی ٹیڑھی ہے۔ جو کہ غلطی سے آدھی پٹری چھپ گیا ہے۔

انجم فاروق ساحلی...... لاهور۔ آداب! امید ہے آپ اور ادارہ کے دیگر افراد بخیر ہوں گے۔ ملکی حالات اس بات کے گواہ ہیں کہ کوئی اس ملک میں اپنی اصلاح کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ سانحہ کوئٹہ افسوس ناک ہے۔ محترمہ شہناز بانو صاحبہ کی والدہ محمد سلیم اختر راولپنڈی اور عالیہ انعام الٰہی کی دادی کے لیے دعا گو ہوں۔ خالق حقیقی ان کے درجات کو بلند فرمائے آمین۔ تمام قارئین و باذوق قاری ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، شہناز بانو صاحبہ، ریاض بٹ، سید عبداللہ شاہد صاحب کا بے حد مشکور ہوں کہ انہوں نے اخلاص دل سے تذکرہ قلمبند فرمایا۔ صدیقی صاحب تبصرے کے مختصر ہونے کا تعلق انہی حالات سے ہے۔ جن کا ذکر اس ماہ عمران احمد صاحب نے اداریہ گفتگو میں کیا۔ اس ماہ نئے افق کا ٹائٹل مختلف رنگوں کے امتزاج سے کافی خوش نما اور جاذب نظر ہے اوپر کونے میں ایک کتے کے گھورنے کا منظر بھی موجود ہے اس ماہ عمران صاحب نے کافی اچھا اور سفید کاغذ استعمال کیا جو کہ بڑے بڑے جرائد میں نظر نہیں آتا۔ کم قیمت میں یہ معیار عمران صاحب کی جرات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ اس سلسلے میں مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس مرتبہ اقتباسات میں مفکرین کے اقوال اور شعری انتخاب خوب صورت تھا۔ "مغرور" اچھا ہنگامہ خیز ناول ہے۔ گردش بھی اچھے انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ باقی تحریروں میں سینئر لکھاری محترم ایم الیاس صاحب کی شکنجہ دیکھ کر مسرت ہوئی مجھے ان سے خط و کتابت کا شرف حاصل ہے۔ ان کی کچھ ہدایات بھی میری راہ نما ہیں۔ زرق برق اندھا اعتماد ٹھوکریں آدھی ٹیڑھی سزا ملکہ جہنم غلط فہمی تقریباً سبھی کہانیاں اچھی تھیں۔ والسلام

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم ومکرم جناب عمران احمد صاحب سلام مسنون! بہت ہی خوب صورت ٹائٹل والا ماہ مارچ کا نئے افق میرے سامنے ہے۔ لائق صد احترام جناب مشتاق احمد قریشی صاحب دستک میں دو قومی نظریہ کے بارے اپنے قیمتی خیالات کا اظہار فرما رہے ہیں۔ رب ذوالجلال ہمیں صحیح صورت حال پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ گفتگو کے آغاز میں آپ نے بہت ہی پیاری حدیث بیان فرما کر ایمان تازہ فرما دیا ہے۔ گفتگو میں اس بار کرسی صدارت محترمہ شہناز بانو کے حصے میں آئی ہے۔ ناول نگاری کی طرح خط لکھنے کا بھی ان کا اپنا ایک انداز ہے جو منفرد ہے شہناز آپی محترم بھائی اسعد علی کے سی اے کا امتحان پاس کرنے پر دلی مبارک۔ آپ لکھتی ہیں کہ میں مہنگائی کا رونا رو رہا ہوں اور یہ کہ ہمیں اپنے اعمال کا خود محاسبہ کرنا چاہیے۔ تو آپی گزارش یہ ہے کہ میں اپنے لیے مہنگائی کا رونا بالکل نہیں رو رہا۔ مجھ ناچیز پر رب کریم نے اتنا فضل فرمایا ہوا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ میں اگر دن رات سجدے میں پڑا رہوں تو اس ذات عظیم کے احسانات کا شکریہ ادا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ سب کچھ لکھتے ہوئے میں خوفزدہ ہوتا ہوں کہ کہیں اس کے حضور ناشکر گزاروں میں نہ لکھا جاؤں۔ میں نے جو گیس سلنڈر کی قیمتیں بڑھنے کا ذکر کیا وہ محض مہنگائی کے بڑھنے کا تناسب ظاہر کرنے کے لیے لکھا کہ اس پیارے دیس میں کسی آئٹم کا نرخ دس بیس روپے نہیں بلکہ سو ڈیڑھ سو روپے کے حساب سے بڑھتا ہے۔ مہنگائی کا رونا روتے میرے پیش نظر وہ مزدور ہوتا ہے جو صبح سویرے منڈی میں بیٹھتا ہے اور شام کو خالی ہاتھ منہ لٹکائے اپنے بیوی بچوں کے پاس چلا جاتا ہے۔ میرے خیال میں وہ غریب گزیدہ شخص ہوتا ہے جو پورا سال تو کبھی فاقوں سے اور کبھی روٹی دے کر اپنے بچوں کو پالتا ہے مگر سال بعد عید کے موقع پر اپنے بچوں کو نئے کپڑے لے کر نہیں دے سکتا۔ بچوں کو ضد کرنے پر ڈانٹتا ہے جب وہ روتے روتے سو جاتے ہیں تو اس سے رہا نہیں جاتا اور وہ موت کو گلے لگا لیتا ہے۔ صبح لوگ عید کی تیاریوں میں مصروف ہوتے ہیں تو اس کے بچے اپنے باپ کے مردہ جسم سے لپٹے چیخ چیخ کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ابو ہم سے روٹھ کے مت جاؤ کہ آئندہ ہم کبھی بھی نئے کپڑوں کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ مزید یہ کہ ہم طبقات میں بٹ گئے ہیں ایک طبقہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے والا ہے اور دوسرا طبقہ اپنے آپ کو ہر طرح کے محاسبے سے مستثنیٰ سمجھتا ہے۔ میری بہت ہی اچھی بہن شہناز بانو صاحبہ اگر کوئی بات طبع نازک پر گراں گزری ہو تو اپنے اس بھائی کو معاف فرمادیں جس کے سینے کے بائیں جانب گوشت پوست کا ایک لوتھڑا ہے سنگ مرمر فٹ نہیں۔ میری ناقص رائے میں جشن عید میلاد النبی جیسے بہت ہی نازک موضوع کو

نئے افق کے صفحات پر زیر بحث نہیں لانا چاہیے۔ محترمہ عصمت اقبال عین صاحبہ غزل پسند فرمانے کا شکریہ۔ محترمہ ریحانہ سعیدہ بھرپور تبصرے کے ساتھ تشریف لائیں غزل پسند فرمانے کا شکریہ آپ کا کلام کافی منجھا ہوا ہوتا ہے۔ محترم عالیہ انعام الٰہی کے سوگوار خط نے بہت رنجیدہ کردیا آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی لگ گئی۔ رب لم یزل دونوں ساس بہو کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے محترمہ اس دار فانی میں خوشیاں بہت کم اور دردو غم بے حساب ہیں وہ معبود حقیقی ہمارے دنیاوی سہاروں کو آہستہ آہستہ اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ یہ سب کچھ ازل سے ہو رہا ہے اور ابد تک ہوتا رہے گا۔ خدا آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ محمد اسلم جاوید کا مختصر خط بھی خوب تھا۔ محترم ریاض بٹ بھائی خط میں آپ کا تذکرہ سہواً رہ گیا۔ دانستہ نہیں تھا۔ معذرت خواہ ہوں۔ ہم تو یاروں کے یار ہیں بھائی۔ غزل پسند کا بے حد شکریہ۔ آپ کی سچی کہانی آدھی ٹیڑھی نے خوب مزہ دیا۔ محترم ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب اس بار نسبتاً مختصر نامے کے ساتھ تشریف لائے۔ محترم یاد فرمائی کے لیے بے حد شکریہ۔ محترم جناب سید عبداللہ شاہد صاحب کا طویل خط بہت پسند آیا انہوں نے پرچے پر بڑا بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ شاہد جی دراصل گیت نگاری میری فیلڈ نہیں ہے۔ میں نے حمد و نعت اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے۔ البتہ فلسفیانہ شاعری کے لیے ذائقہ بدلنے کے لیے عام شاعری بھی پیش کرتا رہوں گا۔ دراصل میرے لکھنے کا مقصد فلاح معاشرہ ہوتا ہے۔ خداوند کریم مجھے اس میں کامیابی عطا فرمائے آمین۔ گفتگو میں بعض دوستوں کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ خاص طور پر محترم ومکرم جناب محمد بخش صابر لنگاہ صاحب اللہ تعالیٰ انہیں صحت اور تندرستی عطا فرمائے آمین۔ خوش بوئے سخن میں عمر اسرار احمد صاحب کا انتخاب دن بدن خوب صورت ہوتا جا رہا ہے۔ نظموں میں ریحانہ سعیدہ صاحبہ، عبدالمالک کیف، صائبہ ساحل اور زاہدہ رشید علوی کی نظمیں خوب رہیں۔ غزلوں میں سمیع جمال، قدیر رانا، پروفیسر واجد نگینوی، مجاہد ناز عباسی، محمد اسلم جاوید، آزاد حسین آزاد اور رخسانہ ضیاء بھٹی کی غزلیں بہت اچھی تھیں۔ باقی شعرا کو اسی طرح محنت کرتے رہنا چاہیے۔ نیک تمناؤں کے ساتھ۔ اللہ حافظ

عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم۔ محترم عمران بھائی السلام علیکم! امید کرتی ہوں آپ اور نئے افق کی ساری ٹیم بالکل خیریت سے ہوں گے۔ اس مرتبہ رسالہ بہت دیر سے ملا مگر ٹائٹل خوب صورت تھا۔ غزالہ جلیل کی کہانی "سزا" پڑھی کسی رسالے میں یہ ان کی پہلی تحریر ہے اس لحاظ سے ان کی یہ اچھی کوشش ہے۔ ریاض بٹ صاحب کی تفتیشی کہانی پڑھی اچھی لگی یقیناً برے اعمال کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے کہانی "آخری خط" ہمارے معاشرے میں بڑھتی بے حیائی کو ظاہر کر رہی ہے۔ جب انسان کو اپنے گناہوں پر ندامت محسوس ہو اور سچے دل سے اپنے رب سے معافی مانگے تو وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ ضرور معاف فرما دیتا ہے ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی اس سوچ کو مدنظر رکھتے ہوئے ریحانہ سعیدہ "زرق برق" کے عنوان سے اچھا افسانہ لکھا۔ ابھی تک تو یہ ہی تحریریں پڑھی ہیں۔ خوش بو کا انتخاب اچھا رہا مگر مجاہد ناز عباسی نے وصی شاہ کی لکھی غزل بھیجی جس کے نیچے نہ تو لفظ انتخاب لکھا اور نہ ہی شاعر کا نام یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ ریاض بٹ صاحب ریحانہ سعیدہ اور ریاض حسین قمر صاحب شاعری پسند کرنے کا شکریہ۔ آخر میں دعا ہے کہ رب تعالیٰ محمد سلیم اختر کی والدہ اور عالیہ انعام الٰہی کی دادی جان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ...... پرانا خانیوال۔ محترمی ومکرمی جناب برادرم عمران احمد صاحب السلام علیکم! امید ہے آپ سب لوگ خیریت سے ہوں گے۔ سرورق کے لیے مصور صاحب و مدیر عمران احمد صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ "دستک" مشتاق احمد قریشی صاحب "دو قومی نظریہ" میں سبق ہی سبق تھا۔ محمد سلیم اختر صاحب کی والدہ صاحبہ اور عالیہ انعام الٰہی صاحبہ کی دادی جان کو اللہ پاک جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ صدارتی کرسی حاصل کی اور قارئین کے لیے خوشیاں بکھیریں عزیزہ شہناز بانو صاحبہ نے ہم سب کی طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔ گفتگو میں اپنی پیاری پیاری باتوں کے پھول بکھیر کر بزم کو سجا کر رکھ دیا۔ صاحبزادی عصمت اقبال عین آف منگلا ڈیم صاحبہ سلام محبت اور دعاؤں کے بعد آپ کی مختصر سی تحریر نے یادوں کے دریچے کھول کر رکھ دیے اور یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ رونے والے ذرا بتا دے مجھے تو کسے یاد کر کے رویا ہے۔ باقی عزیزہ جانے والے چلے جاتے ہیں اور اپنی یادیں چھوڑ جاتے ہیں ان کی بخشش کے لیے درود و تسبیح کرنا چاہیے۔ فقیر کی بھی بڑی تائی محترمہ کرم الٰہی صاحبہ 13-2-15 کو اللہ کو پیاری ہوگئیں ان کے لیے بھی بخشش کی دعا کیجیے گا۔ باقی تحریر شدہ باتوں کو پسند کرنے کا شکریہ۔ محترمہ ریحانہ سعیدہ صاحبہ سلام و دعا کے بعد عرض ہے کہ اچھی چیز کو اچھا ہی کہا جاتا ہے اور آپ کے انتخاب و سچ بیانیاں دل اور محنت

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے لکھی ہوئی دل میں سمانے والی اور سبق آموز ہوتی ہیں اور آپ کی کاوشوں کا انتظار کیا جاتا ہے۔ شکریہ تو فقیر آپ کا ادا کرتا ہے کہ آپ نے اسے یاد رکھا۔ اچھا لکھ رہی ہو اور زیادہ اچھا لکھنے کی کوشش کرو ان شاء اللہ کامیابی ہوگی فقیر کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ صاحبزادی عالیہ انعام الٰہی صاحبہ دعا ہے کہ خداوند کریم آپ کو شاد و آباد رکھے۔ بہت منفرد و سبق آموز انداز میں لکھتی ہو پسند آتا ہے۔ آپ کی لکھی ہوئی باتوں کو آپ کا لکھا ہوا لیکچر ایک کہانی کا درجہ رکھتا ہے اور کہانی لکھنے کا فن آپ جانتی ہیں مگر لکھنے سے گریز کرتی ہیں۔ اس کا جواب تو آپ ہی دے سکتی ہیں۔ باقی فقیر کو تو آپ یقیناً بھول چکی ہیں مگر فقیر کی دعائیں آپ کے نام ہیں۔ برادرم ریاض بٹ صاحب سلام محبت دل و جان سے اور دعائیں۔ بھائی اولڈ از گولڈ تعریف اس خداوند پاک کی جس نے جہاں بنایا اور اس جہاں میں آپ بھی شامل ہیں۔ اچھا لکھتے ہیں اور لکھ رہے ہیں اور ایک قسم کا سبق دے رہے ہیں کہ گندم کی کاشت کرنے والا جوار باجرہ گنا یعنی کہ کماد کبھی بھی نہیں کاٹ سکتا۔ میری اور حسنین و صابر ثقلین کی طرف سے آپ کی تحریروں پر مبارک باد اس ماہ کی تحریر آدھی ٹیڑھی بھی خوب پسند آئی۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ بڑے منفرد و محترم و پیارے بھائی ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب سلام محبت کے بعد دعائیں اور عرض کہ شوگر بلڈ پریشر اور آنکھوں کی تکلیف اب لکھنے پڑھنے کی زیادہ اجازت نہیں دے رہی لیکن آپ سب کی دل سے کی جانے محبت کا ساتھ نبھانے کی کوشش کر رہا ہوں فقیر کے حق میں دعا کر دیجیے گا اور فقیر کی دعائیں آپ کے نام۔ باقی آپ بھی تو بہت کم لکھ رہے ہیں اس کا کیا سبب اور وجہ ہے جواب دیجیے گا۔ برخوردار محترم محمد سرور شاد و صاحبزادی زوبیہ شاد فقیر بہت خوش ہوا۔ سلام محبت کے ساتھ مبارک باد۔ بابا لوگ اس خوشی ملنے پر خالی خالی نہیں مٹھائی مٹھائی اور مٹھائی سب کو پیش کرنے کا سوال جواب دیں انتظار رہے گا۔ برخوردار محترم ریاض حسین قمر صاحب سدا خوش رہو۔ مسکراؤ دعا ہے اور ساتھ ہی سلام محبت پیش ہے۔ آپ خود بھی بہت اچھے انسان ہیں، بہت اچھا لکھتے ہیں اس لیے آپ کو مجھ جیسا فقیر بھی اچھا لگا۔ موت کا وقت مقرر ہے یہ دفتری وقت نہیں کہ آئے تو آئے نہ بھی آئے تو حاضری لگ جائے گی۔ آپ کی دعاؤں کا دلی شکریہ منظوری کی سند تو صرف خداوند پاک ہی دے سکتا ہے۔ باقی میری تحریر، شاعری یا میرے فرزندوں کی لکھی گئی کو بھی آپ نے پسند کیا تو میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میرے نغمے تمہارے لیے ہیں۔ مارچ 2013ء کے شمارے میں نئے افق کی محفل گفتگو میں شجاع جعفری صاحب کی تلہ گنگ سے پہلی مرتبہ آمد ہوئی تو محترم جعفری صاحب خوش آمدید۔ محمد اسلم جاوید صاحب نے بھی شامل ہو کر ملکی بحران اور مہنگائی کا رونا رو کر اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ خداوند پاک ہم سب پر رحم کرے اور ہمارے ملک کے حالات بہتر ہوں فقیر بھی آپ کی دلی تمناؤں اور دعاؤں میں شامل ہیں۔ محترم اسلم جاوید صاحب پر خطوط کی محفل ختم ہوئی۔ ہم تو ویسے بھی غیر حاضر تھے جناب مگر ہمارے یہ پیارے پیارے ساتھی، بہن بھائی شہنی ارشاد صاحبہ، نور الٰہی جٹ صاحب، سلیم احمد چوہدری صاحب، این شاہین صاحبہ، این لقا صاحبہ، طاہرہ جبیں تارا صاحبہ، دل شاد حسین صاحب، عاشر عظیم صاحب، مجاہد ناز عباسی صاحب، ناصر خان ڈاھا صاحب، ناز سلوش ذشے صاحبہ، بشیر احمد بھٹی صاحب، انجم فاروق ساحلی صاحب، محمد خان مجاہد صاحب، فریدہ جیلانی صاحبہ، عالیہ انمول صاحبہ، شبنم اعوان صاحبہ، شمیم میرانی صاحبہ، لبنیٰ آصف صاحبہ اور غلام شبیر شاد صاحب کے ہمراہ عبدالمالک کیف صاحب محفل گفتگو سے غیر حاضر پائے گئے یا غیر حاضر کر دیے گئے۔ جن کی وجہ سے محفل سونی سونی رہی۔ ان کی کمی دل سے محسوس کی گئی ہر ماہ حاضر ہوا کریں۔ ”اقرأ“ کے سبق کو پڑھا جس نے چاروں طرف دینی خوش بو کی لہریں بکھیر رکھی تھیں سبحان اللہ اگلے سبق کا انتظار رہے گا۔ بشرط زندگی باقی آپ کی دعاؤں کا طالب رہوں گا۔ تراش خراش میں اس دفعہ بہت کم تھا مگر پسند آیا۔ روحانی علاج راہ سبق و علاج کا درجہ رکھتا ہے یہ ادارہ کی طرف سے قارئین، بہن بھائیوں کی بہت بڑی خدمت ہے۔ خوش بو سخن میں عمر اسرار صاحب کے روبرو مقابلہ کی دوڑ میں صدارتی نظام لوٹ جاؤ، ریحانہ سعیدہ صاحبہ نے پیش کی اور مبارک باد کی مستحق ٹھہری۔ میرے فرزند محمد ثقلین صابر لنگاہ کی نظم کو بھی جگہ ملی شکریہ سب دوستوں کا انتخاب خوب رہا۔ ذوق آگہی میں قارئین، بہن بھائی عفان احمد کی ہمراہی میں ایک دوسرے سے آگے دوڑ لگا کر صدارتی کرسی حاصل کرنے میں مصروف ہیں مگر آفتاب احمد صاحب نے تکبر کی مذمت پیش کر کے صدارتی کرسی حاصل کی مبارک باد قبول ہو۔ باقی دوست بھی بہت خوب رہے۔ سلسلہ وار ”گردش“ ”شہناز بانو“ ”گنگا کا پجاری“ اے حمید اور ناول مغرور نوشاد عادل صاحب کا مطالعہ کیا گیا تیزی برقراری اور میلان میں تینوں داستانوں نے دل خوش کر دیا اور مصنفین ان محنت سے لکھی گئی کاوشوں پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

بشیر احمد بھٹی...... بھاول پور۔ محترم عمران احمد صاحب السلام علیکم۔ مارچ کا شمارہ 24 فروری کو مل گیا۔ ٹائٹل ہمیشہ کی

طرح منفرد ہے۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب نے ”دو قومی نظریہ“ ہندو مسلمان قوم پر خوب تر مضمون لکھا ہے۔ گفتگو میں سب سے پہلے حدیث پاک پڑھی۔ بے شک اللہ پاک کا کوئی شریک نہیں۔ عبادت و بندگی اور تمام تعریفیں اللہ جل شانہ کے لیے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ پاک کے رسول ہیں۔ گفتگو میں حکمرانوں پر تنقید آپ نے بالکل درست فرمائی ہے۔ راولپنڈی کے محمد سلیم اختر صاحب کی والدہ صاحبہ اور کراچی کی عالیہ انعام الٰہی کی دادی صاحبہ کی وفات پر افسوس ہوا۔ اللہ پاک ان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ شہناز بانو صاحبہ کا طویل تبصرہ پڑھا۔ عصمت اقبال عین، ریحانہ سعیدہ، محمد اسلم جاوید، ریاض بٹ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، سید عبداللہ شاہد، ریاض حسین قمر ان تمام بہن بھائیوں کے تبصرے خوب تھے۔ شجاع جعفری صاحب کا مختصر تبصرہ پڑھا۔ بھائی صاحب کو مشورہ ہے کہ اپنے قیمتی وقت سے کچھ وقت نکال کر تبصرہ کچھ طویل بھیجا کریں۔ سرور شاد صاحب، زوبیہ شاد صاحبہ چار سال بعد اللہ پاک نے ان کو بیٹا عطا کیا ہے اللہ تعالیٰ ان کو ہر سال ایسی خوشی نصیب فرمائے۔ اقرا ایمان افروز سلسلہ ہے۔ دو صفحات میں خوب صورت باتیں پڑھنے کو ملیں۔ جدلیاتی تجزیہ کا نصف اداریہ صفحہ پڑھا۔ چچا چراندی میں سٹے بازی کے بارے میں پڑھا۔ واقعی کرکٹ کے میچوں میں اب کروڑوں کا جوا ہوتا ہے۔ سٹے بازی، جوا، قرعہ یہ سب اسلام میں منع ہیں۔ پرائز بانڈ بھی قرعہ اندازی میں شامل ہیں۔ اب عوام الناس کی آنکھیں دولت کی چکا چوند خیرہ کرنے کی متلاشی ہوگئی ہیں۔ اللہ ہی ہم سب کے حال پر کرم فرمائے دولت نے ہمیں ایمان کی پٹڑی سے اتار دیا ہے۔ نوشاد عادل صاحب کی مغرور پڑھی۔ یہ ناولٹ خوب ہے۔ گنگا کا پجاری پڑھی ہندوستان کی تصوراتی سیر کرا رہی ہے۔ اے حمید کی یہ تحریر خوب ہے۔ مغربی ادب سے ملکہ جہنم غلط فہمی اور ہندی ادب سے تلاش بتی اچھی کہانیاں ہیں۔ گردش ایک خاص موڑ پر پہنچی ہے۔ زرق برق اندھا اعتماد ٹھوکریں دیسی ادب کی شاہکار کہانیاں ہیں۔ ریاض بٹ صاحب کی آدھی پٹڑی اچھی رہی۔ آخری خط شکنجہ، سزا دیسی ادب کی لاجواب کہانیاں ہیں۔ خوش بو سخن کی غزلیں تازہ ہیں ذوق آگہی میں اس دفعہ پرانا پلندہ آپ نے جڑ دیا ہے۔ یہ صفحے طباعت شدہ ہے خیر کوئی بات نہیں کبھی کبھار مصروفیت میں ایسا جائز ہے۔ آخری کہانی ساز تمنا منفرد کہانی ہے۔ اچھے انداز میں راحیلہ تاج صاحبہ نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ نئے افق کے تمام پاکستانی کہانی کار اچھی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ ان سب کو اس محنت پر مبارک باد اگلے ماہ تک کے لیے اللہ حافظ۔ خدا آپ کو ہم سب پاکستانیوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

عبداللہ شاھد...... حیدر آباد السلام علیکم! خدائے مطلق سے پرامید ہوں کہ بخیر ہوں گے۔ ساتھ ہی اپنے خوب صورت رسالے نئے افق کے لیے دعا گو ہوں کہ آپ اس کی رنگا رنگ وحدتوں، جہتوں اور زیر زیبائش و آرائش کی ترقی و زرخیزی کے لیے سدا مصروف عمل رہیں اور ہمارا دیگر رسائل و جرائد میں اپنی انفرادیت کے جھنڈے گاڑتا محو سفر رہے آمین۔ عزیز حسنات آف ہاؤس اور مجلس ادارت میں آپ کے رفقائے کار بزرگوار حسن اختر پریم، محترم محمد طاہر قریشی صاحب، برادرم جناب اقبال بھٹی صاحب، بھائی جناب محمد اسرار، عزیزم جناب عفان احمد اور دیگر احباب کی خدمت میں سلام اور نیک خواہشات پیش التفات کرتا ہوں۔ اس دفعہ قبلہ جناب مشتاق احمد قریشی اپنے دوسرے کالم سلسلہ ہائے عمر رفتگان میں ”چچا چراندی“ کے عنوان سے دلچسپ مکالمہ لیے متمکن دکھائی دیے ہیں چچا کریم الزماں کی بول چال پڑھ کر طبیعت اچھی بھلی زعفران زار ہوئی۔ اللہ عزوجل انہیں صحت جاودانی عطا فرمائے اور وہ اپنی شفقتوں اور پرلطف صائب روی سے خاطر طبع کو جلا بخشتے رہیں آمین۔ سلام و خیر خیریت کے بعد بھائی عمران احمد آپ سے گزشتہ سے پیوستہ احوال بیان کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ الفاظ دیگر جب آپ ہیں تو کیا غم ہے۔ پچھلے دنوں کراچی میں تین روز قیام کے دوران آپ سے شرف ملاقات ہوا تو ہاؤس کی روایتی مہمانداری کے باوجود ایک بات کا قلق ہوا محترم بھائی عمران آپ نے کہانیوں کی تاخیر سے اشاعت پر دنوں اور مہینوں کا نہیں بلکہ فرمایا کہ کہانیوں کی زیادتی کی وجہ سے رائٹرز کو بعض صورت حال میں انتظار کی گھڑیاں گنتے گنتے سال بھی گزر جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اسٹوری رائٹنگ کو بطور پیشہ اختیار کرنے والے کیا اپنی جان کو جوکھم میں نہیں ڈالتے جو زر نقد کی تلخ حقیقت کو جانتے بوجھتے یہ صبر آزما پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ گستاخی معاف ہو اگر میں یہ کہوں کہ اس پروفیشنل سے کسی فیکٹری کے مزدور کو ملنے والی یومیہ اجرت لاکھ درجے بہتر اور اچھی ہے دوم اس میں سوچ و فکر کا سوہان روح بھی نہیں۔ مزدور غریب سہی لیکن سکھ و آرام کی نیند سوتا ہے جبکہ ادیب کی کمائی تو زہر ہلاہل ہوتی ہے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کے مصداق۔ تخیل کے خناس میں لفظوں کی کھوج کے خارزار میں دل و دماغ میں یوں لہولہان ہوتے ہیں کہ اسے کسی کروٹ چین نہیں ملتا اور خود اس کا بشرہ کاغذی پیرہن میں نقش فریادی بن کر اسے تازیانے لگانے لگتا ہے۔ ہائے سلسلہ تمام علم و

WWW.PAKSOCIETY.COM

ادب اور میرے عمران احمد۔ خدائے مطلق اس نابغہ روزگار کی طلب میں صبر و استقامت عطا کرے آمین۔ ماہ مارچ کا تازہ شمارہ 17 تاریخ کو موصول ہوا۔ دلچسپ اور پراسرار سرورق کچھ سربستہ راز لیے رگ و پے میں سرسراہٹ پیدا کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس مرتبہ بھی فہرست میں کہانیوں کا انتخاب لاجواب دکھائی دے رہا ہے۔ سب سے پہلے حسب عادت سلسلے وار ناولز کا مطالعہ کیا۔ ابتدائی صفحات پر برادرم نوشاد عادل کی پہلی قسط بسلسلہ ناول "مغرور" کے شائع کی ہے۔ اچھی بات ہے لیکن میری ذاتی سوچ و فکر ہے کہ نئے افق کے ابتدائی صفحات کی دیگر سے بڑھ کر قدر و منزلت ہے۔ جناب الماس ایم اے جناب ادریس آزاد اور جناب خورشید پیرزادہ جیسے قدآور اور بزرگ ادیبوں کی مشاق قلم سے ابتدائی صفحات کے لوح و قرطاس آراستہ ہوتے رہے ہیں۔ یہ چیز دل و ذہن میں کڑتی محسوس ہوئی تو لکھ دی ہے ورنہ حکم حاکم کے تقاضوں کو نبھانے کی مجبوریوں میں بندہ سب کچھ گوارہ کر لیتا ہے۔ غرض مختصر "مغرور" (نوشاد عادل) کا مطالعہ کیا۔ شروعات ہالی ووڈ کی کسی ایکشن فلم کے پر تجسس منظر سے ہوئی دوم ناول کے مرکزی کردار وقاص عرف وکی کے ساتھ دیگر کرداروں کے تعارف سے اس احساس سے آشنائی ہوئی کہ یہ کہانی سیاست کی بساط پر اپنے مہروں کو آزمانے اور اپنی ترپ چالوں سے اثر و رسوخ حاصل کرنے کی تگ و دو پر منتج ہوگی۔ سو بقول فیض، ہم دیکھیں گے لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔ گزشتہ تبصرے میں محترم اے حمید کے ناول "گنگا کا پجاری" کے ڈیو زرہ گئے تھے وہ آپ کے سپرد کرتا چلوں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے مایہ ناز لکھاری اور عظیم ناول نگار اے حمید صاحب ارضیاتی حقائق کو اپنے کمال تحلیل سے یوں سطر سطر لکھتے چلے جاتے ہیں کہ قاری آج کئی عشروں کا فاصلہ ہونے کے باوجود ان کے زمانے کی مشاہداتی نگاہ اور اس کے تجزیے کو پڑھ کر مطالعاتی ذوق سے مست و محترم ہو جاتا ہے۔ چوتھی قسط میں ان کی زہریلی لڑکی پاروتی سے مڈبھیڑ ہوئی تھی پھر سانپوں سے ڈسوانے اور انہیں زندہ سالم کھانے کی لت کے باوجود مسافر نے خاصے مروت اور رواداری سے پاروتی کے ہمراہ دشت و دریا اور صوبہ آسام کے جزیروں کے دلچسپ سفر کیے۔ ہندو لڑکی نے چھٹی قسط میں انسان سے ناگن بننے کی جو ماورائی طاقت حاصل کی ہے وہ سراسر ناقابل یقین ہے لیکن کیا کہنے مسافر کے جنہوں نے علمی دلائل اور منطقی وجوہات سے ہندو ماورائی سفلیات کو واقعتاً سچا ثابت کیا ہے۔ زہریلی لڑکی سے جناب اے حمید کی بحث اور حجت آمیز باتیں موڈ کو خوشگوار رکھنے کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہیں۔ آخری پچویشن میں وہ ہندو لڑکی کو لیے آگرہ اور اجمیر شریف سے ہوتے ہوئے ممبئی کی طرف محو سفر ہیں اور قیام پاکستان کے اعلان کے بعد مسافر جلد از جلد پاکستان جانا چاہتا ہے یوں دیکھیں ساتویں قسط میں محترم مسافر کی یہ خواہش کیونکر پوری ہو سکے گی؟ تیسرا ناول "گردش" جسے قابل احترام مصنفہ شہناز بانو (میری بجیا) اپنے جادوئی قلم سے تحریر کر رہی ہیں ناولز کی دوڑ میں پہلے نمبر پر ہے۔ بجیا شہناز بانو کو بہت بہت مبارک باد۔ انہوں نے تازہ قسط میں آخر کار شمروز سے مہوش کی ملاقات کروا دی۔ طویل ہجر و فراق کی صعوبتیں گزارنے کے بعد دو دل ایک دوسرے کے جلو میں بیٹھے اشک بار نگاہوں سے مل رہے تھے۔ بجیا نے اس منظر میں شمروز اور مہوش دونوں کے گلے شکوے کو متاثر کن پیرائے میں قلم بند کیا۔ ادھر اب حسام تیزی سے روبہ صحت ہو رہا ہے اور سازشی عناصر کے گرد انکل طلال اور کرنل مشتاق حصار کھینچ رہے ہیں یہ دیکھیں نواب سطوت کیسے بچ پاتا ہے؟ مزید اس دفعہ گفتگو کے صفحات پر بجیا شہناز بانو پورے تفخر سے اپنی دلچسپ رائے زنی کرتی مسند اول پر باوقار نظر آ رہی ہیں۔ اس بار گریس فل بجیا جیت گئیں اور ہماری بیوٹی فل نازش ہار گئیں ویسے شہناز بانو ہمیشہ صدارتی کرسی پر بہت جچتی ہیں اس کی کوئی تو وجہ ہوگی نازش سمیت دیگر ساتھی اور دوست احباب کیا اس کی توجیہہ پیش کریں گے؟ خیر بجیا شہناز آپ کو اسعد علی کی کامیابی کی دلی مبارک باد۔ جشن عید میلادالنبیؐ پر آپ کا تفکر درست ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم اس میں وفور جذبات سے جو دھوم دھڑ کا کرتے ہیں وہ اپنے کالے چہروں پر عشق رسولؐ کے نام کے نعرے لگا کر نفاق و خود فریبی کا پلیتن مل لیتے ہیں حالانکہ ہم مسلمان صبح سے شام گئے تک اپنے اعمال سے سیرت نبی اور کتاب مبین کی کھلی نفی کرتے ہیں آپ نے بہنوئی کی تعزیت پر، بہن اور اس کے بچوں کے لیے دلی دکھ کا اظہار کیا ہے بے حد شکریہ بجیا۔ اب انہیں صبر و قرار آ گیا ہے۔ غم زدہ دلوں کے لیے وقت بڑا مرہم ہوتا ہے کہ انسان پر نا گہانی کے صدمے کے بعد پھر سے ہمتیں مجتمع کر لیتا ہے۔ زندگی کے اس احساس سے امیدیں باندھ لیتا ہے۔ شہنی کے نام میرے پیغام کی آپ نے جو توضیح فرمائی اس کا بھی شکریہ۔ گزشتہ چند ماہ پہلے محترمہ اس بات سے مطلع کر رہی تھیں کہ محترمہ نے دوبارہ فیس بک جوائن کر لیا ہے اور وہ پھر سے ایکٹیو ہو گئی ہیں۔ لیکن آپ نے جواباً بتایا کہ وہ بہت جلد اپنے پیا دیس سدھارنے والی ہیں تو حیرت ہوئی ویسے یہ اچھا ہے کہ شہنی کی جلد از جلد شادی خانہ آبادی ہو جائے تاکہ ہم بھائیوں کی جان چھوٹ جائے کیا خیال ہے شہنی ارشاد؟ اس بار عصمت اقبال عین بھی محفل میں تبصرہ لیے حاضر ہوئی

ہیں اس لیے گونا گوں طمانیت سے پڑھا۔ فرینڈ میرے لیے تعزیتی پرے کا دلی شکریہ تم نے درست اندازہ کیا عصمت! میری باریک بینی سے مدیر عمران احمد بھی زچ ہوتے ہیں اور بعض اوقات ایسے لفظی و لغوی مقدمے میں ڈالتے ہیں کہ میں اللہ اللہ کر اٹھتا ہوں۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے زیرک مطالعے کی لت بھائی عمران احمد نے ہی مجھے لگائی ہے۔ تم نے میرے تذکرے کے حوالے سے وضاحت کی اچھا لگا۔ اس مرتبہ تمہاری غزل بھی اور میرا گیت بھی عمر اسرار صاحب نے شائع نہیں کیا۔ اس لیے خاصا افسوس ہوا۔ ریحانہ سعیدہ کی اس دفعہ بھی کہانی شائع ہوئی ہے اور خوش بو سخن میں نظم بھی لیکن محترمہ کچھ خود غرض لگتی ہیں کہ اپنے پورے تبصرے میں میرے لیے ایک جملہ لکھنے کی روا دار نہ ہوئیں۔ اب میں ان کی اسٹوری زرق برق پر کیا تبصرہ کروں؟ محترمہ ریحانہ سعیدہ مارکیٹ میں ہی لین دین نہیں ہوتا بلکہ بحیثیت شرکائے محفل کے باہمی اشتراکی تعلقات میں بھی لین دین ہوتا ہے۔ جسے برٹش پاکستانی مسلمان "Given Take" کہتا ہے کچھ ماہ کے وقفے سے عالیہ انعام الٰہی محفل میں شریک ہوئیں لیکن اپنی مہربان اور سرپرست دادی جان کی رحلت کے دکھ و غم سے آزردہ اور نڈھال نظر آ رہی تھیں سسٹر عالیہ، یہ حقیقت ہے کہ ہم اپنی شباہت اور ہم رنگی کے اثرات سے واقعتاً زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ آپ کا دکھ اس لیے میرے دکھ جیسا ہے پر ملال اور آنکھوں میں آنسو بھرنے والا تھا۔ پھر اس فکر و تدبر سے خود کو صبر کی تاکید کرتا کہ رب کی مصلحتوں کے آگے بندوں کا حق یہی ہے کہ وہ اس کی رضا و خوشنودی پر عاجزی سے سر جھکا دے اور سجدہ ریز ہو جائے۔ اللہ عزوجل آپ کی دادی جان کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ برادرم ریاض بٹ، بہنوئی کی موت پر تعزیت کا شکریہ۔

عبدالمالک کیف...... صادق آباد۔ کچھ ماہ کی غیر حاضری کے بعد نئے افق مارچ 2013ء کے تبصرہ کے ساتھ حاضر ہوا ہوں (میگزین زیر مطالعہ رہا) اس سوچ کے ساتھ خط لکھنے پر مجبور ہو گیا کہ پڑھنے والے فراموش ہی نہ کر دیں اور کوئی پرانے ڈائجسٹوں میں ہی میری تحریریں پڑھے اور کہے یہ کیف کہاں قصہ پارینہ بن چکا' کیوں؟ یہاں جو ہے اسے یاد رکھا جاتا ہے کچھ مجبوریاں تھیں اور کچھ قسمت کی ستم ظریفیاں گہرے دوستوں کی طرف سے گہرے زخموں پر مرہم لگانے کی ناکام کوششیں مگر وہ زخم ہی کیا جو بھر جائے خیر لمبی چوڑی تقریر میں جا کر میں کس کا قیمتی وقت برباد نہیں کرنا چاہوں گا۔ ان دوستوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے یاد رکھا سب سے پہلے تو ادی شہناز بانو کے ساتھ معذرت کے ہر ساتھ کو جانا ہے ماں کی جدائی جان لیوا ہوتی ہے مگر آپ کے ضبط کو سلام۔ اللہ آپ کی امی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے تبصرہ اچھا رہا کرسی صدارت مبارک ہو۔ سید عبداللہ شاہد کے بہنوئی کی وفات پر ان سے تعزیت کے دو بول کے یہ وقت یہ گھڑی آنی ہی آنی ہے سو صبر کریں اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کریں اللہ پاک بخشنے والا مہربان ہے۔ محمد سلیم اختر کی ماں کی وفات پر اور کراچی کی عالیہ انعام الٰہی کی دادی کے انتقال پر ملال پر دل رنجیدہ ہے اور میں ان کے ان عزیزان من پیاروں کے لیے دعا گو ہوں کہ رب پاک ان سب کی مغفرت فرمائے آمین۔ یقین مانیے ہم سب رائٹر خاص کر نئے افق میں لکھنے والے سب بہنوں بھائیوں کے دکھ سکھ سانجھے ہیں کم سے کم میں تو ایسا سمجھتا ہوں کہ نئے افق سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کے لیے دلی جذبات بہت حساس ہیں جیسے گھر کے مکیں ہوں اور ان کے دکھ میں دل رنجیدہ ہو جاتا ہے اور ان کی خوشی میں دل کھل اٹھتا ہے۔ اللہ پاک سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ عصمت اقبال عین، ریحانہ سعیدہ، عالیہ انعام الٰہی، محمد اسلم جاوید، ریاض بٹ، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب، سید عبداللہ شاہد، ریاض حسین قمر کے مفصل اور جامع تبصروں نے نئے افق کی رونق میں چار چاند لگا رکھے تھے۔ شجاع جعفری! اتنا مختصر تبصرہ اور یہ کیا جناب محترم سرور شاذ اور زوبیہ بھابی بھی بہت مہینوں بعد رونق افروز ہوئے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری کے ساتھ ہماری دعا ہے کہ آپ دونوں کے آنگن میں مزید پھول کھلیں آمین۔ آج کے دور میں کسی کام کے لیے ٹائم نکالنا' کسی سے ملنا' بہت مشکل ہے۔ میں نے بھی یہ خط 24 تاریخ کو لکھنا شروع کیا اور 25,26 گزر گئی سوچا اس مہینے بھی حاضری مشکل ہے نئے افق میں کیونکہ گھر میں شادی کا ماحول ہے اور بہت سارے کام۔ او آئی ایم سوری کہ میں بتانا بھول گیا کہ کچھ دن پہلے میں نے اپنی منصور موبائل شاپ کا افتتاح کیا ہے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا جن دوستوں کا تذکرہ نہ کر سکا دل سے سوری سب کو سلام۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

اخلاص وللہیت، اور نام ونمود!

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کا معیار کسی کی شکل وصورت یا اس کی دولت مندی نہیں ہے بلکہ دل کی درستی اور نیک کرداری ہے وہ کسی بندے کے لیے رضا اور رحمت کا فیصلہ اس کی شکل وصورت یا اس کی دولت مندی کی بنیاد پر نہیں کرتا' بلکہ اس کے دل یعنی اس کی نیت کے صحیح رخ اور اس کی نیک کرداری کی بنیاد پر کرتا ہے۔

لکہ اس حدیث کی بعض روایتوں میں بجائے مذکورہ بالا الفاظ کے یہ الفاظ ہیں:۔

.........اللہ تمہارے جسموں اور تمہاری صورتوں اور تمہارے صرف ظاہری اعمال کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔

یہ الفاظ اس حقیقت کے ادا کرنے کے لیے زیادہ واضح اور زیادہ صریح ہیں کہ مقبولیت کا اصل دارومدار دل کے رخ کی صحبت یعنی نیت کی درستی پر ہے' پس اگر کسی شخص کا عمل بظاہر اچھے سے اچھا ہو لیکن اس کا دل اخلاص سے خالی ہو' اور اس کی نیت درست نہ ہو تو وہ عمل ہرگز قبول نہ ہوگا۔

اخلاص کی برکت اور تاثیر وطاقت:۔

(۲۵۰)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا:۔ ''تین آدمی کہیں چلے جارہے تھے کہ ان کو مینھ نے آلیا' وہ پہاڑ کے ایک غار میں گھس گئے' پہاڑ سے غار کے منہ پر ایک پتھر کی چٹان آپڑی اور غار کو بند کردیا' تینوں میں سے ایک نے دوسروں سے کہا' اپنے ان نیک عملوں پر نظر ڈالو جو خاص طور پر خدا کے لیے کیے ہوں' اور اس عمل کے وسیلہ سے خدا سے دعا مانگو' امید ہے کہ خداوند تعالیٰ اس پتھر یا اس مصیبت کو دور کردے۔ ایک نے ان میں سے کہا کہ اے اللہ! میرے ماں باپ بہت بوڑھے تھے اور میرے کئی چھوٹے بچے تھے میں بکریاں وغیرہ چرایا کرتا تھا کہ ان کا دودھ ان سب کو پلاؤں جب شام ہوجاتی تو میں گھر آتا دودھ دوہتا اور سب سے پہلے اپنے ماں باپ کو پلاتا پھر بچوں کو دیتا' ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ چراگاہ کے درخت مجھ کو دور لے گئے (یعنی بکریوں کو چراتا چراتا میں دور نکل گیا) اور وقت پر میں گھر واپس نہ آسکا یہاں تک کہ شام ہوگئی جب گھر پہنچا تو دیکھا کہ میرے ماں باپ دونوں سوگئے ہیں' میں نے حسب معمول دودھ دوہا پھر دودھ کے برتن لے کر ماں باپ کے پاس پہنچا اور ان کے سرہانے کھڑا ہوگیا' مجھ کو ان کو جگانا بھی برا معلوم ہوا اور یہ بھی کہ ماں باپ سے پہلے بچوں کو دودھ پلادوں' بچے میرے پاؤں کے پاس پڑے بھوک سے روتے اور چلاتے تھے اور میں دودھ لیے کھڑا تھا' صبح تک یہی کیفیت رہی یعنی میں دودھ لیے کھڑا رہا' اور بچے

روتے رہے اور ماں باپ پڑے سوتے رہے' اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام محض تیری رضامندی اور خوشنودی کے لیے کیا تھا تو تُو اس پتھر کو اتنا کھول دے کہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں' چنانچہ خداوند تعالیٰ نے پتھر کو اتنا ہٹادیا کہ آسمان نظر آنے لگا۔ دوسرے شخص نے کہا کہ اے اللہ! میرے چچا کی ایک بیٹی تھی میں اس سے انتہائی محبت رکھتا تھا۔ ایسی محبت جیسی کسی مرد کو کسی عورت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ہوسکتی ہے' میں نے اس سے جماع کی خواہش ظاہر کی' اس نے کہا کہ جب تک سو اشرفی نہ دو گے ایسا نہیں ہوسکتا میں نے کوشش شروع کی اور سو اشرفیاں جمع کرلیں۔ اور ان کو لے کر میں اس کے پاس پہنچا پھر جب میں اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھ گیا (یعنی جماع کے لیے) تو اس نے کہا کہ اے خدا کے بندے خدا سے ڈر اور مہر کو نہ توڑ! میں خدا کے خوف سے فوراً اٹھ کھڑا ہوا (یعنی اس سے جماع نہیں کیا) اے اللہ! اگر تیرے نزدیک میرا یہ فعل محض تیری رضامندی اور خوش نودی کے لیے تھا تو اس پتھر کو ہٹادے اور ہمارے لیے راستہ کھول دے۔ خداوند تعالیٰ نے پتھر کو تھوڑا سا اور ہٹادیا' تیسرے شخص نے کہا اے اللہ! میں نے ایک شخص کو مزدوری پر لگایا تھا' ایک فرق (پیمانہ) چاول کے معاوضہ پر' جب وہ شخص اپنا کام ختم کرچکا تو کہا میری مزدوری مجھ کو دلوایئے؟ میں اس کی مزدوری دینے لگا تو وہ اس کو چھوڑ کر چلا گیا اور پھر اپنے حق کو لینے کے لیے نہ آیا' تو میں نے اس کی مزدوری کے چاولوں سے کاشت شروع کردی اور ہمیشہ کاشت کرتا رہا' یہاں تک کہ ان چالوں کی قیمت سے میں نے بہت سے بیل اور ان کے چرواہے جمع کرلیے پھر مدت کے بعد وہ مزدور میرے پاس آیا اور کہا خدا سے ڈر اور مجھ پر ظلم نہ کر' اور میرا حق میرے حوالہ کر' میں نے کہا کہ ان بیلوں اور چرواہوں کو لے جا (کہ وہ تیرا حق ہے) اس نے کہا بندے خدا سے ڈر' اور مجھ سے مذاق نہ کر' میں نے کہا کہ میں تجھ سے مذاق نہیں کرتا' ان بیلوں اور چرواہوں کو لے جا' یہ سب تیرے ہی ہیں' چنانچہ اس نے ان سب کو جمع کیا اور لے کر چلا گیا اے اللہ! اگر تیرے نزدیک میرا یہ فعل محض تیری خوش نودی اور رضامندی کے لیے تھا تو تو اس پتھر کو بالکل ہٹادے' چنانچہ خداوند تعالیٰ نے پتھر کو ہٹادیا اور راستہ کھول دیا۔''

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں جن تین صاحبوں کا قصہ بیان فرمایا ہے بظاہر یہ کسی اگلے پیغمبر کے امتی تھے' حضور نے اپنی امت کی سبق آموزی کے لیے اس قصہ کو بیان فرمایا...... اس واقعہ میں اللہ کے ان بندوں نے اپنے جن اعمال کو خدا کے حضور میں پیش کرکے اس سے دعا کی ہے ان کی چند خصوصیتیں قابل لحاظ ہیں۔

سب سے پہلی اور سب سے اہم خصوصیت جس کا حدیث میں صراحتہً ذکر بھی ہے یہ ہے کہ تینوں عمل صرف اللہ کی رضا جوئی میں کیے گئے تھے اور ان اعمال کی اسی خصوصیت کی بنا پر ان بندوں نے اللہ کے حضور میں ان کو پیش کیا تھا۔

دوسری ایک خصوصیت یہ ہے کہ تینوں عمل اللہ کے حکم ومرضی کے مقابلے میں اپنے نفس کی چاہت کو دبانے اور قربان کرنے کی اعلیٰ مثال ہیں...... ذرا سوچئے پہلے شخص کا مجاہدہ نفس کتنا سخت ہے' دن بھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ جانوروں کو جنگل میں چراتا رہا ہے اور شام کو دیر سے تھکا ہارا آیا ہے' قدرتی طور پر اس کا جی سونے کو بے حد چاہتا ہوگا' بلکہ وہ سونے کے لیے مضطر اور بے قرار ہوگا لیکن چونکہ ماں باپ بلا دودھ پیئے سو گئے تھے اور یہ اللہ کی رضا اسی میں سمجھتا تھا کہ جس وقت نیند سے ان کی آنکھ کھلے یہ ان کو دودھ پلا دے' اس لیے یہ شخص رات بھر دودھ کا برتن ہاتھ میں لیے ان کے سرہانے کھڑا رہا...... اور پھر اس کے بچے اس کے قدموں میں پڑے بھوک سے روتے چلاتے رہے لیکن اس نے ماں باپ کے حق کو مقدم جان کر اللہ ہی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ مجاہدہ بھی کیا کہ بوڑھے ماں باپ سے پہلے اپنے پیارے بچوں کو بھی دودھ نہ پلایا' یہاں تک کہ اسی حال میں صبح ہوگئی۔

اسی طرح دوسرے شخص کے عمل کی یہ خصوصیت بھی ظاہر ہے۔ ایک جوان ایک لڑکی سے عشق رکھتا ہے اور جب ایک بیش قرار رقم طے ہو جاتی ہے اور کسی طرح وہ رقم مہیا کر کے اس کو دے بھی دیتا ہے اور زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری کرنے کا اسے پورا موقع مل جاتا ہے اور کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی تو ٹھیک اس وقت اللہ کا نام بیچ میں آتا ہے اور وہ بندہ اپنے دل کی خواہش پوری کیے بغیر اللہ سے ڈر کر اور اس کی رضا طلبی میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے...... ہر نفس رکھنے والا انسان اندازہ کرسکتا ہے کہ یہ کتنا سخت مجاہدہ ہے اور اللہ کی رضا کے مقابلے میں خواہش نفس قربان کرنے کی یہ کتنی اعلیٰ مثال ہے۔

اسی طرح تیسرے شخص کے عمل کی یہ خصوصیت بھی ظاہر ہے...... ایک مزدور کے چند سیر چاول ایک شخص کے پاس رہ گئے' اس نے انہی چاولوں کو اپنی زمین میں بو دیا' پھر جو پیداوار ہوئی اس کو اس نے اسی مزدور کی ملکیت قرار دے کر اسی کے حساب میں اس کو لگاتا اور بڑھاتا رہا یہاں تک کہ اس سے اتنی دولت فراہم ہوگئی کہ جانوروں کا ایک ریوڑ کا ریوڑ ہوگیا...... پھر جب کچھ مدت کے بعد وہ مزدور آیا تو اس امانت دار اور نیک کردار بندے نے وہ ساری دولت جو خود اس کی اپنی محنت اور توجہ سے فراہم ہوئی تھی وہ سب کی سب اس مزدور کے حوالے کردی' ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ اس وقت شیطان نے دل میں کیسے کیسے وسوسے ڈالے ہوں گے' اور اپنے نفس کی یہ کتنی شدید خواہش ہوگی کہ یہ دولت جو صرف اپنی محنت سے پیدا کی گئی ہے اور جس کا اس مزدور کو کوئی علم بھی نہیں ہے اس کو اپنے ہی پاس رکھا جائے لیکن اللہ کے اس بندے نے رضائے الٰہی کی طلب میں اپنے نفس کی اس خواہش کو قربان کیا اور وہ ساری دولت اس بیچارے مزدور کے حوالے کردی۔

اسی طرح ان تینوں عملوں کی ایک خصوصیت یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اصطلاحی اور عرفی عبادت نہیں ہے بلکہ ایک کا تعلق باب معاشرت سے ہے' ایک کا باب معاملت سے' اور ایک کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ کے ایک بندہ نے خدا سے ڈر کر اور اس کی رضا جوئی میں ایک ایسے گناہ کو چھوڑا ہے جو اس کی انتہائی تمنا اور خواہش تھی اور جس کے سارے اسباب بھی اس نے فراہم کر لیے تھے۔

اس حدیث سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اگر بندہ اپنے کسی نیک عمل کے متعلق یہ اندازہ رکھتا ہو کہ وہ اخلاص کی کیفیت کے ساتھ ادا ہوا ہے تو اپنی دعا میں بطور وسیلہ کے اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس کو پیش کرسکتا ہے۔

ریا ایک درجہ کا شرک اور ایک قسم کا نفاق ہے:۔

اخلاص وللہیت (یعنی ہر نیک عمل کا اللہ کی رضا اور رحمت کی طلب میں کرنا) جس طرح ایمان وتوحید کا تقاضا اور عمل کی جان ہے اسی طرح ریا وسمعہ یعنی مخلوق کے دکھاوے اور دنیا میں شہرت اور نام وری کے لیے نیک عمل کرنا ایمان وتوحید کے منافی اور ایک قسم کا شرک ہے۔

(۲۵۱)

(ترجمہ) شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ فرماتے تھے: جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ خیرات کیا اس نے شرک کیا۔

(مسند احمد)

(تشریح) حقیقی شرک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات یا اس کے افعال اور اس کے خاص حقوق میں کسی دوسرے کو شریک کیا جائے یا اللہ کے سوا کسی اور کی بھی عبادت کی جائے' یہ وہ شرک حقیقی'' اور ''شرک جلی'' اور ''شرک اکبر'' ہے' جس کے متعلق قرآن مجید میں اعلان فرمایا گیا ہے' اور ہم مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ ہے کہ اس کا کرنے والا ہرگز ہرگز نہیں بخشا جائے گا...... لیکن بعض اعمال اور اخلاق ایسے بھی ہیں جو اگرچہ اس معنی شرک نہیں ہیں لیکن ان میں اس شرک کا تھوڑا بہت شائبہ ہے' ان ہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اللہ کی عبادت یا کوئی اور نیک کام اللہ کی رضا جوئی اور اس کی رحمت طلبی کے بجائے لوگوں کے دکھاوے کے لیے کرے یعنی اس غرض سے کرے کہ لوگ اس کو عبادت گزار اور نیکوکار سمجھیں اور اس کے معتقد ہو جائیں' اسی کو ریا کہا جاتا ہے یہ اگرچہ حقیقی شرک نہیں ہے لیکن ایک درجہ کا شرک اور ایک قسم کا نفاق اور سخت درجہ کا گناہ ہے۔ ایک دوسری حدیث میں اس کو ''شرک خفی'' اور ایک اور حدیث میں ''شرک اصغر'' کہا گیا ہے۔ (یہ دونوں حدیثیں آگے درج کی جارہی ہیں)

واضح رہے کہ اس حدیث میں نماز' روزہ اور صدقہ وخیرات کا ذکر صرف مثال کے طور پر کیا گیا ہے' ورنہ ان کے علاوہ بھی جو نیک عمل لوگوں کے دکھاوے کے لیے اور ان کی نظروں میں معزز ومحترم بننے کے لیے یا ان سے کوئی دنیوی فائدہ حاصل کرنے کے لیے کیا جائے گا وہ بھی ایک درجہ کا شرک ہی ہوگا' اور اس کا کرنے والا بجائے ثواب کے خدا کے سخت عذاب کا مستحق ہوگا۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

مفرورمفہ

نوشاد عادل

ایک آشفتہ سر کا احوال' حالات اور قانون نے اسے اپنی سگی بہن کا قاتل قرار دے دیا تھا اور وہ قاتلوں کی تلاش کے لیے قانون سے چھپتا پھر رہا تھا۔ اس کے ایک طرف کھائی تھی تو دوسری طرف موت اور اس کے مقابلے میں اس کے پاس سوائے عزم کے اور کچھ نہ تھا۔

قدم قدم ہنگامے لمحہ لمحہ موت کی آہٹ لیے ایک پرتجسس طویل ناول

وہ پانچوں کسی نہ کسی طرح دیوار پھلانگ کر کمپاؤنڈ میں آئے اور گھر کے آس پاس گھومنے لگے۔ ایک کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو دونوں بہن بھائی تھکے ہارے ایک صوفے پر بیٹھے نظر آئے۔ اب یہ پانچوں اس انتظار میں تھے کہ کچھ ہو تا کہ وہ ان مناظر کو موبائل فون میں قید کرلیں اور پھر کیسے بھی کر کے اندر گھسیں۔

وکی اور صاحبہ باتیں کر رہے تھے اور جب صاحبہ کی شادی کی بات آئی تو صاحبہ کو شادی کے بعد یہ گھر چھوڑنے کا خیال آنے پر رونا آ گیا۔ وکی نے فوراً اسے گلے سے لگا لیا اور صاحبہ نے بھی اپنی بانہیں بھائی کی گردن کے گرد حائل کر کے اسے خود سے جکڑ لیا۔ جیسے وہ کبھی اپنے بھائی سے جدا نہ ہونا چاہتی ہو۔

یہ منظر دیکھ کر باہر کھڑے پانچوں کی رال ٹپکنے لگی اور وہ اندر گھسنے کا راستہ تلاش کرنے لگے جو انہیں بہت آسانی سے مل گیا۔ کیونکہ لاؤنج کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی دکھائی دی۔

کچھ دیر بعد صاحبہ فریش ہونے اپنے کمرے میں چلی گئی اور وکی کافی بنانے کچن کی طرف۔ ٹھیک اسی وقت پانچوں کھڑکی کے راستے گھر میں داخل ہوئے اور دبے قدموں صاحبہ کے کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔

......☆☆☆......

جب وکی کافی بنانے کے بعد لاؤنج میں آیا اور دیکھا کہ صاحبہ ابھی تک واپس نہیں آئی تو اس نے صاحبہ کو آواز لگائی کافی پیتے ہوئے اس کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد بھی صاحبہ نہیں آئی تو وکی نے دوبارہ اس کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے آواز دی۔

"تم سو تو نہیں گئیں۔ یہاں میں نے تمہارے لیے کافی تیار کی ہوئی ہے۔"

اب بھی کوئی جواب نہ ملا تو وکی اس کے کمرے کی طرف بڑھا اور دروازے پر دستک دیتے ہوئے پوچھا۔

"میں اندر آ جاؤں......ہیلو......صاحبہ......کیا تم سو گئیں؟"

اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور دروازہ کھلتے ہی اسے ایک پل بھی سنبھلنے کا موقع نہیں ملا اور اچانک ہی تین چار لوگوں نے اسے پکڑ کر زور سے اندر کھینچ لیا اور اسے کچھ سوچنے کا موقع دیئے بغیر اس پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ جب وہ مار کھا کر کچھ بے دم سا ہو گیا تو انہوں نے اسے ایک کرسی سے اور کرسی کو کھڑکی کی سلاخوں سے باندھ دیا۔

وکی اتنی شدید حیرت میں تھا کہ اس وقت اس کی آواز بھی نہیں نکل پا رہی تھی۔ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسے یہ سب ایک خواب سا لگ رہا تھا۔

اس نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے دیکھا کہ ان میں سے ایک آدمی بیڈ پر صاحبہ کا منہ دبائے بیٹھا ہے تاکہ وہ کوئی آواز نہ نکال سکے اور ایک دوسرا آدمی اس کی گردن پر زبان پھیرتے ہوئے اس کے بالوں کی لٹوں سے کھیل رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ شیطانی نظروں سے وکی کو دیکھ رہا تھا۔ سب کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔

"چپ چاپ پڑے رہنا۔ اگر تم دونوں میں کسی ایک نے بھی آواز نکالی تو بھائی کے سامنے بہن یا بہن کے سامنے بھائی کی زندگی ختم کر دی جائے گی۔" ان میں سے ایک نے کہا جو ان کا لیڈر دکھائی دے رہا تھا۔

اور پھر کمرے میں شیطانی کھیل شروع ہو گیا۔ وکی کی نظروں کے سامنے۔

وکی اپنی بہن کو ان درندوں سے بچانے کے لیے' چھڑانے کے لیے کرسی پر مچلتا رہا۔ تڑپتا رہا۔ مگر کچھ نہیں کر پایا۔ کمرے میں صرف صاحبہ کی گھٹی گھٹی چیخیں اور ان درندوں کے شیطانی قہقہے گونج رہے تھے۔

......☆☆☆......

اپنا شیطانی کھیل مکمل کرنے کے بعد وہ پانچوں وکی کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ وکی نے ایک ایک کے چہرے کو اپنی یادداشت میں بٹھانا شروع کر دیا۔ ادھر اچانک صاحبہ بستر سے اٹھی اور ایک ساڑھی کا پلو دیوار پر مضبوطی سے لگے جھومر سے باندھنے لگی۔ دو آدمی اسے پکڑنے کے لیے بڑھنا چاہتے تھے مگر لیڈر نے ان کو روک لیا۔

"کرنے دو......اگر اپنی خوشی سے وہ خودکشی کرنا چاہتی تو کرنے دو۔ تم لوگوں کو کیا اعتراض ہے۔"

یہ دیکھ کر وکی زور زور سے چلانے لگا۔

"نہیں بے بی نہیں' صاحبہ...... پلیز ایسا مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ہوں نا بے بی۔"

وکی چلاتے ہوئے رونے لگا اور گڑگڑا کر اپنی بہن کو اس اقدام سے منع کرتا رہا۔ مگر صاحبہ نے ساڑھی کا دوسرا پلو اپنے گلے میں لپیٹا اور کرسی سے لٹکنے سے پہلے اپنے بھائی سے بولی۔

"بھیا......اب بولو۔ کیا میری عزت کا اور میری موت کا بدلہ لو گے ان سب سے یا نہیں؟"

وکی کا گلا سوکھ رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔ ادھر وہ پانچوں آرام سے کھڑے صاحبہ کے کرسی پر سے کودنے کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے یہ بھی ان کے لیے کوئی دلچسپ کھیل ہو۔

صاحبہ نے دوبارہ چلاتے ہوئے وکی سے پوچھا۔

"بھیا میں جا رہی ہوں۔ اگر تمہیں مجھ سے ذرہ برابر بھی پیار ہے تو میری عزت کو داغدار کرنے والوں کو زندہ مت چھوڑنا۔ میرا بدلہ ضرور لینا بھیا......تم غصہ نہیں کرتے ہو نا......ناراض نہیں ہوتے ہو مگر میری روح بے چین رہے گی......بے چین رہے گی۔ میں چلی بھیا۔" یہ کہہ کر صاحبہ نے کرسی کو لات ماری اور ساڑھی سے لٹک گئی۔ کچھ دیر اس کے پیر تھرتھرائے پھر ایک سکوت سا چھا گیا۔

سب خاموشی سے مرنے کا یہ زندہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

"چلو اب یہاں سے نکلو۔ جلدی۔" ایک آدمی نے کہا۔

"نہیں۔" لیڈر نے کہا۔ "ابھی کوئی نہیں جائے گا۔ اسے نیچے اتارو جلدی سے اور وکی کی رسی کھولو۔"

"مگر اسے کھول دیا تو یہ مرنے مارنے پر بھی تل سکتا ہے۔"

"اب یہ کچھ نہیں کرے گا۔ اپنی بہن کو زندہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور دیکھ میں کیا کھیل کھیلتا ہوں۔" "اسے یہاں لاؤ۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

صاحبہ کی لاش کو نیچے اتارنے کے بعد وکی کو بھی کھول دیا گیا۔ وکی اس وقت اتنا صدمے کی حالت میں تھا کہ اس کے ہاتھ پیر جیسے بے جان سے ہوگئے تھے۔ اس وقت اس کا دماغ جیسے خالی خالی تھا۔

انہوں نے وکی کو بھی برہنہ کرکے اسے صاحبہ کی لاش کے اوراوپر ڈال دیا۔

"یہ رہی تیری بہن۔ اب جی بھر کے پیار کرلو اسے۔"

وکی نے جذبات کی شدت میں آکر صاحبہ کو اپنے سینے سے لگایا اور وہ ان دونوں کی تصویریں کھینچنے لگے۔ ان میں سے کسی کے پاس ان رجسٹرڈ موبائل تھا اس نے پولیس کو فون کرکے بتایا کہ وکی کے گھر میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔

پولیس کو کال کرنے کے بعد گھر سے نکلنے سے پہلے سب نے ہر چیز کو کپڑے سے صاف کرکے اپنی انگلیوں کے نشان مٹادیئے۔ جس کھڑکی سے وہ اندر آئے تھے اسے بھی اچھی طرح سے صاف کیا گیا تھا۔ غرض کہ جس جس چیز پر انہیں شبہ تھا کہ اسے چھوا گیا ہے ان سب چیزوں پر سے نشانات مٹادیئے گئے اور صدر دروازے سے نکلتے ہوئے انہوں نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ پولیس آسانی سے اندر آسکے۔ اس کے بعد انہوں نے وہ تصویریں اخبارات اور چینلز کو پوسٹ کردی تھیں۔

☆☆☆

وہ کال انسپکٹر خان نے ریسیو کی تھی۔ وہ سب انسپکٹر سلطان کو لے کر تھوڑی ہی دیر میں جمالی ہاؤس پہنچ گیا۔ جب وہ پولیس فوٹو گرافر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے تو وکی پاگلوں کی طرح اسی حالت میں صاحبہ کی برہنہ لاش کو اپنی بانہوں میں لیے بیٹھا تھا۔ اسے اس پوزیشن میں دیکھ کر سلطان کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا تھا اور صاحبہ کی لاش دیکھ کر تو وہ بھی ایک پل کے لیے بوکھلا سا گیا تھا۔ مگر وہ اس وقت خان کے ساتھ ڈیوٹی پر تھا۔ وہ خاموشی سے اپنا فرض نبھاتا رہا۔ اس کی حالت خان سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی اور اسی وقت وہ پوچھ بیٹھا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہونا؟"

نہ جانے کس خیال کے تحت اس نے اس وقت خان کو کچھ نہیں بتایا تھا اپنے اور صاحبہ کے بارے میں۔ شاید اس وقت وہ بھی وکی کو ہی قصوروار سمجھ رہا تھا اور اسے کسی بھی قیمت پر جیل بھجوانا چاہتا تھا۔ اس وقت وکی جس طرح سے صاحبہ کی لاش کو اپنی بانہوں میں لیے بیٹھا تھا اس سے ہر کوئی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ سب کچھ اسی نے کیا ہے اور اب پاگل پن کا ڈرامہ کررہا ہے۔ خان اور سلطان بھی اسی لائن آف ایکشن پر سوچ رہے تھے۔

جب پولیس نے صاحبہ کی لاش کو وکی سے الگ کرنا چاہا تو وہ اسے چھوڑ ہی نہیں رہا تھا۔ ایک ڈر سا تھا اس کے چہرے پر۔ اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اسے کسی پر بھی بھروسہ نہیں تھا تو وہ اپنی بہن کی لاش کیسے کسی کے حوالے کر دیتا۔ تب اسے غور سے دیکھنے اور اس کی حالت کا اندازہ کرنے کے بعد سلطان کو محسوس ہوا کہ یہ وکی کا کیا دھرا نہیں ہے۔ وہ فوراً وکی کے پاس بیٹھا اور آہستہ سے اس کا نام پکارا مگر وکی نے سلطان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ خان اس وقت گھر کا معائنہ کررہا تھا۔ آخر لیڈی کانسٹیبل نے زبردستی صاحبہ کو وکی سے الگ کیا۔ جب اسے الگ کیا گیا تو وکی بہت چلایا اور رویا تھا۔ خان نے وکی سے کئی سوال کیے مگر وکی اس وقت کسی سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

تب خان نے سلطان کو حکم دیا کہ اسے ہتھکڑی

پہنا کر جیپ میں لے جائے۔

وہ جمعہ کی رات تھی اور اس ساری بھاگ دوڑ میں ہفتے کا دن شروع ہوچکا تھا اور ہفتہ اتوار کورٹ بند ہونے کی وجہ سے وکی کو دو دن حوالات میں ہی رہنا تھا۔ وکی نے حوالات میں بھی کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ مگر جب خان لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے لیے ہسپتال گیا تب اس نے سلطان سے باتیں کی تھیں۔ وہ اس صدمے سے بری طرح ٹوٹ چکا تھا اور اس سے ٹھیک طرح سے بولا بھی نہیں جارہا تھا۔ مگر اس کا دماغ کچھ کام کررہا تھا اور اس نے سلطان سے فون لے کر مدثر صاحب کو وکیل کرنے سے منع کردیا تھا۔ کیونکہ اسی وقت اس نے سوچ لیا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ شاید اس نے دماغ میں کوئی پلاننگ کرلی تھی۔

ان دو دنوں میں وکی نے سلطان کے ساتھ مل کر اپنے فرار کا پورا پلان ترتیب دیا تھا۔ عدالت میں پیشی پر جب مجسٹریٹ نے اس سے کیے جرم کے بارے میں پوچھا تو اس نے انکار میں سر ہلادیا۔ اس پر مجسٹریٹ نے کہا۔

"تو اب تک بیان کیوں نہیں دیا؟ کوئی وکیل کرنا ہے تم نے؟"

مجسٹریٹ کی اس بات پر وکی نے ہاں میں سر ہلادیا۔ مجسٹریٹ نے آرڈر جاری کیا کہ وکی کو وکیل کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اپنے وکیل کو بیان دے سکے اس کے لیے کیس کی سماعت تین دن کے لیے ملتوی کی جاتی ہے۔

اس کے فرار ہونے کے بعد پریس اور مختلف چینلز نے صاحبہ اور اس کی تصویریں کچھ سینسر کرکے شائع کر دی تھیں۔ جس سے میڈیا اور عام لوگوں میں نئی بحث چھڑ گئی تھی کہ کیا ایک بھائی ایسا کرسکتا ہے...... کیا بہن کے انکار کرنے پر وکی نے طیش میں آکر اس کا ریپ کرنے کے بعد قتل کردیا تھا؟

فرار کے بعد پولیس میں کھلبلی سی مچ گئی تھی اور اسے پوری تندہی کے ساتھ تلاش کیا جارہا تھا۔ خان بھی کنٹرول روم سے اس صورت حال کو مانیٹر کررہا تھا کہ وکی کس طرف جارہا ہے۔ پھر ہیلی کاپٹر اسکواڈ کی خدمت حاصل کی گئی اور ہائی وے پر جب وکی نے ہیلی کاپٹر کو اڑتے دیکھا تو اس نے اپنی بائیک کچے میں اتار دی اور گھنے جنگل میں داخل ہوگیا۔ درختوں کی وجہ سے ہیلی کاپٹر سے وکی کو دیکھنا کبھی بھی بہت مشکل ہورہا تھا اور پھر خان کی ہدایت پر تربیت یافتہ کتے بھی بھیج دیئے گئے۔ اور پھر وہ مقام آگیا تھا جہاں سے وکی نے ندی میں چھلانگ لگائی تھی۔

☆☆☆

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ فارنسک رپورٹ کے مطابق وکی نے ہی اپنی بہن کا ریپ اور خون کیا تھا۔ ظاہر ہے یہ رپورٹ سراسر جھوٹی تھی۔ مگر اس کے پیچھے کون تھا؟ کس نے اور کیوں یہ جھوٹی رپورٹ بنوائی تھی؟ خان اور سلطان بھی رپورٹ دیکھ کر سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ خان نے اس رپورٹ کی اصلیت جاننے کی بہت کوشش کی تھی مگر ہر ڈپارٹمنٹ کے اپنے اصول ہوتے ہیں اور فارنسک ڈپارٹ نے خان کو وارننگ بھی دی تھی کہ وہ ان کے کام میں دخل اندازی کرنے کی کوشش نہ کرے تو بہتر ہوگا۔

جس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر یہ واردات کی تھی کیا وہ کوئی طاقت ور آدمی تھی؟ کیا اس کے اوپر تک رابطے تھے؟ کیا اسی کے کہنے پر جھوٹی فارنسک رپورٹ بنائی گئی تھی؟

آخر معاملہ کیا تھا......؟ پولیس کو جعلی رپورٹ کیوں دی گئی؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

.......☆☆☆.......

سلطان کو چھٹی پر بھیجنے کے بعد خان اکیلا ہی سب سنبھالنے میں لگ گیا۔ اس نے مدثر صاحب کو فون کر کے پوچھا کہ کیا اسے سلطان اور صاحبہ کے رشتے کے بارے میں معلوم تھا تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ پھر خان نے ریشماں کو فون کیا اور وہی سوال اس سے بھی کیا۔ تب ریشماں کو سچ بولنا پڑا کیونکہ خان نے اسے دھمکایا تھا کہ اگر وہ جھوٹ بولے گی تو اسے پولیس کو گمراہ کرنے کے جرم میں سزا بھی ہو سکتی ہے۔ ریشماں نے سب کچھ سچ بتا دیا اور یہ بھی کہا کہ جس دن وہ پولیس اسٹیشن آ رہی تھی تب اس کے موبائل پر سلطان کی دس مس کال آئی تھیں اور پولیس اسٹیشن میں بھی سلطان نے اسے یہ بات بتانے سے منع کر دیا تھا۔

اس کے بعد خان نے دوبارہ مدثر صاحب کو فون کر کے پوچھا کہ کیا وکی نے اس سے کوئی رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے تو وکی کو بچانے کے لیے مدثر صاحب کو جھوٹ بولنا پڑا کہ نہیں۔

خان کے فون کے فوراً بعد مدثر صاحب نے ان رجسٹرڈ سم سے وکی کو یہ سب بتانے کے لیے کال ملائی مگر دوسری طرف سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ ہوتا بھی تو کیسے۔ اس جنگل میں نیٹ ورک ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ جنگل میں نیٹ ورک وہاں کام کرتا تھا جہاں سے ریلوے لائن گزرتی تھی۔ مدثر صاحب نے کئی بار کوشش کی اور بات نہ ہو سکنے پر سخت نروس ہو رہے تھے۔

.......☆☆☆.......

وکی کے دوبارہ واپس آنے پر سب نے خوشگوار حیرت کا اظہار کیا۔ سردارنی نے فوراً اس کے نامکمل علاج کو دوبارہ سے جاری کیا۔ اسے جڑی بوٹیوں کا لیپ لگایا گیا اور اسے پھر وہی کڑوا جوشاندہ پینا پڑا۔ وکی نے سردارنی کو ایک لاکھ روپے یہ کہتے ہوئے دیئے تھے کہ فی الحال وہ یہ رکھے بعد میں مزید دے گا۔ ابھی تو خود اسے پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ سردارنی خوش ہو گئی۔

وکی کے سونے کے بعد سردارنی ایک ایسی جگہ پہنچی جہاں پتوں سے ڈھکے ایک دروازے کو کھولنے پر ایک سرنگ نمودار ہوئی۔ سردارنی گھوڑے سمیت اس سرنگ میں داخل ہو گئی۔ اوپر زمین پر چلتے ہوئے کسی کو پتا بھی نہیں چلتا کہ اس کے پیروں کے نیچے کیسی دنیا بسی ہوئی ہے۔

سردارنی نے زیر زمین اپنی جو دنیا بسائی ہوئی تھی اس میں تقریباً پانچ سو لوگوں کے رہنے کی گنجائش تھی۔ ایک قطار میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان میں لکڑی کے دروازے بھی لگے ہوئے تھے۔ کہیں کام کیا جا رہا تھا۔ بڑھئی میزیں۔ کرسیاں بنا رہے تھے۔ چولہے برتن، پانی کے کین۔ دالوں، چاولوں اور آٹے کی بوریاں۔ مطلب کہ زندگی گزارنے کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ دیواروں میں پرانے زمانے کی طرح مشعلیں روشن تھیں۔

سردارنی ایک مشعل لے کر اپنے لیے مخصوص کمرے میں گئی۔ اس کمرے میں پتھروں کی دیوار بنی ہوئی تھی۔ اس نے ایک دیوار میں سے کچھ پتھروں کو نکال کر روپے وہاں رکھ دیئے جہاں کچھ ہیرے جواہرات بھی حفاظت سے رکھے گئے تھے۔

سردارنی کے کمرے کا دروازہ نہایت مضبوط بنایا گیا تھا جس کو زنجیروں سے بند کیا جاتا تھا اور اس کی چابی سردارنی کے پاس ہی رہتی تھی۔

یہ دنیا برسوں پہلے سردارنی کے باپ نے بسائی تھی اور جب بھاگے ہوئے قیدیوں کی ایک ٹولی نے ان سے چھپنے کے لیے پناہ مانگی تب سے ایک سلسلہ

بندھ گیا اور جنگل میں ایک الگ دنیا آباد ہونے لگی تھی۔ مفرور قیدیوں نے اس قبیلے کی لڑکیوں سے شادی کر لی اور یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔

یہ چوروں یا ڈکیتوں کا گروہ نہیں تھا۔ یہ لوگ خود کھیتی باڑی کرتے تھے اور اپنا پیٹ پالتے تھے۔

ہاں۔ سردارنی کا دادا ایک ڈاکو تھا۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ روش تبدیل ہونے لگی اور وہ اپنی محنت کے بل جینا سیکھ گئے تھے۔

.......☆☆☆.......

وکی اپنی بائیک پر جنگل میں یونہی گھوم پھر کر مختلف راستوں کو ذہن نشین کر رہا تھا۔ ریلوے لائن کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی اور مدثر صاحب سے بات کرنے لگا۔ مدثر صاحب سے تمام تفصیل سننے کے بعد اس نے انہیں ہدایت کی کہ وہ سلطان سے رابطہ کرے۔

سلطان سے رابطہ کرنے کے بعد مدثر صاحب نے دوبارہ وکی کو فون کر کے بتایا کہ سلطان تو علالت کی وجہ سے ایک مہینے کی چھٹی پر ہے۔ اس نے کچھ سوچ کر مدثر صاحب سے سلطان کا نمبر لیا۔

سلطان نے وکی کی آواز سنی تو بہت خوش ہوا۔ یہ جان کر اس کی جان میں جان آئی کہ وکی زندہ ہے۔ وہ دونوں بیس منٹ تک باتیں کرتے رہے۔ سلطان اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گیا کہ صاحبہ کا وہ حال کن لوگوں نے کیا تھا مگر وکی نے نہیں بتایا اور کہا کہ وقت آنے پر سب پتا چل جائے گا۔

"تم اس خطرناک جگہ سے کودے کیوں تھے؟" سلطان نے کہا۔ "تمہاری جان بھی جا سکتی تھی اس کوشش میں۔"

"اس وقت مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ سامنے کیا ہے اور میں کہاں کود رہا ہوں۔ مگر اتنا مجھے یقین تھا کہ میں مروں گا نہیں۔ کیونکہ مجھے صاحبہ کے لیے زندہ رہنا ہے۔ بس اسی لیے میں بے خطر کود پڑا تھا۔ اور دیکھ لو میں ابھی بھی زندہ ہوں۔" وکی نے وضاحت کی۔

سلطان نے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ اس وقت کہاں سے فون کر رہا ہے۔ اپنے اور خان کے بارے میں اس نے تفصیل سے ہر بات وکی کو بتا دی تھی۔ تو وکی کو جھٹکا سا لگا کہ خان یہ جان چکا ہے کہ وکی کو فرار کرانے میں سلطان نے مدد کی تھی۔

وکی نے دوبارہ مدثر صاحب کو فون کر کے انہیں ہوشیار رہنے اور کمپنی کے اسٹاف کو اس کے بارے میں کسی سے کوئی بات کرنے کے بارے میں سختی سے ممانعت کی پھر ان سے میک اپ آرٹیسٹ رفیق حیات کا نمبر لیا۔

.......☆☆☆.......

میڈیا والوں نے پولیس کی جان کھائی ہوئی تھی کہ اب تک وکی کا کوئی سراغ کیوں نہیں لگایا جا سکا ہے۔ آخر پولیس کیا کر رہی ہے۔

ڈی ایس پی چنگیزی نے اس کا سارا غصہ انسپکٹر خان پر اتارا کہ وہ ایک نااہل آفیسر ہے۔ وہ اور اس کے ماتحت بے وقوف ہیں اور ایسے لوگ کسی کام کے نہیں ہوتے اور ان کی کہیں جگہ نہیں بنتی خاص طور سے پولیس فورس میں تو بالکل نہیں۔ اس نے خان کو پندرہ دن کی مہلت دیتے ہوئے کہا اگر ان پندرہ دنوں میں وکی کو تلاش نہیں کیا جا سکا تو وہ کیس کو داخل دفتر کر دے گا اور اس کی ناکامی کی تمام تر ذمہ داری انسپکٹر خان پر ہو گی۔

"ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں سر اور ہر ممکن ذرائع استعمال کر رہے ہیں۔" انسپکٹر خان نے جواب میں کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”مانتا ہوں۔“ چنگیزی بولا۔ ”اچھا تمہاری واہ واہ کے لیے میرے پاس ایک آسان سا حل بھی ہے۔ کہو تو بتا دوں۔ میڈیا والے بھی خاموش ہو جائیں گے اور تمہارا سروس ریکارڈ بھی بہتر ہو جائے گا۔“

اگرچہ خان کو ڈی ایس پی سے کسی اچھائی کی توقع نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا کہ شاید وہ واقعی میں اس کی کوئی مدد کر سکتا ہے۔

”آسان حل تو یہی ہے مسٹر خان کہ تم کسی کو اس جنگل میں لے جا کر اس کا ان کاؤنٹر کر دو۔ اس کی لاش کو مسخ کر دو اور یہ اعلان کر دو کہ وہ لاش وکی کی ہے۔ کیوں کیسا حل ہے؟“ چنگیزی نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نو سر۔“ خان نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ میں اس قسم کا پولیس آفیسر نہیں ہوں۔ میں ایسے کسی حل کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”اور مجھے تو لگتا ہے کہ تم کسی بارے میں بھی نہیں سوچ سکتے۔ پندرہ دن...... سن لیا تم نے مسٹر خان۔ تمہارے پاس صرف پندرہ دن ہیں اپنا سروس ریکارڈ بہتر بنانے کے لیے۔ پھر مجھے کوئی الزام نہ دینا۔“ ڈی ایس پی نے حتمی فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

......☆☆☆......

ادھر سلطان اپنے گھر پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا اسے خان کو وکی کے فون کے بارے میں بتا دینا چاہیے یا نہیں۔ وہ ایک طرف خان کا شکر گزار تھا تو دوسری طرف وکی کو بھی بچانا چاہتا تھا۔ سلطان کو اندیشہ تھا کہ خان اس کی بات کا یقین نہیں کرے گا اور ہر قیمت پر وکی کی گرفتاری چاہے گا اس لیے بہتر ہے کہ وہ کچھ دن اور خاموش رہے۔

......☆☆☆......

خان دماغ پر زور دیتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اسے ثبوت کی تلاش تھی کہ اگر سلطان نے جو کچھ اس سے وکی کے بارے میں بتایا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دن وکی کے گھر میں ان کے علاوہ کوئی اور بھی تھا۔ مگر کون؟ کچھ سوچنے کے بعد خان ایک فنگر پرنٹس ایکسپرٹ کو دوبارہ موقع واردات پر لے گیا اور مختلف جگہوں سے دوبارہ پرنٹس لیے گئے۔ ہر ممکنہ جگہ سے۔ ہر ممکنہ چیز سے۔ خان نے گھر کا کوئی کونا ایسا نہیں چھوڑا جسے اس کے شک کے مطابق چھوا نہ گیا ہو اس واردات کے دوران۔ پھر اس نے ان فنگر پرنٹس کو اپنے پیسوں سے ایک پرائیویٹ لیب میں چیک کروایا اور نتیجہ یہ سامنے آیا کہ اس میں دو غیر لوگوں کے فنگر پرنٹس بھی پائے گئے تھے۔

وہ فنگر پرنٹس بیڈ کے برابر والے فرنیچر پر پائے گئے تھے۔ خان نے ان پرنٹس کا کرمنل ریکارڈ میں جائزہ لیا مگر ان کا کوئی ریکارڈ نہیں پایا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ پرنٹس کسی عادی مجرم کے نہیں تھے۔ پھر اس نے یہ رپورٹس چنگیزی کے سامنے رکھیں۔ اور اس سے درخواست کی کہ فارنسک والی سبھی رپورٹوں کو دوبارہ چیک کروایا جائے۔ مگر چنگیزی نے اس کی یہ درخواست ٹھکرا دی۔ اس کا کہنا تھا کہ فارنسک ڈپارٹمنٹ پر انگلی اٹھانا پولیس ڈپارٹمنٹ پر انگلی اٹھانے کے مترادف ہے۔ اگر رپورٹس پھر وہی آئیں تو اس سے خان کی مزید بدنامی ہوگی۔

خان خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ سخت غصے میں تھا۔ اور پھر اس نے نہ جانے کیا سوچ کر سلطان کو فون کر کے بتایا کہ وکی کے گھر سے دو اجنبی لوگوں کے فنگر پرنٹس ملے ہیں۔

سلطان نے اس سے پوچھا کہ فنگر پرنٹس کرمنل ریکارڈ میں کسی سے ملتے ہیں تو خان نے کہا کہ نہیں

بالکل نئے فنگر پرنٹس ہیں۔ تب سلطان نے اسے بتا دیا کہ وکی زندہ ہے اور اس نے فون پر رابطہ کیا تھا۔

خان فوراً اس سے ملنے پہنچ گیا اور دونوں سمندر کے کنارے پر آ گئے تا کہ کوئی ان کو ڈسٹرب نہ کر سکے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد خان نے کہا۔

”یار کوئی ہے اس ساری واردات کے پیچھے۔ کوئی ہے جو یہ کھیل کھیل رہا ہے۔ چنگیزی مجھے اپنے طریقے سے کام نہیں کرنے دے رہا۔ کبھی کبھی تو مجھے اس پر بھی شک ہونے لگتا ہے۔ کہیں وہ جان بوجھ کر تو میرے کام میں رکاوٹ نہیں ڈال رہا؟“

”نہیں یار۔ اسے کیسے اس کیس کے بارے میں کچھ پتا ہو سکتا ہے۔ وہ تو اس کیس سے بالکل باہر کا آدمی ہے۔ یہ بات صرف تم جانتے ہو کہ میرا صاحبہ سے رشتہ ہونے والا تھا۔ چنگیزی کو اس کا کیا پتا؟ ہاں وہ تم سے جلتا ہے اور ہمیشہ تمہیں نیچا دکھانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ مگر تم اس کیس کو آگے بڑھاؤ گے تب وہ کچھ کرے گا کریڈٹ لینے کے لیے۔ ابھی تو وہ ہم سے بھی زیادہ اندھیرے میں ہے۔ صرف ہم دونوں کو پتا ہے کہ وکی زندہ ہے۔“

”چنگیزی نے مجھ سے کہا تھا کہ کسی کا انکاؤنٹر کر کے اسے وکی کی لاش ڈیکلیئر کر کے کیس بند کر دوں۔“ خان بولا۔

”یہی تو وہ چاہتا ہے کہ کیس کبھی حل نہ ہو سکے۔“

”یا شاید وہ یہ نہیں چاہتا ہے کہ اصلی مجرم کو نہ پکڑ کر بے گناہ کو آزاد کر دوں۔ اگر میں نے یہ کر دکھایا تو میری عزت اور مرتبہ بڑھ جائے گا جو چنگیزی کو کبھی گوارا نہیں ہوگا۔ وہ چاہتا ہے کہ میں ساری عمر ایک انسپکٹر ہی رہوں بس۔ تمہیں پتا ہے جب مجھے ترقی دے کر انسپکٹر بنایا جا رہا تھا تو اس نے کتنا بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے آئی جی صاحب سے لے کر وزیروں تک کو بھڑکایا تھا میرے خلاف یاد ہے خیر چھوڑو ان باتوں کو...... تم یہ بتاؤ وکی کہاں ہے اور کیا پلان کر رہا ہے؟“

”سچی یار۔ یہ تو میں بھی نہیں جانتا کہ وکی کہاں ہے؟ اس نے ان رجسٹرڈ سم سے کال کی تھی۔ کہا کہ ٹھیک ہے اور پھر فون کرے گا ضرورت پڑنے پر۔ کاش وہ کم سے کم یہ ہی بتا دیتا کہ اس رات اس کے گھر میں کون تھا آخر اس کے گھر میں گھس کون سکتا ہے؟“

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اس کے چوکیدار سے معلوم ہوا کہ اس رات سالگرہ کی خوشی میں ملازموں کو بونس کے ساتھ چھٹی دے دی گئی تھی۔

یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں کہ اسی رات چوکیدار گیٹ پر نہیں تھا۔" خان بات کرتے کرتے اچانک رک گیا اور کچھ سوچنے کے بعد کھلتے چہرے سے کہا۔ "سلطان ہم ایک جگہ نہیں گئے اب تک...... اس ریسٹورنٹ میں جہاں وکی نے اپنی سالگرہ منائی تھی۔ تمہیں پتا ہے دونوں کس ریسٹورنٹ میں گئے تھے؟"

سلطان کے بتانے پر خان وقت ضائع کیے بغیر اس ریسٹورنٹ پہنچا اور منیجر سے استفسار کیا کہ کیا اس رات وکی اور اس کی بہن کے ساتھ کوئی اور بھی تھا تو منیجر نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ نہیں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ویٹر سے تفتیش کی گئی تو ان کا بھی یہی جواب تھا۔ خان مایوس ہو کر وہاں سے لوٹ آیا۔

......☆☆☆

وکی نے رفیق حیات سے رابطہ کر کے ملاقات طے کی اور ملنے کے بعد اسے بتایا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

"وکی صاحب آپ کا روپ بدلنا تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" رفیق حیات نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وکی نے دو روپ منتخب کیے ایک ہپی کا اور دوسرا بوڑھے شخص کا۔ ہپی والا روپ وہ رات کو اور اگر دن میں شہر وغیرہ جانا ہو تو بوڑھے آدمی کا روپ استعمال کرنا چاہتا تھا۔ بوڑھے آدمی کے روپ میں اس نے اپنی ایک ٹانگ ٹیڑھی کر لی تاکہ ایک تو اس کی چال تبدیل ہو جائے اور دوسرا یہ کہ کوئی اسے اس کے قد سے نہ پہچان سکے۔ نقلی سفید داڑھی اور بال، چہرے پر گول چشمہ، دائیں آنکھ کے نیچے ایک کالا مسہ۔ ہاتھ میں لاٹھی۔ یہ سب اسے بدلنے کے لیے کافی تھے۔ وکی نے جب آئینہ دیکھا تو حیران رہ گیا کہ وہ اب وہ نہیں رہا تھا۔

اور ہپی والے روپ میں لمبے سنہرے بال جو اس کے شانوں کو چھو رہے تھے۔ کالا چشمہ، پھولوں والی رنگین شرٹ۔ لال پینٹ، سر پر پی کیپ اور مونچھیں اتنی لمبی کہ لٹکتی نظر آتیں۔ ان دونوں ہی روپوں میں وکی کو پہچاننا ناممکن تھا۔ رفیق حیات نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اسے آواز بدلنے کی تربیت بھی دی اور دو گھنٹے کی مسلسل ریہرسل کے بعد وکی اس قابل ہو گیا کہ ہپی اور بوڑھے کے روپ میں الگ الگ آواز میں بات کر سکے۔

وکی نے ہپی والے روپ کا سامان ایک بیگ میں بھر لیا اور بوڑھے کے روپ میں شہر کی ان گلیوں میں آ گیا جہاں بلیک میں ناجائز سامان کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ ادھر ادھر پوچھنے کے بعد ایک دلال ٹائپ کا شخص اسے ایک ایسے آدمی کے پاس لے گیا جو غیر قانونی اسلحہ فروخت کیا کرتا تھا۔ وکی نے اس سے ایک میگنم ریوالور اور اعشاریہ 44 کے پانچ سو راؤنڈ خریدے۔

اس کے بعد وکی نے مدثر صاحب کو فون کر کے بلایا اور ہدایت کی کہ آتے ہوئے وائرلیس انٹرنیٹ کنکشن کے ساتھ ایک لیپ ٹاپ جس میں کمپنی کا نیٹ ورک بھی موجود ہو۔ ساتھ میں کچھ بلینک ڈی وی ڈی اور پین ڈرائیو بھی لانے کو کہا۔

مدثر صاحب کے آنے تک وکی نے ایک اسی بوڑھے کے روپ میں ایک ہائی ریزولیشن ڈیجیٹل کیمرہ بھی ٹرائی پوڈ کے ساتھ خرید لیا۔

جب مدثر صاحب، وکی کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچے تو انہیں ایک بوڑھا دکھائی دیا جو ایک لاٹھی کے سہارے جھکا کھڑا تھا۔ وکی دیکھنا چاہتا تھا کہ مدثر صاحب

اسے اس روپ میں پہچانتے ہیں یا نہیں۔

مدثر صاحب کار سے نکل کر وکی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ تب بوڑھے آدمی نے ان سے ٹائم پوچھا۔ انہوں نے ٹائم بتا دیا۔ پھر وکی نے کہا۔

"اب تو لیپ ٹاپ دے دو انکل۔"

مدثر صاحب اندر سے لرز کر رہ گئے۔ وہ سمجھے کہ یہ ضرور پولیس کا آدمی ہے جس نے ان کا فون ٹیپ کر کے سارا پروگرام سن لیا ہے۔ انہیں یوں نروس دیکھ کر وکی ہنس دیا اور اپنی اصلی آواز میں مخاطب ہوا۔

"ارے انکل یہ میں ہوں۔ وکی۔ چلیں کار کے اندر۔"

وکی خوش تھا کہ مدثر صاحب جیسا پرانا جاننے والا اسے نہیں پہچان پایا۔ خود مدثر صاحب بھی اس کے اس روپ سے بہت متاثر ہو رہے تھے اور انہیں یقین تھا کہ پولیس کے لیے اسے پہچاننا ناممکن ہی سمجھے۔

"مگر بیٹا۔ ایک پرابلم ہے۔"

"وہ کیا؟" وکی چونک گیا۔

"تم یہ لیپ ٹاپ چارج کیسے کرو گے؟"

"اوہ۔" وکی نے ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "اس کے لیے میں نے موٹر سائیکل چارجنگ کٹ خرید لی ہے ضرورت پڑنے پر اسی سے چارج کر لیا کروں گا۔"

"مگر لیپ ٹاپ کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟" مدثر صاحب نے پوچھا۔

"وقت آنے پر آپ کو پتا چل جائے گا انکل۔ فکر نہ کریں۔" وکی نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

مدثر صاحب نے وکی کو وہاں اتارا جہاں اس نے اپنی موٹر سائیکل چھپائی ہوئی تھی۔ وہاں وکی نے اپنا بھیس اتار کر بیگ میں رکھ لیا اور اپنے اصلی روپ میں موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسے ہائی وے پر دوڑانے لگا۔ اسی جنگل کی طرف جو آج کل اس کی پناہ گاہ تھا۔

......☆☆☆

وکی نے زندگی میں کبھی ریوالور کو چھوا تک نہیں تھا مگر اب وہ جنگل میں خود کو ٹرینڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سردارنی کو جب پتا چلا تو اس نے وکی کو کالیا نامی آدمی کے حوالے کر دیا جو ماہر نشانے باز تھا۔ وہ وکی کو ایک جگہ لے گیا جسے دیکھ کر وکی دنگ رہ گیا۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ جنگل یہ سب کرتے ہوں گے۔ یہ ٹریننگ کے میدان کی طرح تھا جیسے سپاہیوں کی تربیت کے ہوتے ہیں۔ یہاں تربیت حاصل کرنے والوں میں بچے اور لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ ان سب کو ایک انسٹرکٹر کنٹرول کر رہا تھا۔

اس میدان میں سب کچھ سکھایا جا رہا تھا۔ دوڑنا، اونچائی سے کودنا، پاؤں کے بل لٹکنا۔ رسی سے اوپر چڑھنا اترنا۔ ٹارزن کی طرح ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر جھولتے ہوئے جانا۔ پاؤں کے پنجے مضبوط بنانا۔ اپنی کلائی سے لکڑی توڑنا۔ بازوؤں کو ٹھوس بنانا۔ لاتیں چلانا۔ گھونسے مارنا۔ کہنی کے بل چلنا اس کے علاوہ بہت کچھ سیکھا اور سکھایا جا رہا تھا۔ وکی کو ایسا لگ رہا تھا جیسے باقاعدہ کوئی فوج تیار کی جا رہی ہو۔ مگر کالیا نے کہا کہ وہ یہ سب صرف اپنی حفاظت کے لیے سیکھتے ہیں۔ کیونکہ کبھی کبھی کوئی ڈکیت گروہ آ جاتا ہے تو وہ ان کو منہ توڑ جواب دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

کالیا اس میدان میں وکی کو ریوالور چلانے کی تربیت دینے لگا۔ بالکل اسی طرح جیسے سیکھا جا سکتا ہے۔ وکی کا دماغ بہت تیز تھا اس لیے اس کے سیکھنے کی رفتار بھی بہت تیز تھی اور پھر اس پر ایک دھن بھی سوار تھی۔ اپنی عادت کے مطابق اس جنگل میں بھی وکی پرسکون اور اپنا دماغ ٹھنڈا رکھتا تھا۔ اور ہر کسی سے مسکرا کر بات کرتا تھا۔ کسی کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کن حالات میں اپنی لاڈلی بہن کو کھویا ہے اور نہ ہی اس نے کسی کو اس حادثے کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔

سردارنی نے بھی اس سے کوئی پوچھ تاچھ نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جو اس گھنے جنگل میں آتا ہے تو ضرور اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوا ہوگا جب ہی تو وہ اپنی دنیا چھوڑ کر یہاں آیا ہے۔ سردارنی کو ہماری دنیا پر کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس سماج میں بڑے مگر مچھ چھوٹی عوام نامی مچھلی کو کھا جاتے ہیں۔ امیر غریب کو کھا جاتا ہے۔ ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ وہ ہماری دنیا کے قانون کو جنگل کا قانون کہتی تھی اور اپنے جنگل کے قانون کو حقیقی قانون مانتی تھی۔

سردارنی نے وکی کو فوجی ٹائپ کا چمڑے کا ایک بڑا سا بیگ دیا جو اسٹریپس کے ذریعے پیٹھ پر باندھا جاسکتا تھا۔ وکی نے اس بیگ میں اپنی ضرورت کے مطابق بھیس بدلنے کا سامان، کپڑے، کیمرہ، لیپ ٹاپ، ریوالور، فالتو گولیاں اور باقی چیزیں رکھ لیں۔

وکی نے کالیا کے پاس ایک لکڑی دیکھی جو تین فٹ لمبی اور بے حد مضبوط تھی۔ دستے کی طرف چمڑے کی پٹیاں تھیں جس سے اس لاٹھی کو کلائی سے باندھ لیا جاتا تھا تاکہ وہ ہاتھ سے چھوٹ نہ سکے۔ اس کی چوٹ لوہے کی سلاخ سے کم نہیں تھی۔ وکی نے وہ لاٹھی پیسے دے کر کالیا سے خرید لی۔

''میں اس جنگل میں پہلی بار کوئی چیز بیچ رہا ہوں وکی بابو۔'' کالیا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اب تو بیچنے کے لیے ایسے اور بھی ہتھیار بناؤں گا۔''

وکی نے اس لاٹھی کو بھی اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

وکی نے میدان میں تربیت حاصل کرنے والے کچھ بچوں کو بھی ایسا ہتھیار استعمال کرتے ہوئے دیکھا تھا جو خود حفاظتی کے لیے بہترین تھا۔ اس نے کچھ کے پاس لوہے کا مکہ بھی دیکھا تھا جو ہاتھ کی چار انگلیوں میں پہنا جاتا تھا۔ وکی نے وہ ہتھیار بھی خرید کر اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ وہ بیگ ریچھ کے چمڑے کا بنا ہوا تھا۔

......☆☆☆......

رات کو وکی نے ہپی کا بھیس بدلا اور موٹر سائیکل پر سوار ہو کر جنگل سے باہر نکلا۔ پیٹھ پر وہی بیگ لادے وہ تیز رفتاری سے شہر کی طرف جا رہا تھا۔ دو گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد وہ شہر کے اندر داخل ہو گیا اور اس ریسٹورنٹ کے پاس پہنچا جہاں اس نے صاحبہ کے ساتھ اپنی آخری سالگرہ منائی تھی۔ اپنا بیگ ایک ویرانے میں چھپانے کے بعد وہ ہپی کی اداکاری کرتے ہوئے ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔

زیادہ تر لوگ اپنی ہی دھن میں تھے مگر کچھ وکی کو گھور رہے تھے کیونکہ اس کا لباس اور گیٹ اپ ہی ایسا تھا۔ بالکل کارٹون لگ رہا تھا وہ اس بھیس میں۔

اس نے ایک کولڈ ڈرنک منگوائی اور سگریٹ نکال کر کش لگانے لگا۔ اور ایک ایک آدمی کے چہرے کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اسے ان پانچ درندوں کی تلاش تھی۔ اسے بیٹھے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہو گیا تھا اس نے اپنے لیے دوسری ڈرنک کا آرڈر دیا۔ پھر وہ واش روم کا پوچھ کر اس طرف بڑھا اور خاص طور سے اس طرف جس گوشے میں اس نے صاحبہ کے ساتھ اپنا برتھ ڈے کیک کاٹا تھا۔ اس کے لاشعور میں اس رات کا ایک ایک منظر دوڑنے لگا۔ صاحبہ کی میٹھی میٹھی باتیں۔ اس کا ہر انداز۔ اپنی پیاری بہن کو یاد کر کے وکی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ اس ریسٹورنٹ سے نکل کر دوسرے، تیسرے، چوتھے اور کئی ریسٹورنٹس میں گیا مگر اسے اس کے مطلوبہ آدمی کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ وہ مایوس ہو کر دوبارہ جنگل کی طرف لوٹ گیا۔ جہاں کوئی اس کا

منتظر نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ اپنی چھوٹی سی جھونپڑی میں جا کر سو گیا۔

وہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس رات صاحبہ کے ساتھ جو درندگی کا کھیل کھیلا گیا وہ کسی فلم کی طرح اس کے سامنے چل رہا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ وہ دوبارہ سونے لگا تو کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وکی نے چونک کر دیکھا تو وہ ان لڑکیوں میں سے ایک تھی جو پہلے ہی دن سے اس کے زخموں پر لیپ لگایا کرتی تھی۔ اس کا خیال رکھا کرتی تھیں۔

وکی نے کچھ کہنا چاہا لیکن لڑکی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر شش کہہ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک دوسرے کی زبان تو سمجھنے سے قاصر تھے۔ مگر آنکھوں کا بیان صاف ظاہر تھا۔ پھر خاموشی کو زبان مل گئی اور وہ لڑکی وکی کے وجود پر چھاتی چلی گئی۔ اپنی چھبیس سالہ زندگی میں وکی ایسے جذبات سے ناآشنا رہا تھا۔ لڑکی اسے روشناس کرائی گئی اور وہ جذبات کی لہر میں بہتا چلا گیا۔

دوسرے دن وہ لڑکی وکی کو کہیں نظر نہیں آئی۔ پتا نہیں کہاں چلی گئی تھی۔ مگر وکی نے خود کو پہلی بار اتنا تر و تازہ محسوس کیا تھا۔ اس کا دل و دماغ بیتے ہوئے حادثے کی شدت کو کسی قدر کم محسوس کر رہا تھا۔ جو بھی تھا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

دوپہر کو وہ ماسٹر سے نشانے بازی اور لڑائی کے کچھ دیگر طریقوں کی تربیت لیتا رہا۔ اور رات ہوتے ہی وہ دوبارہ ہپی کا روپ دھار کر صاحبہ کے قاتلوں کی تلاش میں نکل پڑا۔

تلاش کی پہل اس نے اسی ریسٹورنٹ سے کی اور کل کی طرح کولڈ ڈرنک اور سگریٹ پیتے ہوئے وہ اپنے مطلوبہ چہرے ڈھونڈتا رہا۔ رات کے دو بج رہے تھے اور آہستہ آہستہ دوسرے کسٹمرز اٹھنے لگے تو وہ بھی مایوسی سے اٹھ کر باہر کی طرف بڑھنے لگا اور دروازے کے پاس رک کر سگریٹ سلگانے لگا۔ پہلا کش لے کر اس نے جیسے ہی چہرہ اوپر اٹھایا تو سامنے ایک کار آ کر رکی اور اس میں سے ایک آدمی جلدی سے اترا اور دوڑتے ہوئے ریسٹورنٹ کے اندر گیا، کیونکہ اسے پتا تھا کہ ریسٹورنٹ بند ہونے والا ہے۔

وکی نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا کہ وہ ان پانچوں میں سے ایک ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس رات کی طرح وہ پانچوں ہمیشہ ایک ساتھ ملیں گے مگر سب کچھ اس کے پلان کے الٹ ہو رہا تھا۔

وکی آرام سے چلتا ہوا اس کی کار کی طرف گیا جس کی فرنٹ سیٹ پر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وکی نے کار کا ایک چکر لگایا تب تک وہ آدمی ریسٹورنٹ سے کچھ بوتلیں اور کھانے کا سامان لے کر باہر آیا۔ آدمی نے سامان کھڑکی سے ہی لڑکی کو پکڑا دیا اور ایک سگریٹ نکال کر اس کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے سلگانے لگا۔

''شاید تم کو ایک اور کلائنٹ مل رہا ہے۔'' اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے لڑکی سے کہا۔ ''دیکھو وہ ہپی نما کارٹون تمہیں کتنے غور سے دیکھ رہا ہے۔''

تب وکی کو پتا چلا کہ وہ لڑکی ایک کال گرل تھی۔

آدمی نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ وکی بھی دوڑتا ہوا اپنی بائیک تک گیا اور کچھ فاصلے سے اس کار کا پیچھا کرنے لگا۔ پھر اس نے کار کو ایک بلڈنگ کے باہر رکتے دیکھا تو خود بھی رک گیا اور بائیک کی بتیاں بجھا دیں۔ جب وہ آدمی لڑکی کے ساتھ بلڈنگ کے اندر چلا گیا تو وکی بھی آگے بڑھا اور یہ دیکھ کر اس کا موڈ خراب ہو گیا کہ وہ ایک چھوٹا موٹا موٹیل تھا۔ جبکہ وکی تو اس آدمی کے گھر کا پتا لگانا چاہتا تھا۔ اب اس کے گھر کا پتا کیسے چلے......؟ ایک ہی راستہ تھا کہ وکی اس کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

انتظار کرے کہ کب وہ نکلے اور اپنے گھر واپس جائے۔
وکی اس آدمی کی کار کے پاس صبح ساڑھے پانچ بجے تک بیٹھا رہا۔ رات کے وقت دو ڈھائی گھنٹے کسی کا انتظار کرنا بہت مشکل کام تھا۔ وکی کی آنکھیں نیند میں ڈوب رہی تھیں مگر وہ جیسے تیسے خود کو جگائے ہوئے تھا۔

پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ موٹیل کے اندر گیا اور استقبالیہ سے معلوم کیا کہ کوئی چھوٹا بنگلہ کرائے پر مل سکتا ہے کیا۔ تو اس نے کہا کہ ہاں کیوں نہیں۔ وکی نے اسی وقت ادائیگی کر کے موٹیل کے بغل میں ایک چھوٹا بنگلہ بیس دن کے لیے کرائے پر لے لیا۔

وہ واپس اس آدمی کی کار کے پاس آیا تو اسے ایک اور کال گرل ملی جو ماڈرن تھی، خوب صورت بھی تھی اور جوان بھی اور اپنی چال اور رکھ رکھاؤ سے کال گرل بالکل نہیں لگتی تھی۔ وکی نے اس سے کہا کہ اگر وہ اس کا ایک کام کر دے تو اس کے بدلے میں دس ہزار روپے ملیں گے۔ لڑکی تو پانچ چھ سو کے آسرے میں مجبوری میں خود کو بیچنے نکلی تھی اتنی رات گئے۔ اس نے دس ہزار روپوں کی بات سن تو فوراً راضی ہو گئی اور کام پوچھا۔

وکی نے لڑکی کو اپنا بنگلہ دکھاتے ہوئے کہا کہ اپنی اداؤں سے کسی کو رجھا کر کسی دن ایک آدمی کو اس بنگلے میں لانا ہے۔ مگر یہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ تم کال گرل ہو۔ دس ہزار ایک آدمی کو وہاں لے جانے کے لیے۔ اور دس ہزار مزید دوں گا اگر دوسرے کو یہاں اور کسی اور بنگلے میں لے آئیں تو۔ پھر کل ملا کے پانچ آدمیوں کو کہیں نہ کہیں لے جانا ہے۔

لڑکی نے حیرانی سے موٹی موٹی آنکھوں کو پھاڑتے ہوئے پوچھا۔ "یعنی اگر میں ایک ایک کر کے پانچ آدمیوں کو آپ کی بتائی ہوئی جگہ پر لے گئی تو مجھے کل ملا کر پچاس ہزار روپے ملیں گے؟" لڑکی سے اتنے روپوں کی خوشی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ "کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟ کیا واقعی ایسا ہی ہو گا.....؟ کہیں آپ مجھے قربانی کا بکرا تو نہیں بنا رہے.....؟ میں بہت غریب لڑکی ہوں۔ پچاس ہزار میرے لیے ایک لاٹری کی طرح ہیں۔ پلیز..... آپ میرے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہے نا۔"

وکی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ دس ہزار فی آدمی کے حساب سے اسے پچاس ہزار تو ملیں گے ہی اور یہ کام کامیابی سے کرنے کی خوشی میں اسے پچاس ہزار کا بونس بھی ملے یعنی کل ملا کر اسے ایک لاکھ روپے ملیں گے۔

ایک لاکھ کا سن کر تو لڑکی کے پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ پھر وکی نے اس کا نام پتا اور موبائل نمبر لے کر اسے پیشگی پانچ ہزار روپے دیئے تب لڑکی کو یقین آیا کہ وہ واقعی سنجیدہ ہے۔

اس لڑکی کا نام نینا تھا۔ وکی نے اسے کہا کہ وہ فون پر بتائے گا کہ کب کس کو کہاں لے جانا ہے۔ پھر نینا نے بھی وکی کا نمبر لے لیا۔ اسی وقت وہ آدمی کال گرل کے ساتھ باہر نکلا۔

"وہ آدمی دیکھ رہی ہو.....؟ اسے کل رات دس بجے وہ سامنے والے بنگلے میں لانا ہے۔ کیا تم یہ کر سکو گی؟" وکی نے نینا سے کہا۔

نینا نے بوکھلا کر کہا۔ "اتنا جلدی۔ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔ اس سے ملنا ہو گا۔ اسے پٹانا ہو گا، تب ہی تو یہ کام ہو سکے گا۔"

"کوئی بات نہیں۔ مل کر سب فائنل کریں گے۔"

وکی نے یہ کہہ کر نینا کو وہیں چھوڑا اور اس آدمی کی کار کا پیچھا کرنے لگا۔

صبح کے چھ بج رہے تھے پو پھٹ رہی تھی اور وکی کو ساری رات سونا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اسے بوڑھے کا بھیس بھی بدلنا تھا مگر کار کا تعاقب کرتے ہوئے یہ

ممکن نہیں تھا۔ پھر اس آدمی نے لڑکی کو ایک جگہ اتار اور آگے بڑھ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ کار ایک گھر کے گیٹ کے اندر جاتی دکھائی دی۔

وکی نے وہاں کسی نہ کسی طرح سے پتا لگا لیا کہ وہ آدمی اسی گھر میں رہتا ہے۔ اس نے مکان اور لوکیشن کو اپنے دماغ میں بٹھا لیا۔

اب واپس جنگل جانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ وکی اپنے کرائے کے بنگلے میں آ گیا اور دوپہر کے دو بجے تک گہری نیند سوتا رہا۔

......☆☆☆☆......

وکی لنگڑے بوڑھے کے بھیس میں شہر کی سیر کو نکلا اور جب اس نے دیکھا کہ لوگ اسے بھکاری سمجھ کر بھیک دے رہے ہیں تو وہ مزید سیر کرنے سے باز آ کر اس جگہ پہنچا جہاں اس آدمی کا گھر تھا۔ وہ کچھ دیر ایک کونے میں چھپا گھر کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے نینا کو فون لگایا۔ اس نے اپنے بھیس کی وجہ سے چھپ کر فون کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ آج کل موبائل اتنا عام ہو چکا تھا کہ اگر کسی کے پاس نہیں تھا تو لوگ اسے حیرت سے دیکھتے تھے۔ اور بھکاریوں کے بارے میں تو سب کا یہی تاثر رہا ہے کہ ان سے زیادہ امیر تو اس شہر میں کوئی ہے ہی نہیں۔

اس نے نینا کو اسی وقت ملنے کے لیے بلایا۔ جب نینا اس کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچی تو پہلے تو وہ اسے اس روپ میں پہچان نہیں پائی اور جب وکی نے اس سے اپنا تعارف کروایا تب وہ حیران رہ گئی اور سوچنے لگی کہ شاید یہ خفیہ پولیس کا کوئی آدمی ہے۔ وکی نے نینا کو اپنا منصوبہ اچھی طرح سے سمجھایا۔ اور نینا نے گردن ہلاتے ہوئے سمجھنے کا اشارہ دیا۔

کافی دیر انتظار کے بعد جب وہ آدمی گھر سے باہر نکلا تو پلان کے مطابق نینا نے انگوٹھا اٹھا کر لفٹ مانگی۔ وکی کو اندازہ تھا کہ وہ آدمی چھٹا ہوا عیاش ہے۔ اور اس کی توقع کے عین مطابق اس نے خوش ہوتے ہوئے نینا کو لفٹ دی۔

وکی کے سکھائے ہوئے سبق کے مطابق ڈائیلاگ بولتے ہوئے نینا اسے پٹانے لگی۔

لیکن اس آدمی کی توجہ نینا کی باتوں کی بجائے اس کے کھلے گریبان میں زیادہ تھی اور اس جیسے جنسی جنونی کو پھنسانے کے لیے نینا کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی اور پھر نینا جیسی اکیس سالہ خوب صورت اور طرح دار لڑکی بغل میں ہو تو رال ٹپکنی ہی تھی۔

وکی کے سکھائے کے مطابق نینا نے اسے رات گیارہ بجے اسی ریسٹورنٹ میں ملنے کو کہا جہاں وکی نے اپنی سالگرہ منائی تھی۔ کیونکہ وہاں سے وکی کا حاصل کیا ہوا بنگلہ زیادہ دوری پر نہیں تھا۔

ادھر وکی نے مدثر صاحب سے اپنا اصلی شناختی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس منگوایا جو آفس میں رکھا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ لیپ ٹاپ کے ساتھ پرنٹ نکالنے کے لیے ایک پرنٹر بھی ساتھ لانے کو کہا۔

یہ سب لے کر وکی دوبارہ اپنے کرائے کے بنگلے پر آ گیا اور لیپ ٹاپ کھول کر فوٹو شاپ پر اپنی ہپی کے بھیس والی تصویر کو اصلی تصویر کی جگہ پیسٹ کر کے شناختی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس کی کاپیاں پرنٹ کر لیں۔ اس نے ہپی والے شناختی کارڈ پر اپنا نام وکی بدلہ پرنٹ کیا تھا۔ یعنی بدلہ اس کی ذات تھی۔ اب یہ بدلہ بدلنے والا بدلہ تھا یا انتقام والا بدلہ۔ اس وقت دونوں ہی درست تھے اس کے لیے۔ اہم مواقع پر وکی کا دماغ عام دنوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی کام کرتا تھا۔

شام ہونے سے پہلے وکی نے ہپی والے بھیس میں بلیک مارکیٹ کے اسی آدمی سے رابطہ کیا اور اس کے ذریعے ریوالور کے لیے سائلنسر اور کچھ مزید گولیاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

خریدیں اور ایک کار بھی کرائے پر لے کر گیرج میں کھڑی کردی۔ پھر اس نے نینا کو فون کرکے اس بنگلے میں آنے کو کہا۔

نینا جب وہاں آئی تو اس کا پہلا جملہ ہی یہ تھا کہ "سر! ایسے ویران بنگلے میں تو ہم کو رات گزارنے کے لیے ہی بلایا جاتا ہے۔ کیا آپ نے بھی اسی مقصد سے مجھے یہاں بلایا ہے؟ کیا آپ بھی میرے ساتھ رات گزارنا چاہتے ہیں؟"

وکی نے نینا کو بتایا کہ اسے ایسے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے صرف اپنے کام سے مطلب ہے۔

اس کے بعد وکی نے نینا کو ریہرسل کروائی کہ جب وہ اس آدمی کو بنگلے میں لے کر آئے گی تو اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے ایک ایک نقطہ واضح کرکے بتایا اور اسے یہ سب ہوشیاری کے ساتھ سرانجام دینے کے لیے کہا۔

"دیکھو ایک بھی غلطی نہیں ہونی چاہیے اور تم کو ٹھیک وقت پر بنگلے سے نکل جانا ہوگا۔"

پھر وہ نینا کو اس بیڈ روم میں لے آیا جو اس مقصد کے لیے استعمال ہونا تھا۔ یہاں بھی اس نے پوری تفصیل کے ساتھ اسے سمجھایا کہ اسے کب کیا کرنا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اس آدمی کو برہنہ کرنا ہے خود کو برہنہ کیے بغیر۔

"اور اگر وہ مجھے بے لباس کرنے لگے تو؟" نینا نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا

"کسی بھی صورت میں نہیں۔ کہنا کہ انتظار کرو، صبر کرو، دھیرے دھیرے کرنے میں زیادہ مزا آئے گا۔ تم نے کسی بھی قیمت پر بے لباس نہیں ہونا ہے، کیونکہ اسے برہنہ کرتے ہی تم کو واش روم جانے کا بہانہ کرکے بیڈ روم سے باہر نکلنا ہے۔ سمجھ گئیں؟"

"او کے سمجھ گئی۔ پھر کمرے سے نکل کر کہاں جاؤں گی؟" نینا نے بولی۔

"کمرے سے نکل کر تم نے لاؤنج میں آنا ہے۔ لیکن یاد رکھنا کہ تم نے گھر کے اندر آتے ہوئے اپنا ہینڈ بیگ جس میں تمہارا موبائل بھی ہوگا لاؤنج میں صوفے کے پاس چھوڑ دینا ہے۔ تاکہ جب تم بیڈ روم سے نکلو تو بیگ لے کر نکلنے میں آسانی ہو۔ یہاں تم گھر سے باہر نکلو گی وہاں میں گھر کے اندر آجاؤں گا۔"

"اتنی رات کو باہر نکل کر میں کہاں جاؤں گی؟" نینا نے ایک اور سوال داغ دیا۔

"بنگلے کے سامنے ایک ٹیکسی تمہارے لیے بک ہوگی۔ اس ٹیکسی میں اپنے گھر یا جا کہیں تمہارا من کرے چلی جانا۔ ٹیکسی والے کو پیمنٹ پہلے ہو چکی ہوگی۔ جہاں تم کہو گی وہ تو تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس چلا جائے گا۔ ویسے بھی تم اس دھندے میں ہو تو کہیں بھی رات گزارنا تمہارے لیے کیا مشکل ہے؟" وکی نے کہا۔

"جب میں اس آدمی کے ساتھ ہوں گی۔ تب کیا آپ مجھ سے بات کریں گے؟"

"ہاں بات کروں گا۔ جب تک کہ تم صوفے پر اپنا بیگ نہ رکھ دو تب تک۔ گھر کے اندر آنے سے پہلے میں تم سے رابطہ کروں گا اور فکر مت کرنا میں تمہارے آس پاس ہی رہوں گا مگر تم مجھے دیکھ نہیں پاؤ گی۔ مگر تم پر نظر رکھے ہوں گا۔ اگر وہ پوچھے کہ کس کا فون ہے تو کہہ دینا کہ میرے شوہر کا ہے جو اس وقت فیکٹری میں نائٹ ڈیوٹی کر رہا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ میں گھر پر ہوں، میں جانتا ہوں کہ یہ بات اس کے جذبات کو مزید بھڑکا دے گی۔ وہ یہ سوچ کر خوش ہوتا رہے گا کہ وہ بیچارہ فیکٹری میں نائٹ ڈیوٹی کر رہا ہے اور میں یہاں اس کی بیوی کے ساتھ عیش کر رہا ہوں۔" وکی نے اسے گر کی بات بتائی۔

"او کے سمجھ گئی سب کچھ۔" نینا مسکرائی۔

پھر وکی نے نینا کو پانچ چھ بار ریہرسل کروائی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ کیسے کمرے سے نکلنا ہے اور باہر جانا ہے۔ نینا کو بھی پورا سبق ازبر ہو چکا تھا اب اسے صرف وکی کے پلان کے مطابق عمل کرنا تھا۔

"سر اگر اس نے پوچھ لیا کہ یہ بنگلہ کس کا ہے تو؟" نینا نے ایک اور الجھن کا اظہار کیا اور وکی اس کی ذہانت پر داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

"کہہ دینا کہ تمہاری ایک سہیلی کے باپ کا ہے جو کہیں گئے ہوئے ہیں اور چابی تمہارے پاس ہے دیکھ بھال کے لیے۔ مگر جب تک وہ واپس نہیں آجاتے تب تک میں یہاں کسی نہ کسی دوست کے ساتھ آجاتی ہوں پارٹی منانے۔

وکی جنگل سے جانور کی پتلی پتلی چمڑی ساتھ لایا تھا۔ اس نے چمڑی کو کھڑکیوں اور دروازے کی چوکھٹ میں اس طرح چپکا دیا کہ ایک طرح سے بیڈ روم ساؤنڈ پروف کمرہ بن چکا تھا۔ وکی نے کمرے میں ہائی فائی ساؤنڈ سسٹم بھی لگا دیا تھا تاکہ اگر آواز باہر جانے کا کچھ امکان ہو بھی تو وہ میوزک کی آواز میں دب جائے۔

......☆☆☆......

آخر وہ وقت آ گیا جس کا وکی کو شدت سے انتظار تھا۔ وہ باہر ایک جگہ چھپ کر دوربین سے دیکھ رہا تھا اور پھر پلان کے مطابق نینا اس آدمی کو اپنے ساتھ ریسٹورنٹ میں لے جاتے ہوئے دکھائی دی۔ اور تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ہی دونوں باہر نکلے اور ان کی کار بنگلے کی طرف دوڑنے لگی۔

وکی کے اندازے کے مطابق انہیں ریسٹورنٹ میں ایک گھنٹہ تو لگ ہی جانا تھا۔ مگر نینا بہت فاسٹ لگتی تھی اس نے پندرہ منٹ میں ہی اس آدمی کو اپنے ساتھ چلنے پر تیار کر لیا تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ کون ہے ایسا جسے ایسی آفر ملے اور وہ ٹھکرا دے۔ سوائے فلموں اور کہانیوں کے ہیرو کے...... وہ بھی ان کی کار کے پیچھے چل پڑا اور جب اس آدمی کی کار بنگلے کے گیٹ پر پہنچی تو وکی نے نینا کو فون کیا۔ نینا نے اسکرین دیکھی اور آہستہ سے اس آدمی سے کہا۔

"میرے شوہر کا ہے۔ وہ اس وقت فیکٹری میں نائٹ ڈیوٹی کر رہا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ میں گھر پر اکیلی بور ہو رہی ہوں۔ جب تک میں فون بند نہ کروں تم کوئی بات نہ کرنا پلیز۔ آپ گیٹ کے اندر چلیں میں اسے ادھر ادھر کی باتیں کرکے ٹہلانے کی کوشش کرتی ہوں۔"

وہ آدمی مسکراتے ہوئے سوچنے لگا۔ بیچارہ فیکٹری میں نائٹ ڈیوٹی کر رہا ہے اور یہاں اس کی بیوی میرے ساتھ نائٹ ڈیوٹی کر رہی ہے۔ وہ خوش تھا کہ کسی اور کی بیوی اس کی بانہوں میں ہوگی۔ شاید یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ دوسرے کی چیز چھین کر خوش ہوتا ہے۔ وہ اکڑتا ہوا اپنا کالر ٹھیک کرتے ہوئے کار گیٹ کے اندر لے گیا اور اندر کے مرکزی دروازے پر نینا کا انتظار کرنے لگا۔

"سب ٹھیک ہے نا۔" وکی نے احتیاط سے کہا۔ "صرف ہاں یا نا میں جواب دو۔"

نینا نے جواب دیا۔ "ہاں۔"

"اسے کوئی شک تو نہیں ہوا نا؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ اسے میں نے اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ وہ میرے علاوہ کسی اور بات پر غور کر سکے۔" نینا نے ہلکے سے ہنستے ہوئے کہا۔

"او کے ٹھیک ہے۔ اب تم اندر جاؤ۔ مگر بھولنا نہیں کہ جیسے ہی اندر جاؤ تو اپنا موبائل بیگ میں ڈال کر بیگ کو لاؤنج والے صوفے پر رکھ دینا، اور اسے مکمل برہنہ کرنے کے بعد ہی بیڈ روم سے نکلنا۔ تم

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے کمرے کے باہر ہی پاؤ گی۔ نکلتے ہی اس کمرے کا دروازہ بند کر دینا۔ سمجھ گئیں نا؟"

"ہاں بابا۔ اتنی بار ریہرسل کی ہے کہ سب سمجھ گئی ہوں۔ بس میں اپنا کام کرنے لگی ہوں آگے آپ جانیں اور آپ کا کام۔"

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔"

دونوں کے اندر جانے کے بعد وکی نے دن میں جس ٹیکسی والے سے نمبر لیا تھا اسے فون کر کے بلا لیا۔ وکی نے اس سے کہا کہ جتنا بھی انتظار کرنا پڑے کر لینا۔ بنگلے سے ایک میم صاحب نکلے گی۔ وہ جہاں کہے اسے وہاں چھوڑ دینا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اوکے میں سر ہلا دیا۔ وہ دل میں یہی سوچ رہا تھا کہ کوئی کال گرل ہی ہوگی جو اس آدمی کے ساتھ وقت گزارنے آئی ہوگی اور اسے واپس بھی جانا ہوگا۔

ٹیکسی ڈرائیور سے نمٹنے کے بعد وکی بنگلے کے اندر آ گیا۔ اور بیڈ روم کے باہر کھڑے ہو کر ان کی سن گن لینے لگا۔ پھر اس نے اپنے بیگ سے ریوالور نکال کر اس پر سائیلنسر لگایا۔ ٹرائی پوڈ پر کیمرہ فکس کیا اور اپنی دائیں کلائی میں اس تین فٹ کی لاٹھی کو باندھ لیا۔ اور بائیں ہاتھ میں لوہے کا مکہ پہن لیا۔ لیپ ٹاپ بھی اس نے آن کر لیا تھا۔ اب وہ سکون سے لاؤنج میں بیٹھ کر نینا کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد نینا جلدی سے بیڈ روم سے باہر نکلی۔

"اندر وہ بالکل برہنہ ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "اس حالت میں تو وہ باہر نہیں آئے گا۔"

وکی نے بھی دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شاباش۔" پھر دس ہزار روپے اسے دیتے ہوئے بولا۔ "باہر ٹیکسی کھڑی ہے۔ اس میں بیٹھ جاؤ مگر اپنے گھر سے آگے پیچھے اترنا۔ میں نہیں چاہتا کہ ٹیکسی والے کو پتا چلے کہ تم کہاں رہتی ہو۔ اوکے۔"

وکی نے انتظار کیا اور جب نینا ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ پھر وہ سارا سامان لے کر بیڈ روم میں داخل ہوا۔ اندر جاتے ہی اس آدمی کے سنبھلنے سے پہلے ہی سائلنسر لگے ریوالور سے اس کے ننگے کولہے پر گولی چلا دی۔ وہ آدمی اپنا زخم پکڑ کر زور سے چلایا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ درد سے کراہنے لگا۔ وکی نے میوزک سسٹم آن کر کے آواز تیز کر دی تاکہ چیخنے کی آواز باہر جانے کا اندیشہ نہ رہے۔

"کک...... کون ہو تم، مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ گولی کیوں ماری؟" وہ تڑپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ لڑکی کہاں ہے؟"

وکی اس وقت ہپی کے روپ میں تھا اور ہمیشہ کی طرح بالکل سکون اور آرام سے اپنی چال چل رہا تھا۔ بنا کسی ہڑبڑاہٹ کے، بنا کسی ٹینشن کے۔ وہ اپنا ہر قدم نہایت احتیاط اور آرام سے اٹھا رہا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر ایک گولی اس کے کولہے پر ماری تھی تاکہ ایک تو وہ بھاگ نہ سکے اور دوسرا یہ کہ نفسیاتی طور پر خوفزدہ ہو جائے۔

وکی نے دروازہ لاک کر کے چابی اپنی جیب میں رکھ لی۔ ٹرائی پوڈ پر رکھا ہوا کیمرہ آن کیا اور اس آدمی پر فوکس کیا۔ وہاں ایک میز کرسی کا بھی پہلے سے انتظام کیا ہوا تھا جس پر لیپ ٹاپ سجایا اور آرام سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس آدمی کو گھورنے لگا۔ تب تک وہ آدمی بیڈ کی پچھلی طرف کھسک گیا تھا جیسے اس کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اب تک وکی نے اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ بس یونہی اسے گھورتے ہوئے ایک سگریٹ سلگائی اور اٹھ کر اس کی طرف چلا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے سگریٹ کا دھواں اس کے چہرے پر چھوڑا۔ پھر مسکراتے ہوئے اسے آنکھ ماری اور دوبارہ اپنی کرسی پر چلا گیا۔

"مم۔ مجھے ہسپتال لے چلو۔" وہ آدمی ڈر اور تکلیف سے تھر تھر کانپتے ہوئے بولا۔ "مجھے بہت درد ہو رہا ہے آخر تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو، مجھے اس طرح کیوں تڑپا رہے ہو؟"

"مجھے تمہارا انٹرویو لینا ہے۔" وکی نے کہا۔ "تمہارا نام اور پتا اور جو جو میں پوچھوں اس کا صحیح صحیح جواب دینا۔ ورنہ دوسرے کولہے میں بھی گولی اتارتے ہوئے مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"ہاں۔ میں سب بتا دوں گا۔ مگر آپ کون ہو بھائی؟" اس کی آواز میں درد کی لہر ابھری ہوئی تھی۔

"میں کون ہوں۔ تمہیں یہ جاننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی میرے سوالوں سے تمہیں پتا چل جائے گا کہ میں کون ہوں۔" وکی کا لہجہ انتہائی سرد تھا۔

وکی نے کیمرہ صرف اس کے چہرے پر فوکس کیا تاکہ اس کے تاثرات ریکارڈ ہوتے رہیں۔ خود لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گیا۔

"اب شروع ہو جاؤ۔ اپنا نام، عمر، پتا ٹھیک ٹھیک بتانا۔ جھوٹ بولا تو ایک اور گولی کھانے کے لیے تیار رہنا۔"

وہ کانپتی ہوئی آواز میں شروع ہو گیا۔ "میرا نام پرویز خان ہے۔ عمر ستائیس سال۔ پتا 69 گارڈن ایسٹ۔"

وکی ریکارڈ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے لیپ ٹاپ پر بھی انٹری کرتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ کیمرہ پاز کیا اور اس کے پاس جا کر ہاتھ میں بندھی ہوئی لاٹھی سے اس کی دوسری ٹانگ پر تین چار زوردار طریقے سے وار کیا اور وہ آدمی کٹتے ہوئے بکرے کی طرح چلانے لگا۔

"بتا تو رہا ہوں۔ پھر کیوں مار رہے ہو؟"

"یہ غلط پتا بتانے کی سزا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کہاں رہتے ہو اور تمہارے گھر کا نمبر کیا۔ شکر کرو کہ گولی نہیں ماری۔ صرف لاٹھی سے مارا ہے۔"

اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا اس نے اپنا درست پتا بتایا اور وکی کا اگلا سوال سن کر تو اسے حقیقت میں غش آنے لگا۔

"اپنے ان چار ساتھیوں کے نام، ایڈریس، عمریں بتاؤ جو اس رات تمہارے ساتھ تھے جب تم لوگوں نے صاحبہ جمالی کا ریپ کیا تھا۔ اور غور سے سنو۔ اگر ایک بھی چیز غلط بتائی تو تمہاری دونوں ٹانگیں کاٹ کر اپاہج بنا دوں گا۔ زندگی بھر چلنے سے معذور ہو جاؤ گے، سمجھے؟"

وکی اپنا کہا ہوا ہر لفظ ریکارڈ نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ گولی مارنے، اپاہج بنانے یا دوسرے دھمکی آمیز الفاظ حذف کرتے ہوئے صرف سوال اور جواب ریکارڈ کر رہا تھا۔ اور جو کمی بیشی رہ جاتی وہ بعد میں ایڈٹ کر کے دور کر سکتا تھا۔

وکی اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھاتا ہوا اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"تت...... تم ہو کون، یہ تو بتا دو...... پولیس ہو، سی آئی ڈی ہو، کیا ہو؟" اس نے روتے ہوئے پوچھا۔

اب وکی کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنا ہپی والا گیٹ اپ اتارنا شروع کیا اور اپنے اصلی حلیے میں آ کر اس آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ وہ آدمی وکی کو دیکھ کر بری طرح کانپ رہا تھا اور اس کے ہاتھ خود بخود معافی مانگنے والے انداز میں جڑ گئے۔

"اس کیمرے میں دیکھتے ہوئے سب سچ سچ بتا دو۔ نہیں تو تمہیں جان سے نہیں ماروں گا لیکن وہ حال کر دوں گا کہ تم موت کے لیے بھیک مانگتے پھرو گے اور موت نہیں آئے گی۔ اپنی جس مردانگی کا مظاہرہ تم نے اس رات کیا تھا وہ مردانگی ہی تم سے چھین لوں گا پھر زندگی بھر تڑپتے رہنا۔" وکی کے سرد لہجے کی غراہٹ نے اس آدمی کو اندر تک تھرا دیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنی عافیت محسوس کرتے ہوئے وہ مشین کی طرح شروع ہو گیا اور ایک ایک کر کے سب بتانے لگا اور وکی سب کے نام اور پتے اپنے لیپ ٹاپ پر ٹائپ کرتا گیا۔ اس دوران درد کی شدت سے وہ بے ہوش بھی ہوا لیکن وکی اس کے چہرے پر پانی چھڑک کر اسے دوبارہ ہوش کی دنیا میں لے آیا اور اسے اپنا بیان جاری رکھنے کو کہا۔ وہ اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔ آخر میں وکی نے کیمرے کو اس کے چہرے پر زوم کیا اور کہا۔

''اب اس کیمرے میں دیکھتے ہوئے کہو کہ تم نے صاحبہ جمالی کا ریپ اور خون کیا اس کے لیے تم معافی مانگ رہے ہو۔''

اس نے وکی کی ہدایت کے مطابق ویسا ہی کیا۔ جب بیان مکمل ہو چکا تو وکی نے کیمرہ آف کیا اور اس لاٹھی کو اپنی مٹھی میں کس کر اس کے پاس گیا اور ایک جنون کی سی کیفیت میں اس پر لاٹھی برسانے لگا۔ اس کی ٹانگوں پر، پیٹھ پر، چہرے پر، مارتا گیا' مارتا گیا۔ جیسے وہ اپنے حواسوں میں نہ ہو۔ وکی کو ایسی حالت میں کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ کہتے ہیں نا کہ ٹھہرا ہوا پانی سمندر کی موجوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

وکی ویسا ہی تھا۔ ہمیشہ ٹھنڈا رہنے والا۔ مگر اس وقت وہ اپنی صاحبہ سے کیا ہوا وعدہ نبھا رہا تھا۔ اس کے کانوں میں صاحبہ کے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔

''بھیا۔ تم اس کا بدلہ لو گے نا؟''

وہ اس ادھ مرے کو مارتا ہی جا رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا مگر وکی کو بھی کب ہوش تھا اس کے تو بس ہاتھ چل رہے تھے ایک مشینی انداز میں۔ ہوش تو وہ بھی اپنے کھوئے ہوئے تھا۔ اس آدمی کے خون کے چھینٹوں سے کمرے کا فرش رنگین ہو رہا تھا مگر وکی کا ہاتھ نہیں رک رہا تھا۔ وکی کی مثال ایک سلگتے ہوئے ڈھیر کی طرح تھی۔ ہوا ملنے پر ایسی آگ بھڑکتی ہے جو بجھائے نہیں بجھتی۔ جب وہ خود مارتے مارتے تھک گیا تو ریوالور کی ساری گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں اور میگزین خالی ہونے پر بھی وہ ٹرائیگر دباتا چلا گیا کافی دیر تک۔

پھر جیسے وہ صاحبہ سے مخاطب ہو رہا ہو سلگتی آنکھوں اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ۔

''صاحبہ بے بی۔ ایک سے تو بدلہ لے لیا میں نے۔ باقی کو بھی بہت جلد ختم کر دوں گا۔ میری لاڈلی بہن۔ ایک تو گیا...... ایک تو گیا۔''

اس کے بعد وکی میوزک سسٹم بند کر کے آدھے گھنٹے تک چپ چاپ اس کمرے میں بیٹھا رہا۔ سگریٹ پر سگریٹ سلگاتا رہا جیسے اپنے سینے میں سلگتی ہوئی آگ کو سگریٹ کی آنچ دے رہا ہو۔

پھر وہ اٹھا اور کمرے کو صاف کرنے لگا اور لاش کو جنگل سے لائے ہوئے ایک بڑے چمڑے میں لپیٹ کر کار کی ڈکی میں ڈال کر اس آدمی کے گھر کے گیٹ کے پاس ڈال دی۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے اور پورا شہر سو رہا تھا۔

واپس آ کر اس نے کمرے کو اچھی طرح سے دھویا اور خون کا ہر دھبہ مٹا دیا۔ بستر کی چادر بھی واش روم میں دھو کر سکھانے ڈال دی۔ صبح ہو چلی تھی۔ اس نے احتیاط کے ساتھ ایک ایک جگہ کا جائزہ لیا کہ کہیں اس واردات کا کوئی سراغ نہ رہ گیا ہو اور مطمئن ہو کر دوسرے کمرے میں جا کر اپنی نیند پوری کرنے لگا۔

صبح گیارہ بجے اس کی آنکھ کھلی۔ سونے سے پہلے اس کا خیال تھا کہ اس آدمی کو مارنے کے بعد وہ سو نہیں پائے گا۔ برے برے ڈراؤنے خواب اسے ڈراتے رہیں گے۔ وہ بار بار چونک کر اٹھے گا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ پرسکون نیند لے کر جاگا تو اس کے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے کسی انسان کو نہیں پاگل کتے کو مارا تھا اور کتے کو مارنے کا غم کسے ہوتا ہے بھلا۔

برے خواب تو نہیں آئے تھے لیکن اس نے اپنی پیاری بہن صاحبہ کو ضرور دیکھا تھا خواب میں جو سفید لباس میں جس پر گلابی رنگ کی زریاں لگی ہوئی تھیں آئی تھی اور جیسے زندگی میں کرتی تھی اپنے بھائی کے گلے لگ کر اسے پیار کیا۔ وہ خوش نظر آ رہی تھی۔

جاگنے پر بھی وکی کو یہ خواب یاد رہا اور اسے یاد کر کے وہ خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا اور اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ رات کو اس نے کوئی برا کام کیا ہے۔ نہ ہی اسے کوئی افسوس تھا اور اس بات سے وہ بہت حیران تھا۔ وہ تو سوچ رہا تھا کہ کسی کی جان لینے سے اس کا جینا محال ہو جائے گا۔

اس نے کچن میں جا کر اپنے لیے کافی بنائی اور لاؤنج میں ٹی وی کھول کر کافی پینے لگا۔ ٹی وی پر اس وقت کوئی ڈرامہ چل رہا تھا جس کے مکالمے لگتا تھا کہ اسی کے بارے میں کہے جا رہے تھے۔

''دنیا میں جب بھی کوئی ظلم کرتا ہے تو خدا اس ظالم کو مٹانے کے لیے کسی نہ کسی کو مقرر کر دیتا ہے۔''

اس مکالمے کو سن کر وکی کو لگا کہ شاید خدا بھی ان ظالموں کا خاتمہ خود اسی کے ہاتھوں کروانا چاہتا ہے۔

فریش ہونے کے بعد وکی نے دوبارہ ایک ایک چیز کا بغور جائزہ لیا کہ کہیں کوئی نشان نہ رہ گیا ہو۔ گاڑی تک کا جائزہ لیا اور ہر طرف سے اطمینان کرنے کے بعد اس کے دل کو تسلی ہوئی۔

وکی نے مدثر صاحب کو فون کر کے بنگلے کا پتا بتاتے ہوئے مزید پانچ لاکھ روپے اور کچھ ضروری سامان لانے کو کہا اور اس بار بھی وہی سگنل رکھا گیا کہ اگر مدثر صاحب کوئی خطرہ محسوس کریں گے تو بنگلے میں داخل ہونے کی بجائے اپنا چشمہ اتار کر رومال سے صاف کرنے لگیں گے۔

مدثر صاحب کے آنے پر وکی نے انہیں تمام تفصیل بتا دی۔ جس پر مدثر صاحب نے کہا کہ یہ نیوز ہر چینل پر چل رہی ہے اور اس کی تفتیش بھی انسپکٹر خان کر رہا ہے کہ اس آدمی کو اتنی بے دردی سے کس نے مارا ہے۔

''میں جانتا ہوں کہ میرے ان اقدامات سے انسپکٹر خان کے لیے مشکلات میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ سلطان مجھے خان کے بارے میں بہت کچھ بتا چکا ہے کہ ڈی ایس پی چنگیزی کیسے اس کا دشمن اور ترقی کی راہ میں کانٹا بنا ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آخر میں انسپکٹر خان کی مدد کروں۔''

''کیا سلطان سے بات ہوئی تھی تمہاری؟'' مدثر صاحب نے پوچھا۔

''ہاں۔ ہوئی مگر بہت کم۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ بعد میں تفصیل سے فون کروں گا۔''

تب مدثر صاحب نے کہا۔ ''خان کے آدمیوں نے آفس کے فون ٹیپ کرنا شروع کر دیئے ہیں۔ ڈی ایس پی بھی چکر لگا چکا ہے۔ ان کمنگ اور آؤٹ گوئنگ کالوں کو ریکارڈ کرنے کے لیے پولیس اسٹیشن میں کنٹرول روم قائم کیا گیا ہے۔ تم کسی بھی حال میں آفس فون مت کرنا۔ انہیں شک ہے کہ تم آفس میں کسی نہ کسی سے رابطہ ضرور کرو گے۔''

''مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں ہے کہ وہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔'' وکی آرام سے بولا۔ ''بس آپ جب مجھ سے ملنے آتے ہیں تو ذرا ہوشیار رہا کریں۔ اگر کوئی آپ کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ گیا تو میرے لیے بہت مشکل پڑ جائے گی۔''

دوپہر کے بعد وکی نے نینا سے رابطہ کیا۔ ''اگر کسی طریقے سے پولیس تم تک پہنچ جائے اور اس آدمی کے بارے میں پوچھ تاچھ کرے تو صاف مکر جانا کہ تم

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسے جانتی نہیں ہو۔ سمجھ گئیں؟"
"میں سمجھ گئی سر۔ آپ فکر نہ کریں۔ اگر پولیس مجھ تک پہنچ گئی تو مجھے پتا ہے مجھے کیا کہنا ہے۔" نینا نے کہا۔

......☆☆☆......

وکی کا اگلا قدم باقی چاروں کے دیئے گئے پتوں کو تلاش کرنا اور ان کے بارے میں معلومات کرنا تھا۔ اس نے نہایت سکون کے ساتھ ایک ایک کر کے چاروں کے بارے میں کھوج نکال لی کہ کون کہاں کام کرتا ہے۔ کتنے بجے گھر سے نکلتا ہے۔ کتنے بجے گھر آتا ہے۔ گھر میں کتنے افراد ہیں۔ اور پھر وہ رات کو کب باہر جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے تین اسی شہر کے تھے صرف ایک دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ اس نے مرنے والے سے چاروں کے نام تو لے لیے تھے مگر یہ پوچھنا بھول گیا تھا کہ ان میں سے لیڈر کا نام کیا ہے' کیونکہ لیڈر کے لیے وکی نے کچھ الگ ہی سوچ رکھا تھا اور یہ بھی کہ اگر آج کوئی شکار ہاتھ لگ گیا تو وہ رات کو ہی اس سے لیڈر کے بارے میں معلوم کر لے گا۔

ان چاروں میں سے وکی نے ایک کو نشانہ بنایا اور نینا کو سمجھانے کے بعد اس شکار کے گھر کے سامنے لے گیا۔ پھر اسی طرح لفٹ مانگنے کے لیے۔ مگر اسے اس وقت دھچکا سا لگا جب اس کا شکار کار کی بجائے پیدل گھر سے باہر آیا۔ وکی نے اس بارے میں تو معلومات حاصل ہی نہیں کی تھیں کہ کس کے پاس گاڑی ہے اور کس کے پاس نہیں۔

اس آدمی کو پیدل دیکھ کر نینا گھبرا گئی کہ اب کیا کرے۔ اس نے مڑ کر وکی کی طرف دیکھا۔ وکی سمجھ گیا کہ وہ کنفیوز ہو رہی ہے۔ اس نے فوراً اسے کال کی۔

"سنو نینا۔ تم مجھ سے فون پر بات کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلو۔ قریب۔ اور زیادہ قریب۔ ہاں۔ مجھے کوئی جواب مت دینا بس سنتی رہنا اور اسے دیکھتی جاؤ۔ اسے رجھانے کی کوشش کرو۔ تم کیا کر سکتی ہو یہ تمہیں سکھانے کی ضرورت نہیں ہے' اور جب وہ تم سے بات کرنے کی کوشش کرے تو آج رات دس بجے ملنے کا ٹائم دو۔ اس سے بھی وہی کہنا کہ تمہارا شوہر فیکٹری میں نائٹ ڈیوٹی پر جائے گا تب تم اس سے مل سکتی ہو' اسے بنگلے کا پتا دیتے ہوئے کہنا کہ تم وہیں رہتی ہو۔"

نینا' وکی کی ہدایت پر عمل کرتی گئی اور اس آدمی کی رال ٹپکنے لگی۔ پکا پکایا پھل خود اس کی جھولی میں آ کر گرنے کو تیار تھا۔ اس نے بات کرنے میں پہل کی اور پھنس گیا۔ اس نے نینا کو کافی کی پیش کش کی اور وہ دونوں قریب کے ایک ریسٹورنٹ میں چلے گئے جہاں کافی کے دوران ہی رات کی ملاقات کا وقت طے ہو گیا۔

......☆☆☆......

رات کے دس بج رہے تھے۔ وکی اور نینا اسی بیڈ روم میں بیٹھے شکار کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ ڈور بیل بجائے اور اس کی زندگی کی ڈور کاٹنے کی تیاری شروع کر دی جائے۔ اس بار وکی اسی کمرے میں رہنا چاہتا تھا ایک الماری کے پیچھے چھپ کر۔ نینا کو ویسا ہی کرنا تھا جیسا پچھلی بار کیا تھا کہ اس آدمی کو برہنہ کر کے اسے بہانے سے باہر نکل جانا تھا۔

پھر وہ لمحہ بھی آ پہنچا جب شکار خود چل کر کچھار میں آ پہنچا۔ پلان کے مطابق نینا نے اپنے حصے کا کام کیا اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ نینا کے جانے کے تھوڑی دیر بعد وکی الماری کے پیچھے سے نکلا اور اس آدمی کے گھٹنے میں گولی مار کر اسے پہلے ہی حواس باختہ اور خوفزدہ کر دیا۔ وہ اپنا گھٹنا پکڑ کر ڈکرائے ہوئے بیل کی طرح چیخ رہا تھا۔ وکی نے میوزک سسٹم آن کر کے آواز تیز کر دی۔

"اگر چلائے تو دوسرا گھٹنا بھی گنوا بیٹھو گے۔ چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ اس وقت میں مالک ہوں اور تم غلام۔ تمہارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جو میں کہوں وہ کرو۔"

اس دوران وکی نے ٹیکسی والے کو فون کیا تو اس نے کہا کہ وہ میم صاحب کو لے کر جا رہا ہے۔ راستے میں ہے۔

شکار درد سے کراہتے ہوئے بولا۔ "مجھے اس لڑکی نے کیوں پھنسایا......؟ کون ہو تم...... میں بے قصور ہوں۔ اس نے مجھے بلایا تھا۔ اسی نے کہا تھا کہ اس کے شوہر کے نائٹ ڈیوٹی پر جانے کے بعد ملنے آ سکتا ہوں۔ مجھے یہاں کا پتا بھی اسی نے دیا تھا۔ کیا تم اس کے شوہر ہو؟ اگر ہاں تو میرا قصور کیا ہے؟ تم یہیں چھپے ہوئے تھے اور تم نے خود سب کچھ سنا تو پھر مجھے گولی کیوں ماری؟ پلیز مجھے اسپتال لے چلو۔ میں کہہ دوں گا کہ راستے میں کوئی گولی مار کر بھاگ گیا۔ تمہارا نام نہیں لوں گا۔ پلیز جلدی لے چلو۔"

وکی نے پہلے کی طرح کیمرہ شکار پر فوکس کیا اور اپنے لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھ گیا۔

"میں نے اس لڑکی سے جو کہنے کو کہا وہ اس نے کیا۔ میں نے اسے پیسے دیئے تھے۔ تم کو یہاں لانے کے لیے۔ کیونکہ مجھے تمہارا انٹرویو لینا ہے۔" وکی نے کہا۔

"یہ کیا طریقہ ہے۔" شکار نے اپنی طرف سے کچھ غصہ دکھانے کی کوشش کی۔

"میرا اسٹائل ہی ایسا ہے۔ اگر تم کو پسند نہیں آیا تو میں کیا کروں۔ اب چپ چاپ بیٹھتے ہو یا دوں ایک اور گولی؟"

وہ ایک ہاتھ سے پسینہ پونچھتے اور دوسرے ہاتھ سے گھٹنا پکڑے بولا۔ "میں نے کیا کیا ہے۔ تم کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں تو تم کو جانتا بھی نہیں ہوں۔ مجھے جانے دو پلیز۔ مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔"

وکی ایک بار پھر اٹھ کر کیمرے پر گیا اور اسے ایڈجسٹ کرنے کے بعد ٹھنڈے لہجے میں بولا۔ "اوہ واقعی۔ کیا میں واقعی غلطی پر ہوں اور تم واقعی بے قصور ہو؟ او کے...... تو پھر تم صاحبہ جمالی کے ریپ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

یہ سن کر اس آدمی کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا اور پسینے کی دھاریں بہنے لگیں۔ اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"تت...... تم کون ہو...... تم اس بارے میں کیسے جانتے ہو؟"

"میں نے تم کو مارنے کی سپاری لی ہے۔ اس لیے اب تم مرو گے۔"

وہ آدمی کانپنے لگا۔ "نہیں' میں نے کچھ نہیں کیا۔ وہ تو ان چاروں نے مل کر' میں تو صرف ان لوگوں کے ساتھ گیا تھا۔ مگر میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔"

وکی مسکرایا اور بولا۔ "اچھا۔ تم نے کچھ نہیں کیا تھا' ٹھیک ہے' تو اتنے دنوں تک تم نے ان چاروں کے بارے میں پولیس کو کچھ کیوں نہیں بتایا اور تم جانتے وہ کہ الزام اس کے بھائی وکی جمالی پر لگا ہوا ہے۔"

"وہ تو اس بڑے باپ کے بیٹے نے جوش میں آ کر صاحبہ سے سیکس کرنا چاہا تھا۔ ہم تو اس کے ساتھ گئے تھے۔ وہ ایک دم پاگل ہے۔ آوارہ ہے۔ نفسیاتی ہے اور جانے کتنی ہی لڑکیوں کے ساتھ وہ ایسا کر چکا ہے۔ اس کے پاس سیاسی طاقت ہے۔ وہ کون ہے جانتے ہو تم؟ وہ ایک عرصے سے صاحبہ کے چکر میں تھا۔ کہتا تھا وہ اپنے بھائی کے ساتھ منہ کالا کرتی ہے اس لیے میں بھی اس کے ساتھ ایسا ہی کروں گا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ سنتے ہی وکی نے اس لوہے جیسی لاٹھی سے اس کے دوسرے گھٹنے پر اتنے وار کیے کہ وہ چلاتے ہوئے معافی مانگنے لگا۔

وکی نے اپنے چہرے پر پڑا ہوا نقلی پردہ ہٹا دیا اور اصلی روپ میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی تو جان ہی نکل گئی وکی کو اپنے سامنے دیکھ کر۔ وہ گڑگڑاتے ہوئے معافی مانگنے لگا۔

"معاف کردو...... معاف کردو مجھے۔ میں شادی شدہ ہوں۔ میرا ایک چھوٹا بیٹا ہے۔ میں اسے بہت پیار کرتا ہوں۔ وہ میرے بغیر رہ نہیں پائے گا۔ میں زندگی میں دوبارہ کبھی ایسا کام نہیں کروں گا۔ پلیز مجھے معاف کردو۔"

"ٹھیک ہے۔" وکی نے کہا۔ "تو پھر اس کیمرے کے سامنے اپنا جرم قبول کرو۔ بتاؤ کہ تم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر صاحبہ کا ریپ کیا۔ پوری تفصیل بتاؤ۔ یہ بتاؤ کہ میں اس وقت کہاں تھا اور تم لوگوں نے میرا کیا حال کیا تھا۔ بتاؤ کہ صاحبہ کیسے مری۔ سب بتاؤ۔ سب اس کیمرے میں ریکارڈ ہوتا رہے گا۔ اس کے بعد میں تم کو چھوڑ دوں گا۔"

اس نے سب قبول کرلیا اور وکی کے کہنے کے مطابق سب کچھ تفصیل سے دہرا دیا جو اس رات ہوا۔ پھر وکی نے اس سے ان کے لیڈر کے بارے میں پوچھا کہ وہ کون ہے۔ کیا کرتا ہے وغیرہ۔ اس کے بارے میں حقیقت جان کر وکی حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔ وکی کو جھٹکا سا لگا کہ وہ کتنے بڑے سیاسی گھرانے کا فرد تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ ساری جھوٹی رپورٹس اس کے خلاف ہی کیوں بنائی گئی تھیں کس کو بچانے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ یہ سب اسی لیڈر کا کیا دھرا تھا۔ اس کے پاس طاقت تھی۔ پیسے کی بھی اور سیاسی بھی۔

جب سب ریکارڈ ہو چکا تو وکی نے لوہے کا مکہ ہاتھ میں پہنا اور اس آدمی کے چہرے پر لگاتار ضربیں لگاتا چلا گیا۔

"کہتے ہو کہ تم شادی شدہ ہو ایک بیٹا ہے تمہارا...... تمہارا کوئی بیٹا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیا پتا بڑا ہو کر وہ بھی تم جیسا نکلے۔ کتے۔ تم نے میری بہن کی عزت کو پامال کیا سور کی اولاد۔ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ مار ڈالوں گا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کو ایک تھپڑ تک نہیں مارا۔ آج صرف تم لوگوں کی وجہ سے میں انسان سے بھیڑیا بن گیا ہوں۔ حرامی کے پلے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اسے مارتا چلا گیا۔ بنا سوچے کہ کیا کر رہا ہے۔ اسے کچھ یاد تھا تو صرف صاحبہ اور اس کی آخری خواہش۔

وہ آدمی اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا۔ چہرے کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا تھا۔ اس کی ایک آنکھ حلقوم سے باہر نکل آئی تھی۔ وکی رک گیا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ جگہ جگہ سے گوشت لٹک آیا تھا۔ مگر ابھی اس کی سانسیں چل رہی تھیں۔ چاروں طرف خون ہی خون تھا۔ وہ ایک زندہ لاش کی طرح وکی کے سامنے پڑا ہوا تھا۔ وکی کے ہاتھ بھی اس کے ناپاک خون سے رنگ چکے تھے۔ اس کے چہرے پر بھی خون کے چھینٹے بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا اور گھبرا سا گیا اور جلدی سے ریوالور کی ساری گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں۔

پھر اس نے اسی طرح ساری صفائی کی اور لاش چٹڑے میں لپیٹ کر اس کے گھر کی دیوار کے ساتھ ڈال دی۔ گھر واپس آ کر اس نے کمرے کو دوبارہ دھویا اور پھر لیپ ٹاپ پر صاحبہ کی تصویر کھول کر بری طرح رونے لگا۔

"صاحبہ! اپے بی آج ایک اور شیطان مار ڈالا میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے۔ دیکھو میں تمہاری بے عزتی کا بدلہ لے رہا ہوں۔ کمزور نہیں ہوں میں۔ تم اس رات کتنا تڑپی تھیں اور میں کچھ نہیں کر سکا تھا تمہارے لیے۔ اس وقت میں بہت بے بس تھا۔ ہو سکے تو اپنے اس مجبور بھائی کو معاف کر دینا۔ اس رات میں کچھ نہیں کر سکا' اپنی پیاری سی گڑیا کی حفاظت نہیں کر سکا مگر یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ آج ایک اور گیا' باقی تین شیطان رہ گئے ہیں۔ جلد ہی وہ بھی جائیں گے۔ وہ بھی جائیں گے۔" اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔

دوسرے دن وکی نے پہلا کام یہ کیا کہ رات کو اس نے جس آدمی کو مارا تھا اس کی بیوی کو کسی ذریعے سے یہ کہہ کر دو لاکھ روپے بھجوا دیئے کہ یہ اس کے شوہر نے لاٹری میں جیتے تھے۔ وکی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیوی اور بچہ در بدر ہو جائیں۔ یہی فرق تھا وکی اور ان شیطانوں میں۔

.......☆☆☆.......

دوسری لاش برآمد ہوئی اور انسپکٹر خان کا کام اور بڑھ گیا۔ فارنسک رپورٹ سے ثابت ہوا کہ دونوں قتل ایک ہی ریوالور سے کیے گئے ہیں اور یہ بات تو کسی رپورٹ کے بغیر ہی ظاہر تھی کہ مارنے سے پہلے اس کے چہرے کو شدید غصے کا نشانہ بنایا گیا تھا جس سے اس کے خدوخال بگڑ کر رہ گئے تھے۔ یہ تشدد بے انتہا نفرت کی علامت تھا۔ کون تھا وہ جو ان دونوں سے اتنی نفرت کرتا تھا؟

خان کا ذہن وکی کی طرف گیا لیکن اس نے سوچا کہ وکی تو بہت ہی ٹھنڈے دماغ کا انسان ہے اور اب تک کی تفتیش کے بعد یہی بات پتا چلی تھی کہ اسے کبھی کسی نے غصے میں نہیں دیکھا تھا جبکہ یہ دونوں قتل غصے اور نفرت کی آخری حد کا نتیجہ تھے' یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وکی کے اندر دھکتا ہوا لاوا بالآخر پھٹ پڑا ہوا؟ اگرچہ وکی پر شک کرنے کی بظاہر کوئی ٹھوس وجہ نہیں تھی پھر بھی اس کا ذہن اسی طرف دوڑ رہا تھا۔ اس نے سلطان کو فون کر کے پوچھا کہ کیا وکی نے اس سے دوبارہ کوئی رابطہ کیا ہے تو سلطان نے کہا کہ نہیں۔ خان کو سلطان کی بات پر یقین نہیں تھا۔ پھر اس نے مدثر صاحب کو بھی فون کیا یہی پوچھنے کے لیے کہ کیا وکی نے کوئی رابطہ کیا تو مدثر صاحب نے بھی انکار کر دیا۔ الٹا مدثر صاحب نے خان سے کہا کہ جیسے ہی وکی کی کوئی خبر ملے تو وہ سب سے پہلے انہیں اطلاع کریں۔

خان نے دونوں مقتولین کے دوستوں سے رابطے کا سوچا۔ جہاں وہ کام کرتے تھے وہاں تفتیش کی۔ گھر والوں سے پوچھ تاچھ کے دوران پتا چلا کہ دوسرے مقتول کے گھر کسی نے دو لاکھ روپے یہ کہہ کر بھیجے ہیں کہ یہ اس کے شوہر نے لاٹری میں جیتے تھے۔ خان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں یہ کسی جوئے کے اڈے کا معاملہ تو نہیں ہے۔ کہیں اس آدمی نے جوئے میں ایک کروڑ تو نہیں جیتا تھا کہ اسے مار کر اس کی بیوہ کو صرف دو لاکھ روپے بھیج دیئے گئے ہیں۔ خان کا دماغ کبھی ایک بات سوچ رہا تھا تو کبھی دوسری۔

.......☆☆☆.......

ادھر جو باقی تین بچے تھے انہوں نے ایک دوسرے سے رابطہ کیا۔ ان کو پتا چل چکا تھا کہ ان کے دو دوستوں کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا تھا اور اب وہ اس پر بحث کر رہے تھے کہ یہ کس کا کام ہو سکتا ہے۔ ان کا شک بھی وکی پر جا رہا تھا مگر دوسرے مقتول کی بیوہ کو جو دو لاکھ روپے ملے تھے اس نے انہیں چکرا کر رکھ دیا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ کسی نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ پیسے وکی نے ہی بھجوائے ہوں گے۔ سب کا دھیان اسی بات پر تھا کہ جوا کا معاملہ ہو سکتا ہے۔ ان تینوں نے آپس میں طے کیا کہ اگر پولیس ان سے رابطہ کرتی ہے تو وہ تینوں اس بات سے مکر جائیں گے کہ مقتول ان کے دوست

تھے یا وہ ان کو جانتے ہیں۔

.......☆☆☆.......

وکی تینوں کی نگرانی کر رہا تھا اور جب تینوں آپس میں ملے تو وکی بھی ہپی کے بھیس میں ان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ ایک پبلک پارک تھا جس میں کئی لوگ ہوتے ہیں۔ وہ تینوں ایک بینچ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وکی ان کے مخالف ایک بینچ پر بیٹھا ایم پی تھری کان میں لگائے گانے سننے کے بہانے ان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

وکی ان میں سے ایک کو شکار کرنے کے بارے میں سوچنے لگا اور یہی سوچ کر اس نے نینا کو فون کر کے اس پارک میں بلوایا۔ وکی یہ سوچ رہا تھا کہ ان میں سے ایک تو دوسرے شہر سے آیا ہے تو وہ یہاں کس ذریعے سے پہنچا ہے۔ ریل سے' بس سے یا اپنی کار کے ذریعے۔ وکی کے لیے یہ موقع اچھا تھا کہ وہ دوسرے شہر کے آدمی کو یہیں گھیر لے تاکہ اس کا سر درد کچھ کم ہو۔ ورنہ دوسرے شہر کے لیے نئے سرے سے پلاننگ کرنی پڑتی اسے۔

مگر وہ ان تینوں میں سب سے زیادہ توجہ لیڈر پر دے رہا تھا۔ امیر اور بڑے باپ کی بگڑی ہوئی اولاد تھا۔ جس کے پیچھے زبردست سیاسی قوت کارفرما تھی۔ اس کے جتنے اونچے تعلقات تھے اس صورت میں پولیس اس پر کوئی کیس بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مگر وکی نے اس کے لیے جو پلان کیا وہ سب سے زبردست تھا۔ وکی نے سوچا کہ اگر وہ خود بھی امیر نہ ہوتا تو کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا اور شاید اپنی بدقسمتی سمجھ کر چپ چاپ سب سہہ لیتا۔ مگر اپنی دولت کے بل پر ہی وہ خود اپنی بہن کے ریپ اور موت کا بدلہ لینے میں اب تک کامیاب رہا تھا۔

جیسے ہی نینا پارک میں داخل ہوئی تو انسپکٹر خان کی جیپ بھی دکھائی دی۔ وہ جیپ سے اتر کر ان تینوں کی طرف چلا آ رہا تھا۔ دوسری طرف سے نینا بھی وکی سے ملنے چلی آ رہی تھی۔ وکی نے خان کو دیکھا تو ایک لمحے کے لیے اپنا پلان بدل لیا اور وہاں سے اٹھ کر ہپیوں کی طرح گانا سنتے ہوئے ڈانس کے اسٹیپ کرتا ہوا دوسری طرف بڑھنے لگا۔ خان کی توجہ اس کی جانب مبذول ہوئی مگر وہ اسے ایک ہپی سمجھ کر زیادہ دھیان نہیں دیا کیونکہ اس وقت اس کی توجہ کسی اور جانب تھی۔

اونچا قد۔ چوڑا سینہ آنکھوں پر چشمہ۔ تیز قدموں سے چلتے ہوئے انسپکٹر کی شخصیت بہت شاندار لگ رہی تھی اور کئی نسوانی نظریں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

ان تینوں نے بھی خان کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ایک بڑبڑانے لگا۔ "اسے کیسے پتا چلا کہ ہم یہاں ہیں؟ شاید اس نے پتا لگا لیا ہے کہ ہم ان دونوں مرنے والوں کے دوست ہیں۔ اب کیا کریں؟"

ان کے لیڈر نے کہا۔ "نہیں۔ اسے کچھ پتا نہیں ہے۔ یہ صرف ہمیں آزمانے آ رہا ہے۔ اگر کسی نے ہمیں ان دونوں کے ساتھ دیکھا ہوگا تو صرف اس ریسٹورنٹ وغیرہ میں۔ انسپکٹر پوچھے تو کہنا کہ شاید کسی ریسٹورنٹ میں ملے ہوں تو یاد نہیں۔ ہم ان دونوں کو ذاتی طور پر نہیں جانتے۔ سمجھ گئے نا۔"

سب نے ہاں میں گردن ہلا دی۔

مگر خان تو ان کی طرف گیا ہی نہیں۔ دراصل اس وقت اس کی بیوی اور فرحین اسی پارک کے ایک گوشے میں تھیں اور وہ انہیں ہی لینے آیا تھا۔

وکی خود حیران تھا خان کو اپنے خاندان کے ساتھ دیکھ کر۔ اس نے نینا کو فون کر کے کہا کہ وہ واپس باہر چلی جائے اور جب تک وہ دوبارہ فون نہ کرے واپس نہ آئے۔

ادھر ان تینوں نے بھی جب دیکھا کہ خان اپنے گھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

والوں سے ملنے آیا ہے تو ان کی جان میں جان آئی۔

خان کے جانے کے بعد وکی دوبارہ ان کے مخالف بیٹھ گیا اور نینا کو فون کر کے اسے اپنی بینچ پر بلایا۔ جب نینا آئی تو اس نے ان تینوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ کیا وہ ان میں سے کسی کو جانتی ہے۔

نینا نے اپنا چہرہ فوراً دوسری طرف گھما لیا اور دھیرے سے کہا۔ ''ہاں ان میں سے ایک ایم این اے کا بیٹا ہے۔ میں اس کے ساتھ کئی بار جا چکی ہوں۔ اگر ابھی اس نے مجھے دیکھ لیا تو بلا لے گا۔ چلیں فوراً یہاں سے چلیں۔ بہت حرامی قسم کا انسان ہے وہ۔'' نینا اٹھ کھڑی ہوئی اور وکی کی طرف چہرہ کرتے ہوئے تینوں کی طرف پیٹھ کر لی۔

''یار تم کو اس سے نہیں ملنا ہے۔'' وکی بولا۔ ''اسے کچھ نہیں کہنا ہے۔ تم بس ان دونوں کو دیکھو جو اس کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ کیا ان میں سے کسی کو جانتی ہو۔ یا گئی ہو کبھی ان میں سے کسی کے ساتھ۔ یا کبھی ایسا ہوا ہے کہ تم تینوں کے ساتھ؟''

نینا نے بڑی مشکل سے نظریں بچا کر ان دونوں کو دیکھا اور جواب دیا۔ ''نہیں میں ان دونوں کو نہیں پہچانتی۔''

''ان میں سے ایک ہمارا اگلا شکار ہو گا۔''

نینا نے او کے کہا اور وہاں سے چلنے کو تیار ہو گئی۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایم این اے کا بیٹا اسے وہاں دیکھے۔ وکی اس کے ساتھ اٹھ گیا اور وہ دونوں دوسری جگہ جا کر بیٹھ گئے۔

بات چیت کے دوران وکی نے کہا۔ ''ہاں مجھے کل ہی پتا چلا ہے کہ وہ کسی ایم این اے کا بیٹا ہے۔ اور اسے تو میں بہت ہی خاص سبق سکھانا چاہتا ہوں۔ یوں سمجھو کہ اس کے لیے خصوصی انتظام کیا ہے میں نے۔ اس کے لیے تم کو کوئی کام نہیں کرنا ہے۔ پھر بھی پیسے تمہیں اتنے ہی ملیں گے جتنا دینے کا میں نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ بس تم نے ان دونوں کو اپنے جال میں پھنسانا ہے۔''

''ہاں، مگر جب وہ اس کے ساتھ نہیں ہوں گے تب، میں اس کے سامنے یا ان کے بیچ نہیں جاؤں گی نہیں تو وہ تینوں ایک ساتھ مجھے اپنے بنگلے پر لے جائیں گے۔''

''نینا! تم کچھ چھپا رہی ہو مجھ سے۔'' وکی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کیسے پتا کہ وہ تینوں کے ساتھ تمہیں لے جائے گا؟ اس کا مطلب ہے کہ اس نے پہلے بھی تمہارے ساتھ ایسا کیا ہے۔''

''نہیں میرے ساتھ نہیں۔ میری ایک دوست کو اپنے ساتھ لے گیا تھا بنگلے پر اور جب وہ وہاں پہنچی تو اس کے باقی تین دوست بھی وہاں موجود تھے۔ شاید یہی تھے اس کے ساتھ۔ میری دوست نے بتایا تھا کہ وہ سب نشے میں دھت تھے اور اس کی حالت خراب کر دی تھی انہوں نے۔ اس کے کہنے کے مطابق یہ سب جانوروں سے بھی زیادہ خونخوار ہیں اور ستم یہ کہ انہوں نے اسے پیسے صرف ایک ہی آدمی کے دیئے تھے۔ اسی لیے میں اس سے بچنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

وکی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تو یہ بات ہے۔ فکر مت کرو تمہاری اس دوست کا بدلہ بھی لیا جائے گا ان سے۔''

☆☆☆......

انسپکٹر خان دونوں مقتولین کے فنگر پرنٹس لے کر صاحبہ کے بیڈ روم سے ملنے والے فنگر پرنٹس سے میچ کرنے لگا۔ ان میں سے ایک مقتول کے فنگر پرنٹس بیڈ روم میں پائے گئے پرنٹس سے میچ ہو گئے۔ اب خان کا شک یقین میں بدل گیا کہ ان اموات کے پیچھے وکی کا ہی ہاتھ ہے۔ لیکن وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ آخر وکی کو ان لوگوں کا پتا کیسے چلا اور اس نے کس طرح ان دونوں کو ٹریپ کر کے مارا۔

''وکی کو تو پولیس میں ہونا چاہئے تھا۔'' انسپکٹر خان بڑبڑایا۔ ''وہ میرا کام مجھ سے بہتر انداز میں کر رہا ہے۔''

کتنی ہی دیر وہ خود سے الجھتا رہا۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ فی الحال وہ ان فنگر پرنٹس کے میچ ہونے کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا اور اپنے انداز سے تفتیش جاری رکھے گا۔

اس کا دوسرا فیصلہ یہ تھا کہ جتنی بھی جلدی ہو سکے اور کسی بھی طرح باقی لوگوں کا پتا لگانا ہو گا۔ مگر باقی کتنے لوگ تھے؟ اور کیا جو پہلا آدمی مرا تھا وہ بھی ان میں شامل تھا؟ اس رات وکی کے گھر میں کتنے افراد نے یہ گھناؤنی واردات کی تھی۔ اس کا وکی کے علاوہ کسی کو پتا نہیں تھا۔

وکی نے اس بارے میں سلطان کو بھی تفصیل نہیں بتائی تھی تو خان کس سے معلوم کرتا؟ خان نے دوسرے پہلو پر بھی غور کیا کہ ہو سکتا ہے یہ محض ایک اتفاق ہو اور انہیں کسی اور نے کسی اور معاملے میں موت کے گھاٹ اتارا ہو۔ الجھاؤ اتنا تھا کہ خان کو اپنا سر پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کے لیے بات کی جڑ تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ پھر بھی پولیس انسپکٹر کی حیثیت اسے کوشش تو کرنی ہی تھی۔

خان نے کنٹرول روم میں سلطان اور ریشماں کے موبائل اور لینڈ لائن فون کو بھی آبزرویشن پر رکھا ہوا تھا اور سختی سے ہدایت کی ہوئی تھی کہ جیسے ہی کوئی اہم بات اسے معلوم ہو تو فوراً اطلاع کی جائے۔

خان ایک مقتول کے گھر والوں سے ملا اور اس کے دوست احباب کے پتے لے کر ایک ایک سے جانچ کی مگر کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ پھر وہ دوسرے مقتول کے گھر گیا جس کی بیوہ کو دو لاکھ روپے ملے

زندگی......!

+ ۔زندگی میں وقت کی قدر کرو کیوں کہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا، ہمیں وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

+ ۔زندگی میں یاد انہیں کیا جاتا ہے جنہیں انسان بھول جائے اور جو لوگ دل کے قریب ہوتے ہیں انہیں یاد نہیں کیا جاتا۔

+ ۔زندگی میں جب کبھی تم محسوس کرو کہ تمہارے آس پاس کوئی نہیں ہے جسے تم اپنے دل کی بات کہہ سکو تو پھر تم رو لو کیونکہ جب بارش ہوتی ہے تو آسمان بالکل صاف وشفاف نظر آتا ہے بالکل اسی طرح سے تمہارے رونے سے دل کا بوجھ کم ہو جائے گا۔

+ ۔زندگی میں دوسروں کی ذات پر اعتبار کرنے سے بہتر ہے کہ تم خود اپنی ذات کو دوسروں کے لئے قابل اعتبار بناؤ۔

+ ۔زندگی میں بعض لوگ اپنی ذات سے باہر رہتے ہیں اور جو لوگ اپنی ذات کے اندر رہتے ہیں وہ لوگ زندگی میں قدم قدم پہ ٹوٹتے ہیں۔

+ ۔زندگی میں محبت ایک ایسا دریا ہے کہ اگر بارش روٹھ بھی جائے تو پانی کم نہیں ہوتا۔

+ ۔زندگی میں اپنے لئے جینا زندگی نہیں بلکہ دوسروں کے لئے جینا زندگی ہے شاید اسی کا دوسرا نام زندگی ہے۔

(مسز نعیم قادر۔ کراچی)

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے۔اور لاکھ کوشش کے باوجود بھی اس کی بیوہ یہ نہیں بتا سکی کہ اسے یہ پیسے کس نے اور کیوں بھیجے ہیں۔ خان نے اس سے ایک لاکھ روپے تفتیش کے نام پر لے لیے کہ بعد میں لوٹا دے گا۔خان نے ان نوٹوں کے نمبر جاننے کے لیے مختلف بینکوں سے رابطہ کیا مگر کہیں سے بھی کوئی امید افزا خبر نہیں ملی کہ پچھلے ایک مہینے سے اس نمبر کے نوٹ کس بینک سے نکالے گئے تھے۔حالانکہ خان سمجھ رہا تھا کہ نوٹوں کے نمبر سے بہ آسانی کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جائے گا۔اس کی مایوسی بڑھتی ہی جارہی تھی۔

اس وقت خان کو امید کی ایک کرن نظر آئی جب دوسرے مقتول کے آفس سے تفتیش کرنے پر ایک نے بتایا کہ وہ ایک ایم این اے کے بیٹے کا دوست تھا۔خان نے اس ایم این اے کا نام پوچھا اور نام سنتے ہی اس کا سر چکرانے لگا۔خان کا پیشہ ورانہ طور پر اس سے واسطہ تھا اور ایک طرح سے وہ خان کے بدخواہوں میں سرفہرست نام تھا۔

خان گھر لوٹا تو اس کی حالت دیکھ کر اس کی بیوی بھی گھبرا گئی اس نے فوراً کچھ گولیاں کھانے کو دیں اور خیریت دریافت کی تو خان نے ساری باتیں اس کے سامنے رکھ دیں۔وہ خود کو سخت بے بس اور لاچار محسوس کررہا تھا۔مسز خان نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے اپنا کام انجام دینے کے لیے آج کے دن آرام کرنے کو کہا۔

"اگر کوئی سراغ مجھے اس ایم این اے کے بیٹے تک لے گیا تب میں کچھ نہیں کر پاؤں گا۔" خان نے سوچتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔" وہ اتنے طاقتور ہیں کہ ہر حال میں اپنے بیٹے کو بے قصور ثابت کردیں گے'میں اپنی حیثیت میں ان سے نہیں جیت سکتا' کاش مجھ سے پہلے وکی اس تک پہنچ جائے'ایک پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے کہ اس ظالم ایم این اے اور ڈی ایس پی سے نمٹنا ہے تو پھر وکی کا طریقہ ہی درست ہے۔میرا فرض ہے وکی کو گرفتار کرنا۔مگر وہ ایک اچھا کام کررہا ہے تو میں اسے کیوں روکوں'جو کام میں اپنی سرکاری حیثیت میں رہ کر نہیں کرسکتا' کیونکہ مجھے جو کرنا ہے قانون کے دائرے میں رہ کر کرنا ہے'میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔مگر وکی کے ہاتھ تو آزاد ہیں اب میں اسے اپنے ہاتھ استعمال کرنے دوں یا ہتھکڑی میں جکڑ کر اسے بھی اپنی طرح بے بس کردوں؟

کاش کسی طرح وکی سے ملاقات ہوجائے۔وہ جانتا تھا کہ وکی سے ملنے پر ہی ہر گتھی سلجھے گی۔اس نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اگر ایم این اے کا بیٹا اس معاملے میں ملوث ہے تو وہ وکی کو نہیں روکے گا بلکہ کیس بھی ایم این اے کے بیٹے کے خلاف ہی بنائے گا۔قانون کو اپنے گھر کی رکھیل اور ظلم کو اپنا مشغلہ سمجھنے والے ایسے سیاستدان اور چنگیزی جیسے پولیس آفیسر کو سبق سکھانا ہی ہوگا۔

وہ وکی کی مدد کرنا چاہتا تھا۔مگر وکی اسے ملے گا کہاں؟ خان نے سلطان کو فون کیا اور ملنے کو کہا۔

دوپہر کے بعد دونوں اسی ساحل پر بیٹھے خالی ذہن سے موجوں کو دیکھ رہے تھے۔سلطان نے کبھی خان کو اتنا بے بس نہیں پایا تھا۔ساری بات سن کر سلطان بھی پریشان ہوگیا اور دونوں نے فیصلہ کیا کہ ایک بار اس ایم این اے کے بیٹے سے ملنا چاہیے۔

دونوں کو پتا تھا کہ وہ کتنا کمینہ انسان ہے۔وہ کئی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھا مگر پولیس اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی۔کیونکہ باپ اس کا ایم این اے تھا اور ڈی ایس پی چنگیزی اس کا چاچا۔پوری مشینری اسے بچانے میں لگ جاتی۔

ابھی تک خان اور سلطان اس بات سے لاعلم تھے کہ صاحبہ کی عزت لوٹنے میں وہ کتا بھی شامل تھا۔وہ لوگ صرف اس مرنے والے کے دوست کی حیثیت سے اس سے ملنا چاہتے تھے۔

اس نے صاف انکار کردیا کہ وہ مقتول کا دوست ہے۔

"انسپکٹر خان! آپ مجھ سے کئی بار الجھ چکے ہیں۔اور ہر بار الجھنے کا انجام بھی آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔لگتا ہے ڈی ایس پی چنگیزی کی ڈانٹ پھٹکار سننا اب آپ کا نشہ بنتا جارہا ہے۔جایئے قاتلوں کو تلاش کیجئے۔میرے پیچھے کیوں پڑے ہیں۔اس سے پہلے کہ میں چاچا جی کو فون لگاؤں بہتر ہے کہ آپ خود ہی چلے جائیں یہاں سے۔" وہ تکبر سے بولا۔

خان اور سلطان کو مجبوراً وہاں سے واپس آنا پڑا۔ وہ دونوں لوٹ کر ساحل پر آگئے۔

"یار ایک بار میری وکی سے ملاقات کروادو۔میں فرحین کی قسم کھاتا ہوں کہ اسے گرفتار نہیں کروں گا بلکہ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔یار میں تنگ آچکا ہوں کرپٹ پولیس افسروں اور بددیانت سیاستدانوں سے'میں تو کہتا ہوں ان سب کا صفایا کردینا چاہیے۔وکی یہ سب کرسکتا ہے'وہ مالدار ہے اور ایسے کاموں کے لیے پیسہ بہت ضروری ہے'وکی اپنی دولت کے بل پر بہت کچھ کرسکتا ہے۔اور باقی اس کی مدد کے لیے ہم دونوں تو ہیں ہی۔اگر وہ ہم سے مل جائے تو فتح ہماری ہوگی'اسے بھگا کر تم نے واقعی نیک کام کیا تھا۔میں دل سے کہہ رہا ہوں کہ تمہارا وہ اقدام بالکل درست تھا۔اسی لیے میں نے تم کو گرفتار نہیں کیا بلکہ صرف چھٹی پر بھیج دیا تھا۔مگر اب مجھ سے اور نہیں سہا جارہا۔جب دیکھو جہاں دیکھو ہر پنگے کے پیچھے چنگیزی کا ہاتھ نظر آتا ہے'اب تو تمہاری سمجھ میں بھی یہ بات آگئی ہوگی کہ جمالی ہاؤس سے سارے ثبوت وکی کے خلاف کیوں اور کیسے ملے اور کیوں چنگیزی اتنے طعنے دے رہا ہے۔وہ اپنے بھتیجے کو بچا کر ایک بے گناہ کو پھنسانا چاہتا ہے۔اور پہلے بھی کتنی ہی بار وہ اس کتے کو بچانے کے لیے ایسا کرچکا ہے۔تمہیں یہ بھی یاد ہوگا اسی کی وجہ سے ایک آدمی نے لاک اپ میں خودکشی کرلی تھی۔یہ سب روکنا ہوگا یار' مگر ہم قانونی طریقے سے کچھ نہیں کرسکتے۔اس کے لیے وکی ہی آخری امید ہے۔ہم پلاننگ کے ساتھ کام کرسکتے ہیں جس میں وکی پر کوئی آنچ نہ آئے۔تم اسے فون کرو یار۔"

سلطان نے خان کی باتوں کو غور سے سنا اور اس کی سچائی پرکھ کر وکی کو فون کرنے کے لیے تیار ہوگیا اور جیسے ہی وکی کو کال کرنے لگا تو خان نے اسے روک دیا۔

"ٹھہرو......تمہارا فون آبزرویشن پر ہے۔"

وہ دونوں کنٹرول روم پہنچے اور وکی کو گھیرنے کے لیے جتنے نمبر آبزرویشن پر تھے سب کو کلیئر کروادیا۔

ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد خان کے اشارے پر سلطان نے وکی کا وہی نمبر ڈائل کیا جس سے اس نے آخری بار سلطان کو فون کیا تھا۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟" دوسری طرف سے وکی کی آواز آئی۔

"ہاں'انسپکٹر خان تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

"نہیں' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔مجھے پولیس پر رتی برابر بھی بھروسہ نہیں ہے۔"

"میں گارنٹی لیتا ہوں کہ کچھ غلط نہیں ہوگا۔ایک بار بات کرکے تو دیکھ لیں۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ انسپکٹر خان کوئی خفیہ ریکارڈر لے آئے اور میری ساری باتیں ثبوت کے طور پر ریکارڈ کرلے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ تم بات تو کرو۔" یہ کہہ کر سلطان نے فون خان کو دیا۔

"یس انسپکٹر خان کیا بات ہے؟" وکی نے کہا۔

"مجھ سے بات کرنے کا شکریہ۔" خان بولا۔ "مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کیا جابر چنگیزی بھی تمہارے شکاروں میں شامل ہے؟ مطلب وہ بھی اس رات تمہارے گھر پر تھا یا نہیں؟ مجھے بس یہی جاننا ہے۔"

"جان کر کیا کرو گے انسپکٹر صاحب؟ اسے گرفتار کرو گے؟ مگر کتنی دیر کے لیے وہ ایم این اے کا بیٹا ہے اور اس کا چاچا تمہارا باس ہے۔"

اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔ وکی میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوست کی حیثیت سے۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ میرا یقین کرو۔"

"کیا بات کر رہے ہو انسپکٹر صاحب۔" وکی نے ہلکے سے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں ایک مفرور مجرم ہوں جسے آپ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ اور مل کر پکڑو گے نہیں؟ بھلا میں یہ کیسے مان لوں؟ ابھی بھی آپ سے بات کرتے ہوئے مجھے شک ہو رہا ہے کہ کہیں یہ بھی آپ کی کوئی چال نہ ہو، آپ سے ملنا تو دور کی بات ہے۔ میں آئندہ آپ سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔"

"سنو وکی۔ جیسے صاحبہ تمہاری بہن تھی ویسے ہی فرحین میری بہن ہے اور وہ تمہاری بہت بڑی فین ہے۔ اسے بہت اشتیاق تھا تم سے ملنے کا اور اس نے کئی بار صاحبہ اور ریشماں سے کہا بھی تھا' وہ تمہارے ساتھ اپنی تصویر بنوانا چاہتی تھی۔ میں اپنی فرحین کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں صرف ایک دوست کی حیثیت سے ملوں گا۔ مجھے تم سے کچھ بہت ہی ضروری باتیں کرنی ہیں جو فون پر نہیں کر سکتا۔" خان نے لجاجت سے کہا۔

"فرحین کون؟ کیا میں اسے جانتا ہوں؟" وکی نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ صاحبہ کی کلاس فیلو اور ریشماں کی دوست ہے۔ یاد آیا؟" خان نے جواب دیا۔

"ہاں یاد آیا۔ ریشماں نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ کوئی فرحین میرے ساتھ تصویر بنوانا چاہتی ہے۔ اوہ، تو وہ آپ کی بہن ہے؟ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں مسٹر خان کہ آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے، اگر خدانخواستہ یہ سب فرحین کے ساتھ ہوا ہوتا تو...... جو میری صاحبہ کے ساتھ ہوا؟"

"میں اسی سلسلے میں تم سے ملنا چاہتا ہوں کہ آئندہ کسی اور صاحبہ کے ساتھ ایسا نہ ہو۔ میں نے اپنی بہن کی قسم کھائی ہے اب تمہیں یقین دلانے کے لیے اور کیا کروں؟"

"ذرا سلطان کو فون دینا پلیز۔"

"ہاں وکی بولو۔" سلطان نے فون لیتے ہوئے کہا۔

"بات کیا ہے؟ فرحین کے ساتھ کچھ ہوا ہے کیا؟ کیا اس کے ساتھ بھی؟"

"نہیں...... نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مگر خان زبان کا پکا ہے اگر اس نے کہا ہے کہ ایک دوست کی طرح ملے گا تو ایسا ہی ہوگا۔ تم بے فکر ہو کر اس سے مل سکتے ہو۔"

"چلو تمہارے کہنے پر مل لیتا ہوں۔ لیکن اکیلے نہیں۔ تم بھی اس کے ساتھ آنا۔ اس سے پوچھ لو منظور ہے یا نہیں؟" وکی اب بھی بے یقینی کی کیفیت میں تھا۔

باقی آئندہ

❖

گُناگار

زرین قمر

ماں ہمیشہ اپنی اولاد کے لیے دعا گو رہتی ہے اگر وہ زندہ ہو تو اس کا دل دعائیں مانگتا ہے اور اگر مر چکی ہو تو اس کی روح دعائیں مانگتی ہے۔ وہ کبھی اپنی اولاد کی طرف سے غافل نہیں ہوتی۔

سزائے موت کے ایک قیدی کا احوال' اسے اپنی ماں کی دعا پر یقین تھا

مجھ پر قتل کا مقدمہ چل رہا تھا تو لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے' جب مجھے عدالت میں پیش کیا گیا تو میرے ذہن میں ماں کا خیال گھوم رہا تھا۔ وہ سنے گی تو کیا سوچے گی' یہ خیال آتے ہی میرا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ مجھ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ مجھے اپنے چاروں طرف روشنی کے رنگین دائرے چکراتے محسوس ہوئے' کبھی تو مجھے ان دائروں میں ماں کا چہرہ نظر آتا اور کبھی ایک معصوم بچہ' ہاتھوں میں کتابیں تھامے' اسکول جاتا دکھائی دیتا۔ عجب بے خودی کی سی کیفیت تھی' میں مقدمے کی کارروائی میں حاضر بھی تھا اور نہیں بھی تھا۔ اسی عالم میں مجھے محسوس ہوا جیسے ماں مجھ سے ناراض ہو' وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے میں خراب عادتوں والا بچہ ہوں اور اسکول سے بھاگ آیا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ مقدمے کی کیا کارروائی ہوئی' میں تو سارا وقت ماں کے تصور میں گم رہا' دائرے ناچتے رہے۔

میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے نزدیک صرف ماں کا چہرہ پایا تھا۔ وہ مجھ سے بے انتہا محبت کرتی تھی' میں چلتے چلتے لڑکھڑاتا تھا تو وہ دوڑ کر سنبھال لیتی تھی' دور و نزدیک میرے چاروں طرف وہی رہتی تھی۔ میرا باپ میرے دنیا میں آنے سے قبل ہی انتقال کر چکا تھا۔ میری ماں نے مجھے بڑے لاڈوں سے پالا تھا۔ صبح جب تک ماں میری پیشانی پر بوسہ نہیں دیتی تھی میں بستر سے نہیں اٹھتا تھا پھر وہ مجھے ناشتہ کراتی' اسکول کے لیے تیار کرتی اور میں کتابیں سنبھال کر دوستوں کے ساتھ اسکول چلا جاتا۔ اس وقت میں ایک عام سا شریر بچہ تھا' اسکول جانا' خدا سے ڈرنا اور عبادت کرنا' مجھے ماں نے سکھایا تھا۔ میری ذات کا محور صرف میری ماں تھی۔ دراصل ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا محور تھے میری ذات میری ماں کے بغیر اور ماں میرے بغیر ادھوری تھی اگر اس وقت کوئی مجھ سے کہتا کہ میں ایک دن موت کے گھر میں بیٹھا بجلی کی کرسی کا منتظر ہوں گا تو میں کبھی یقین نہ کرتا۔ کاش کسی نے مجھے سمجھایا ہوتا کہ خدا انسانوں سے محبت کرتا ہے اور اس نے انسانوں کی بھلائی کے لیے قانون بنا دیے ہیں اگر کوئی آسمانوں اور زمینوں کے یہ قانون توڑتا ہے تو خدا اسے کبھی معاف نہیں کرتا اگر مجھے یہ سب کچھ معلوم ہوتا تو مجھ سے وہ جرم کبھی سرزد نہ ہوتا' جس کی پاداش میں آج میں یہاں کٹہرے میں کھڑا ہوں۔

یکا یک میں چونک پڑا۔ میری سماعت سے جج کی آواز ٹکرائی' وہ کہہ رہا تھا۔

"جمی' ٹونی اور پنکی کو موت کی سزا دی جاتی ہے کیونکہ انہوں نے ایک معصوم لڑکی کو قتل کیا ہے۔"

میں نے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے اور پیچھے ہی کو جھکتا چلا گیا۔ بالکل اس طرح جیسے مجھے اطمینان ہو کہ مجھے سنبھالنے کے لیے ماں پیچھے موجود ہے'

WWW.PAKSOCIETY.COM

یادوں کے رنگین دائرے مزید تیزی سے چکرانے لگے۔ اس بار شاید ان دائروں کے ساتھ میں بھی جھوم رہا تھا' میری ماں کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی شاید وہ مگ تھا جس سے میں بچپن میں دودھ پیا کرتا تھا۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی' میں اسے پکار رہا تھا لیکن وہ میری طرف متوجہ نہیں تھی' اچانک میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

"جم...... جم...... جم......" شاید جج نے میرا نام پکارا تھا' میرا خیال ہے اپنا نام سن کر میں کھڑا بھی ہوا تھا اور شاید خوش بھی ہوا تھا کہ میری ماں اس وقت وہاں موجود نہیں ورنہ میری حالت دیکھ کر نہ جانے اس کے دل پر کیا گزرتی؟

مجھے یاد نہیں کہ مجھے عدالت سے کب واپس لایا گیا۔ میں تو اندھیروں کے درمیان چکراتے' لال' نیلے اور پیلے دائروں کی دنیا میں پہنچ گیا تھا جہاں میری ماں ایک کرسی پر بیٹھی تھی' اسی کرسی پر جس پر بیٹھ کر وہ مجھے لوری سنایا کرتی تھی اور اب بھی وہ لوری سنا رہی تھی' میں قسم کھا سکتا ہوں کہ وہ واقعی گا رہی تھی۔

میرا یہ حال تین روز تک رہا' میں پاگل سا ہو گیا تھا۔ میں نے کئی بار دعا مانگنی چاہی تھی لیکن میرے ہاتھوں اور الفاظ نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سامنے کوئی راستہ نہ ہو اور جہاں خدا ہے وہاں تک میری رسائی ممکن نہ ہو' اسے پکارنے کے لیے میری آواز بھی میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی پھر مجھے ڈیتھ ہاؤس بھیج دیا گیا جہاں میں نے سونا چاہا تو مجھے نیند نہیں آئی کیونکہ ان چمکتے رنگین دائروں میں میری ماں اپنے زانو پر میرا سر رکھے بیٹھی تھی۔ میرے ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دبے ہوئے تھے اور وہ دعا مانگ رہی تھی۔ وہی دعا جو وہ مجھے اس وقت سے سنا رہی تھی جب میں چھوٹا سا تھا اور سونے کے لیے بستر پر لیٹا کرتا تھا پھر اچانک ہی یہ منظر میرے ذہن کے پردے سے غائب ہو گیا۔ میں مایوس ہو گیا' یہ بھی ایک خواب تھا سراب تھا' حقیقت میں وہاں کچھ بھی نہیں تھا' بس میں تھا اور کال کوٹھڑی کی کاٹ کھانے والی بوجھل تنہائی تھی۔

میں نے کئی بار روشنیوں کے ان دائروں کو توڑنا چاہا' ان کے پار جانا چاہا جہاں میری ماں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی اور شاید رو بھی رہی تھی اس نے وہی کپڑے رکھے تھے جو مجھے خدا حافظ کہتے وقت پہنے ہوئے تھے' میں جانتا ہوں کہ وہ میرے متعلق پڑھ رہی تھی کہ میں قتل کے الزام میں پکڑا گیا ہوں' مجھے محسوس ہوا جیسے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکوں گا' میں خوف زدہ ہو گیا اور میرے حلق سے بھنچی بھنچی سی چیخ نکل گئی۔

گارڈ شاید میری چیخ سن کر ہی قریب آیا تھا اور اس نے مجھے خاموش رہنے کے لیے کہا تھا لیکن میں خود اپنے بس میں نہیں تھا' مجھ پر چیخوں کا دورہ سا پڑ گیا تھا۔ تب شاید انہوں نے کوئی انجکشن لگا کر گویا میرے ہونٹوں پر ہی نہیں میرے حواس پر بھی مہر سکوت لگا دی تھی اور میں نہ جانے کب جاگنے کے لیے سو گیا تھا۔

میرے حواس بیدار ہوئے تو شعوری حالت نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میں ماں کے لیے کیا کر سکتا ہوں جس سے اس کی پریشانی کم ہو جائے' میں نے گارڈ سے ایک قلم اور کاغذ مانگا جو اس نے مجھے فراہم کر دیا۔

"کیا تم ایک ایسے آدمی کے ساتھ کچھ ہمدردی کر سکتے ہو جو عنقریب مرنے والا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا شاید میری حالت دیکھ کر اس کے دل میں میرے لیے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔

"میں جب تک زندہ ہوں تم سے ایک خط روزانہ پوسٹ کرانا چاہتا ہوں۔"

"کس کے لیے؟" اس نے پوچھا۔

"اپنی ماں کے لیے۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ اچھا' ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔

میں نے سوچا یہ گارڈ جتنے ظالم نظر آتے ہیں حقیقت میں ایسے نہیں ہوتے۔

"لیکن میرے پاس رقم نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کی فکر مت کرو' میں لفافوں پر ٹکٹ لگانے کا انتظام کر لوں گا۔" اس نے کہا۔

"میری سزائے موت میں ابھی دس دن باقی ہیں' میں ان دس دنوں میں صبح اور شام ایک ایک خط لکھوں گا۔"

وہ اثبات میں سر ہلا کر سلاخ دار دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

ماں کو پہلا خط لکھنا بہت مشکل تھا' میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں' مجھے یقین تھا کہ اس وقت تک وہ خود بھی جان ہی چکی ہوگی لیکن اسے یقین نہیں آیا ہوگا کہ اس کا جمی قاتل بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ لڑکی کو میں نے ہلاک نہیں کیا' اس لیے مجھے بہت کم سزا ہوئی ہے۔

"مجھے یقین ہے ماں! تم اب تک جان چکی ہوگی کہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں' ہو سکتا ہے دوسروں کی طرح تم بھی مجھ سے بدظن ہو گئی ہو لیکن میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا لیکن تم قانون کو بھی قصوروار نہیں کہہ سکتیں کیونکہ اپنی مصیبتوں کا ذمے دار میں خود ہوں اور خوش قسمت ہوں کہ دس روز میں چھوٹ جاؤں گا۔ تم مجھے دیکھنے آ سکتی ہو لیکن مجھ سے آ کر مختلف سوالات مت پوچھنا کیونکہ میں جواب نہیں دے سکوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گی کیونکہ تم بہت اچھی اور معاف کر دینے والی ہو' میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں تمہارے متعلق کیا سوچتا ہوں مجھے تمہاری وہ تمام باتیں یاد آ رہی ہیں جو تم نے اس وقت کہی تھیں جب میں بچہ تھا۔ اب میں سمجھ سکتا ہوں کہ خدا کے بنائے ہوئے قانون کو توڑنا' انسان کے لیے کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ جب میں یہاں آیا تو پہلی رات کے اندھیرے میں تمہیں دیکھا' مجھے محسوس ہوا کہ تم میرے قریب ہو لیکن ناراض ہو اور مجھ سے بات نہیں کر رہی ہو۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا پھر ایک اور رات کو تم میرے قریب تھیں' میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور تم مجھے وہی دعا سنا رہی تھیں جو بچپن میں سنایا کرتی تھیں' میں نے سوچا میں بھی رات کے اندھیرے میں بیٹھ کر خدا سے یہی دعا مانگوں گا تو وہ میری بات ضرور سنے گا۔ اب میں وہی دعا مانگتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ خدا ایک نہ ایک دن یہاں سے ضرور رہائی دلوائے گا اور میں تم سے آ کر ملوں گا۔"

میں ماں کو خط لکھتا رہا یہاں تک کہ میں نے اس کو آخری خط لکھا تو میں نے محسوس کیا کہ شاید ماں میرے خطوط پڑھ کر بور ہوتی ہو۔ پتا نہیں ماں بدنامی کے ڈر سے وہ محلہ ہی چھوڑ گئی ہو اور اس کو میرے خطوط نہ ملتے ہوں' پھر میں ہمت کر کے ماں کو آخری خط لکھنے بیٹھ گیا۔

"پیاری ماں!

میں یہ خط بستر پر لیٹ کر لکھ رہا ہوں' سنا ہے کہ میری زندگی شاید صرف چند گھنٹے باقی رہ گئی ہے۔ اس لیے میں اپنے جسم کی آخری توانائی بھی تمہیں خط لکھنے میں صرف کر دینا چاہتا ہوں میں خوش ہوں کہ تم نے مجھے بتایا تھا کہ میں وہاں اس دنیا میں ہونے والی

WWW.PAKSOCIETY.COM

غلطیوں کا ازالہ کرسکتا ہوں' جہاں مجھے اب جانا ہے' مرنا زندہ رہنے سے زیادہ آسان ہے۔ ماں! میں تھک گیا ہوں میں نے خوش رہنے کی بہت کوشش کی اب میں اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کرنے والا ہوں' تو حقیقت ضرور بتاؤں گا۔ ماں! میں قاتل نہیں ہوں' میں نے قتل نہیں کیا اور نہ ہی دانستہ' اس قتل میں ٹونی اور پنکی کی مدد کی تھی' ان دونوں نے پکنک کا پروگرام بنایا تھا اور مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی۔ راستے میں جولیا کا گھر تھا' ٹونی نے مجھ سے کہا کہ میں جا کر جولی کو بھی لے آؤں اور میں جولیا کو بلا لایا' ہم لوگ پکنک منانے اس باغ میں چلے گئے تھوڑی دیر بعد ٹونی نے مجھے کچھ پیسے دیے اور کہا کہ کھانے کے لیے کچھ لے آؤں۔ میں کھانے کا سامان لے کر واپس آیا تو ٹونی اور پنکی غائب تھے اور جولیا زخمی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی' میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور اسے پانی پلانے کی کوشش کی جو بے سود ثابت ہوئی' مرنے سے پہلے اس کے لبوں پر ایک ادھورا نام آیا تھا جسے میں سمجھ نہ سکا' تب باغ کا مالی وہاں پہنچ گیا اور مجھے جولی کی لاش کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا۔ ماں! تمہیں پتا ہے جولی نے مرتے مرتے کیا سرگوشی کی تھی؟ اس کے لبوں سے نکلا تھا ''ٹو...... ٹو...... آہ!'' اور بس' ماں تم سمجھ گئی ہونا کہ میں نے جولی کو قتل نہیں کیا تھا۔ میں چند گھنٹوں کا مہمان ہوں' میں غلط نہیں کہہ رہا' کوئی مانے یا نہ مانے تم یہ ضرور مان لو ماں کہ میں قاتل نہیں ہوں' خدا حافظ...... پیاری ماں۔''

گارڈ میرے دروازے پر آیا تو وہ کھانا لایا تھا۔

''میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''کھانا لے جاؤ اور ہاں' یہ خط بھی لے جاؤ۔ میں صرف کافی پیوں گا اور اس کے بعد آرام سے لیٹنا پسند کروں گا پھر کچھ سوچوں گا۔''

''کیا تمہیں پادری کی ضرورت ہے؟'' اس نے خط لیتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں......'' میں نے کہا۔ ''مجھے ضرورت نہیں' میری ماں نے مجھے بتایا تھا کہ خدا ہمارے ہر طرف موجود ہے اور جب خدا میرے اتنے نزدیک ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ کوئی انسان میری کوئی مدد کرسکے گا۔''

وہ چلا گیا میں اندھیرے میں لیٹا رہا مدہوش سا' آج پھر کئی دن بعد وہ رنگین دائرے میرے چاروں طرف ناچ رہے تھے۔ میں اپنے بچپن کی یادوں میں کھو گیا۔ میں نے چمک دار رنگین دائروں میں جھانکا' پہاڑی کی چوٹی پر ایک گھر بنا دکھائی دیا جس کے نیچے سمندر موجزن تھا اور ماں اوپر گھر کے پاس کھڑی تھی' وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کیے مجھے ڈھونڈ رہی تھی۔ اسی طرح جیسے بچپن میں ڈھونڈتی تھی یوں لگا جیسے میں اپنا ہاتھ ہلاؤں گا تو وہ مجھے دیکھ لے گی لیکن میں جانتا تھا کہ میں اس وقت کال کوٹھڑی میں پڑا ہوں اور موت کا منتظر ہوں' میں یہاں رہ کر جو کچھ کرسکتا تھا' کرچکا تھا لیکن کیا ماں نے میری ہر بات پر یقین کرلیا ہوگا؟ میں ان دس دنوں میں مسلسل انتظار کرتا رہا لیکن ماں نے میرے کسی خط کا جواب نہیں دیا حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ماں مجھ سے محبت کرتی ہے اور میری مدد کرنا چاہتی ہے' وہ مجھے واپس بلانا چاہتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مائیں خدا سے ہمیشہ اپنے بچوں کی بھلائی کی دعائیں ہی مانگتی ہیں۔

میں رات بھر اسی طرح لیٹا رہا اور سوچتا رہا پھر جب صبح کی سپیدی نمودار ہوئی تو میں نے ٹھنڈی کافی پی لی جو شاید رات کو کسی وقت گارڈ رکھ گیا تھا۔

میری کھڑکی کے باہر جو دیوار تھی وہاں سے میں نے کئی بار سورج کو دیکھا تھا لیکن اس صبح مجھے یوں لگا جیسے دیوار کے سائے میں موت چھپی ہوئی ہو جو آہستہ آہستہ میرے قریب آتی جارہی ہے۔ مجھے گارڈ کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ پہلے ٹونی کو لے گیا پھر پنکی کو لے گیا' اس کے بعد وہ مجھے لینے آیا' مجھے ایک ہال میں پہنچا دیا گیا' میں اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو پارہا تھا' ہم ایک دروازے سے گزرے تو میں نے خود کو وارڈن کے دفتر میں پایا۔ وہاں بہت سے آدمی موجود تھے لیکن وہ وردی میں نہیں تھے۔

''جم ہالوئین حاضر ہے جناب۔'' وارڈن نے کہا۔

میں کسی نہ کسی طرح چلتا ہوا' ڈیسک کے قریب پہنچ گیا اور اس کے سہارے کھڑا ہوگیا' میرے پیچھے کسی نے کرسی رکھ دی اور میں اس پر ڈھیر ہوگیا۔

''جم ہالوئین......'' یہ گورنر کی آواز تھی۔ ''میں نے تمہارے وہ خطوط پڑھے جو تم اپنی ماں کو لکھتے رہے ہو' ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس نوجوان کے خیالات اتنے اچھے ہوں وہ کسی الیکٹرک چیئر کے لیے ہرگز موزوں نہیں ہے لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری سزائے موت معاف کردی جائے۔''

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں سن کر رونے لگا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو موت کے لیے تیار کرلیا تھا لیکن زندگی میرے مقدر میں تھی' یہ خدا کی طرف سے ایک حسین تحفہ تھا۔ میں آئندہ کیسی زندگی گزاروں گا' یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ یہ سب کچھ ماں کی دعاؤں کا نتیجہ تھا جس کا دل خدا نے صرف محبت کرنے کے لیے بنایا ہے۔

میں اس ہال سے باہر آیا تو اس گارڈ کو ایک طرف کھڑے دیکھا' جس نے میری مدد کی تھی' جو میرے خط میری ماں تک پہنچایا کرتا تھا۔ اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری تھا میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ میرا سینہ تشکر کے احساس سے لبریز تھا' میں نے گارڈ کا شکریہ ادا کیا تو وہ بے حد خوش دکھائی دے رہا تھا لیکن وہ مجھ سے کچھ کہنے کے لیے بے چین تھا۔

''میں اپنی ماں کے پاس جارہا ہوں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' گارڈ کھنکارتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری ماں......''

میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔

''اس کا تو اسی روز انتقال ہوگیا تھا جس دن تم گرفتار ہوئے تھے......'' گارڈ نے نگاہیں چراتے ہوئے دھیمی آواز میں کہہ دیا۔

''کیا......؟'' میری آنکھوں کے آگے نیلے پیلے دائرے رقص کرنے لگے۔ میرا ذہن ایک بار پھر اندھیروں میں ڈوبتا جارہا تھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''میں نے یہ بات تمہیں پہلے اس لیے نہیں بتائی تھی کہ تم کال کوٹھڑی میں رہ کر پریشان نہ ہوجاؤ۔ اس لیے تمہارا ہر خط تم سے لے لیا کرتا تھا اور پڑھ کر محفوظ کرلیتا تھا' پھر میں نے وہ تمام خطوط جیلر کے حوالے کردیئے' جس نے انہیں گورنر کو بھیج دیا تھا۔''

نہ جانے وہ کیا کیا کہتا رہا لیکن میرا ذہن خالی خالی سا تھا۔ میں وہیں فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا' میری آنکھیں بہہ نکلی تھیں۔ میرے آنسو فرش پر گر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ ماں ہمیشہ اپنی اولاد کے لیے دعا گو رہتی ہے' اگر وہ زندہ ہو تو اس کا دل دعائیں مانگتا ہے اور اگر مر چکی ہو تو اس کی روح دعائیں مانگتی ہے' وہ کبھی اپنی اولاد کی طرف سے غافل نہیں ہوتی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

تیسرا گاہک

احمد صغیر احمد

بعض اوقات کسی گناہ کا احساس انسان کے لیے اذیت بن جاتا ہے اور پھر مرنے کے بعد بھی اس کی روح اس احساس گناہ کے تحت تڑپتی رہتی ہے۔
ایک ایسی ہی بے چین روح کی کہانی' وہ اپنے گناہ کے ازالہ کے لیے کسی نیک آدمی کی تلاش میں تھی۔

مغربی ادب سے انتخاب' تراجم پڑھنے والے قارئین کے لیے بطور خاص

پیٹروڈ ایک سلیقہ پسند آدمی تھا اسی لیے جب وہ مرا تو اس کے وکلاء کو اس کی جائداد کے تصفیے کے سلسلے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی البتہ اس ضمن میں وہ مہر بند لفافہ ضرور ان کے لیے حیرت کا باعث بنا جو انہیں پیٹر کی رائٹنگ ٹیبل پر ملا تھا۔ اس پر لکھا تھا۔ ''تحقیقاتی سوسائٹیوں سے معذرت کے ساتھ میں نے اس کے اندر بند تحریر کو پہلے کبھی کسی کو نہیں دکھایا لیکن اب جبکہ میں مر چکا ہوں اسے کوئی بھی پڑھ سکتا ہے۔ اس میں جو واقعہ درج ہے وہ بالکل سچا ہے۔

لفافے میں بند مسودے پر پیٹر کی موت سے تین سال پہلے کی تاریخ پڑی ہوئی تھی اس میں لکھا تھا۔

یہ میری جوانی کے دنوں کا ایک تجربہ ہے۔ میں اسے کافی عرصے سے قلم بند کرنے کے لیے بے چین تھا۔ میں نے یہاں جو کچھ لکھا ہے' میں اس کے لیے کسی قسم کی وضاحت نہیں کروں گا۔ بس یہ واقعہ جس طرح پیش آیا تھا میں نے اسی طرح اسے لکھ ڈالا ہے۔

''وہ ایک کہر زدہ شام تھی۔ سارا دن بغیر کسی کام کے گزرا تھا۔ اس لیے اکتاہٹ کا شکار تھا۔ آفس سے نکل کر میں ٹہلتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں سڑک کے کنارے موجود ایک دکان کی روشن کھڑکی نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی تو میں ٹھٹک گیا۔ میں نے دکان کے بورڈ پر ''نوادرات'' کے الفاظ لکھے ہوئے دیکھے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ میرے ایک دوست کی شادی ہونے والی ہے جو پرانی اشیاء کا رسیا ہے تحفہ تو مجھے دینا ہی تھا۔ میں نے سوچا دیکھ لوں شاید یہاں سے کوئی مناسب چیز مل جائے۔ میں نے دکان کے دروازے کو کھولا یہ دروازہ ان دروازوں میں سے تھا جن کے کھلنے پر متعدد گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں۔ اندر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ یہ دکان ایک بہت وسیع قطعہ زمین کو گھیرے ہوئے ہے یہ ایک بہت بڑا ہال تھا اور اس کے اندر قدیم اشیاء اور نوادرات کا خاصا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ یہاں' پر پرانے اسلحے زرہ بکتریں' پلیٹیں' دھندلائے ہوئے شیشے' جھاڑ فانوس' شطرنج کی بساطیں اور ہر دور اور ہر سائز کا فرنیچر وغیرہ بھرا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ تمام اشیاء پرانی تھیں لیکن دکان میں کسی قسم کی افراتفری یا گندگی موجود نہ تھی جو کہ اس نوع کی دکانوں میں اکثر دیکھی جاتی تھی۔ یہ کمرا حبس زدہ بھی نہ تھا بلکہ یہاں اجلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک جانب آتش دان میں آگ بھی دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں اس دکان کا ماحول نہایت خوشگوار تھا چونکہ میں باہر کی سرد فضا سے اندر آیا تھا مجھے یہاں کی گرم فضا بے حد فرحت بخش لگی۔

جب میں اندر داخل ہوا تو میں نے ایک عورت اور ایک لڑکی کو آرام کرسیوں سے اٹھتے دیکھا۔ دونوں کے نقوش میں بڑی حد تک مماثلت تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ دونوں بہنیں ہیں۔ یہ دونوں عمدہ لباس میں تھیں...... ان کے چہرے تروتازہ تھے۔ عام طور سے ایسی دکانوں میں گاہکوں کو اٹینڈ کرنے والے چہرے اس طرح کے نہیں ہوتے۔ میں نے ان دونوں کو' دل ہی دل میں ایسی دکان کو اس قدر صاف ستھرا رکھنے پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے سلام کیا۔ ان کے کھلے چہروں اور ہونٹوں کی مسکراہٹ نے مجھ پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ میں نے خود کو دوستانہ فضا میں محسوس کیا۔ ایک بات البتہ میں نے نوٹ کی۔ دونوں عورتیں نہ صرف بہت اچھی طرح پیش آ رہی تھیں بلکہ دکان کی اشیاء دکھانے میں بھی خاصی گرمجوشی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ تاہم میں نے محسوس کیا کہ وہ اس طرف سے قطعی فکر مند نہیں کہ میں کچھ خریدوں گا بھی یا نہیں۔

میں نے بالآخر ایک قدیم پلیٹ پسند کر لی۔ اس کے دام بھی بے حد مناسب تھے۔ میری جیب میں اس وقت کیش کچھ کم تھا لہٰذا میں نے ان سے پوچھا۔ کیا وہ چیک لینا پسند کریں گی؟

''کیوں نہیں۔'' بڑی والی لڑکی نے پھرتی سے میز پر رکھا قلم اٹھا کر مجھے دے دیا۔

''چیک کارنر کیوریو شاپ کے نام سے بنایئے گا۔'' اس نے کہا۔

باہر خاصی سردی تھی۔ دکان سے نکلتے وقت میں خاصا بددل سا ہوا۔ دراصل اندر کی فضا سے نکلنے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''گڈ ایوننگ سر۔'' جاتے وقت انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''جب بھی جی چاہے ضرور تشریف لائیں۔''

بڑی لڑکی کی نقرئی آواز دروازہ بند ہونے کے بعد بھی میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے ان لڑکیوں کی شکل میں دو نئے دوست بنائے ہوں۔

میرا خیال ہے کہ یہ شاید کوئی ہفتے بھر بعد کی بات ہے اس روز برف باری ہو رہی تھی۔ حسب معمول میں آفس سے کوئی پانچ بجے شام کو اٹھا تھا۔ میرے سر اور چہرے پر برف کے سپید گالے الجھے ہوئے تھے۔ چلتے چلتے اچانک خیال آیا کہ یہ موسم نہایت موزوں ہے۔ آج کیوں نہ میں اسی نوادر کی دکان میں تھوڑا وقت گزاروں۔ پھر میں نے راستے میں تھوڑی تبدیلی کی اور اسی سڑک پر آ گیا جس کے موڑ پر وہ دکان واقع تھی۔

مجھے اس وقت سخت مایوسی ہوئی جب میں نے دکان کو بند پایا۔ دروازے پر' دکان بند ہے' کا بورڈ لٹکا ہوا تھا۔ اور وہ جگہ ایک خوب صورت بند آنکھ کی طرح لگ رہی تھی۔

اس وقت سرد ہوا کے ایک تیز جھونکے سے میرا پورا بدن لرز اٹھا' دکان کے گرم ماحول کو یاد کر کے میری جھنجلاہٹ اس قدر بڑھی کہ میں نے بچوں کی طرح دکان کے بند دروازے کے ہینڈل کو پکڑ لیا اور پھر یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ مقفل ہوگا۔ میں نے اسے جھٹکا دیا پھر میں حیرت زدہ سا ہو گیا کیونکہ دروازہ کھل گیا تھا۔ میں نے دیکھا میرے سامنے ایک بہت ہی لاغر بوڑھا آدمی کھڑا ہوا ہے۔

''آیئے جناب اندر آ جائیں۔'' ایک نرم لیکن قدرے مرتعش سی آواز میں اس مختصر سے بوڑھے آدمی نے مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔

اندر کے بدلے ہوئے ماحول کو الفاظ میں تو بتانا آسان نہیں کیونکہ وہی ماحول جو پہلے میں نے جگمگاتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیکھا تھا۔ چند موم بتیوں کی ملگجی روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس پہلے اور مدھم روشنی میں وہاں رکھا فرنیچر، دیوار پر عجیب عجیب سی پرچھائیاں پیدا کیے ہوئے تھا۔ جو آہستہ آہستہ تھرک رہی تھیں۔

آتش دان میں آگ بھی نہیں جل رہی تھی۔ البتہ وہاں چند دہکتے انگارے اس بات کی نشاندہی کررہے تھے کہ شاید کچھ دیر پہلے اس میں زندگی ضرور رہی ہوگی۔ زندگی کے اور کوئی دوسرے آثار وہاں نہ تھے۔ یہاں کچھ ایسی بلا کی سردی تھی کہ یہاں سے بہتر باہر کا ماحول کہا جاسکتا تھا۔ یہاں آج اسی قدر تکلیف دہ ماحول تھا جس قدر پہلے دن خوش گوار تھا۔ پھر اس سے قبل کہ میں گھبرا کر وہاں سے باہر نکلنے کا فیصلہ کرتا، فضا میں کچھ روشنیاں سی ابھرنے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ بوڑھا آدمی ادھر ادھر رکھی موم بتیوں کو روشن کررہا ہے۔

تب ہی مجھے ضعیف آدمی کی آواز سنائی دی۔

"کیوں جناب! میں آپ کو کچھ دکھاؤں؟" اس کے ہاتھ میں ایک شمع دان دبا ہوا تھا۔ میں اس کی روشنی میں بوڑھے کا چہرہ اب زیادہ بہتر انداز سے دیکھ سکتا تھا۔ یہ بڑا ہی عجیب چہرہ تھا۔ پرچھائیں جیسا، اس پر کچھ ایسی تھکاوٹ ابھری ہوئی تھی جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ تھکاوٹ اور اداسی، گہرے گڑھوں میں دھنسی ہوئی اس کی آنکھیں بجھی ہوئی آگ کا سماں پیش کررہی تھیں۔ اس کا نحیف جسم قدرے جھکی ہوئی کمان کا منظر پیش کررہا تھا۔ راکھ اور خاک کے الفاظ بار بار میرے ذہن میں ابھر اور ڈوب رہے تھے۔

پہلی بار جب میں اس دکان میں آیا تھا تو یہاں کی صفائی دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی لیکن آج معاملہ اور تھا۔ لگتا تھا اس بوڑھے آدمی کے اپنے وجود ہی کی طرح دکان بھی خاک اور دھول سے اٹ گئی ہو۔ بڑی ہی افراتفری یہاں موجود تھی۔

ان عورتوں نے بھی کیا عجیب ملازم رکھا ہے۔ یا ہوسکتا ہے اس کی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے خیراتی نکتہ نظر سے اسے رکھ لیا ہو۔"

"کیوں جناب؟ کیا چیز پسند کریں گے؟"

بوڑھے آدمی نے دہرایا۔ اس کی آواز بھی زیادہ بلند نہ تھی۔ تاہم اس میں ایک التجائی انداز ضرور موجود تھا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرتکز تھیں۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ یہاں سے نکل بھاگوں لیکن اس ضعیف آدمی کی حالت اور اس کے لہجے کا کرب ایسا تھا کہ میں رکا رہا۔ میں نے کہا۔

"شکریہ میں خود دیکھ لیتا ہوں۔" پھر میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بوڑھا میرے پیچھے پیچھے ہی متحرک ہے شمع دان بلند کیے۔ "آج تو بہت سردی ہے۔" میں نے کوٹ کو مزید لپیٹتے ہوئے کہا۔

"سردی؟ اوہ ہاں سردی تو ہے۔" بوڑھے نے جواباً کہا۔

میں نے سوچا نہ جانے یہ ضعیف آدمی کب سے مصیبت میں ہے؟ ایک چوکور پلنگ پر نگاہ ڈالتے ہوئے میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

"یہ کام کب سے کررہے ہو؟"

"برسوں سے......" بوڑھے نے ہلکی آواز میں کہا یہ ایک سرسراتی ہوئی آواز تھی۔ سسکاری جیسی پھر میں ایک طرف متوجہ ہوا تو وہ بوڑھا کمرے کے ایک اور طرف چل دیا۔

"یہ دیکھیں، یہ ایک عمدہ چیز ہے۔" بوڑھے نے ایک چھوٹا سا بھدا مینڈک اٹھاتے ہوئے کہا۔ یہ شے شیلف پر موجود بہت سی اور متفرق اشیا کے ساتھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

پڑی ہوئی تھی۔ یہ مینڈک کسی پتھر کا بنا ہوا تھا غالباً جیڈ نامی پتھر کا۔ اس نے میری توجہ اپنی طرف کرلی۔ میں نے اس سنگی مینڈک کو بوڑھے کے ہاتھ سے لے لیا۔ میرے خدایا یہ پتھریلا مینڈک یخ ہورہا تھا۔

"خوب" میں نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کتنے کا ہے؟"

"صرف آدھے کراؤن کا۔" بوڑھے آدمی نے سرگوشی کی، وہ میرے چہرے کو دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔ شاید یہ چاہتا ہے کہ میں اسے خرید لوں؟ میں نے سوچا۔

"صرف آدھے کراؤن کا؟ ٹھیک ہے میں اسے لے لیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "پیک کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں اسے یونہی جیب میں ڈال لیتا ہوں۔"

رقم دیتے ہوئے میں نے جان بوجھ کر بوڑھے کے ہاتھ کو تھوڑا سا چھوا اور سناٹے میں آگیا۔ بلاشبہ وہ بے حد سرد ہورہا تھا۔ بلکہ پتھر کی طرح سرد مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ اب اس کی عمر اس سردی میں رکنے کی نہ تھی۔ مجھے ان عورتوں پر بھی حیرت ہوئی کہ وہ لوگ اس بے چارے کو ابھی تک کام کرنے پر مجبور کیے ہوئے ہیں۔

"گڈ نائٹ۔" میں نے چلتے ہوئے کہا۔

"گڈ نائٹ، شکریہ جناب۔" ضعیف آدمی نے آہستہ آواز میں جواب دیا پھر اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرلیا۔

میں نے مڑ کر دروازے کی سمت دیکھا، اس کا ہیولا عقب سے آنے والی موم بتی کی روشنیوں میں کسی سیاہ پرچھائیں کی طرح لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دروازے کے شیشے سے چپکی ہوئی میری پشت کو دیکھے جارہی تھیں۔

⌘......☯......⌘

بستر پر دراز ہونے کے بعد بھی نہ جانے کیوں میں جلد سو نہ سکا۔ اس بوڑھے آدمی کا چہرہ رہ رہ کر میرے ذہن میں ابھر کر ڈوب رہا تھا۔ اس کی حلقوں میں دھنسی آنکھیں کسی مردہ سیارے کی مانند مجھے گھورے جارہی تھیں...... حقیقت یہ ہے کہ میں اس شخص کو دیکھ کر بہت ڈسٹرب ہوگیا تھا۔ سونے کے بعد بھی وہ مجھے خواب میں دکھائی دیتا رہا۔ دکان کی وسیع فضا میں چکراتا ہوا۔

⌘......☯......⌘

دوسرے دن ایک ضروری کام کے باعث مجھے لندن سے باہر جانا پڑا۔ کام کچھ ایسا تھا کہ کارنر کیوریو شاپ کا خیال میرے ذہن سے نکل گیا۔ کیونکہ میرے والد اچانک بیمار ہوگئے تھے۔ بہرحال جونہی وہ ذرا سنبھلے میں دوبارہ لندن میں اسی جگہ آگیا جہاں میں پہلے قیام پزیر تھا۔ اس سلسلے میں، میرے جو اخراجات ہوچکے تھے اب وہی پریشانی کا باعث بن گئے تھے۔ اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر میں نے سوچنا شروع کیا کہ موجودہ صورت حال میں، اگلی سہ ماہی کا کرایہ ادا کرنا میرے بس میں نہ ہوگا۔ میں اسی الجھن میں پھنسا ہوا تھا کہ اچانک میرا ایک دوست میرے ہاں آگیا۔ اس کی آمد بروقت بھی تھی اور ساتھ میں تعجب خیز بھی کیونکہ اتفاق سے لندن میں یہی ایک شخص ایسا تھا جسے میں اپنا پرانا دوست کہہ سکتا تھا۔ میرا دوست لندن کی ایک ایسی فرم میں ملازم تھا جو فائن آرٹ کی اشیاء کی خرید وفروخت کا کام کرتی تھی۔

میرے اور اس کے درمیان کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی۔ وقفے کے دوران وہ ماچس کی تلاش میں اٹھا۔ اب وہ میری پشت پر تھا، مجھے ماچس کی تیلی کی آواز سنائی دی۔ دفعتاً اس کی پائپ کے ساتھ کش لگانے والی

آوازیں رک گئیں اوران کی جگہ ایک حیرت میں ڈوبی آواز ابھری۔

"اوہ...... میرے خدا......" وہ ذرا زور سے بولا۔ "یہ تمہیں کہاں سے ملا؟" میں نے اپنا سر ادھر گھماتے ہوئے دیکھا کہ وہ وہی مینڈک ہاتھوں میں لیے کھڑا ہے جسے میں نے نوادرات کی دکان سے خریدا تھا۔ میں نے اسے مینٹل پیس پر رکھ دیا تھا اور بھول گیا تھا۔

"اس نے اس مینڈک کو گیس کی روشنی کے قریب لے جا کر ایک محدب شیشے سے اچھی طرح دیکھا۔ میں نے محسوس کیا جیسے ہیجان کے باعث اس کے ہاتھ کپکپانے لگے ہوں۔

"یہ تمہیں ملا کہاں سے؟" اس نے دہرایا۔ "تمہیں کچھ پتا بھی ہے کہ یہ کیا شے ہے؟"

میں نے مختصراً اسے اس کی خریداری کا قصہ کہہ سنایا اور بتایا کہ اسے میں نے صرف اخلاقاً خرید لیا تھا کیونکہ میں بوڑھے کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"آدھے کراؤن میں؟ میرے دوست واقعی اسے کہتے ہیں تقدیر۔ میں تمہیں بتاؤں اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو یہ پتھر کا مینڈک ہسپانسل کے دور کا ہے اور اگر یہ اسی دور کا ہے تو اس کی حیثیت منفرد ہوگی۔" اس کے ان الفاظ سے میں کچھ زیادہ باتیں سمجھ نہیں سکا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ آدھے کراؤن میں مجھے یہ خاصا سستا مل گیا ہے؟"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟" میرے دوست نے میری جہالت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارا تو مقدر کھل گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "اچھا تم ایسا کرو کہ اس کی فروخت کا معاملہ میرے ہاتھ میں دے دو۔ اسے میں اپنی فرم کے ذریعے فروخت کراؤں گا۔ اگلے منگل کو سیل ہو رہی ہے امید ہے ہم اسے اس میں نکال لیں گے۔"

ظاہر ہے کہ مجھے اس پر بھروسہ تھا۔ میں نے مینڈک اس کے سپرد کر دیا۔ اس نے احتیاط سے اس شے کو کاغذ میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا اور پھر رخصت ہو گیا۔

اگلے بدھ کو مجھے اپنی زندگی کا سب سے حیرت ناک تجربہ ہوا لیکن یہ شاک خوشی والا شاک تھا۔

میں ڈائننگ ٹیبل پر تھا' میرے سامنے وہ لفافہ پڑا تھا جو مجھے میرے دوست کی فرم نے روانہ کیا تھا اور اسے پڑھنے کے بعد سے مجھے یوں لگ رہا تھا کمرا مسلسل گھوم رہا ہو۔ اس لفافے میں میسرز اسنیک فائن آرٹ ڈیلرز والوں کی طرف سے میرے سنگی مینڈک کے فروخت کی اطلاع کے ساتھ ایک چیک بھی منسلک تھا اور یہ چیک ایک دو کراؤن یا پاؤنڈز کا نہیں تھا بلکہ پورے اٹھارہ سو پاؤنڈ کی رقم اس میں بھری تھی۔ اور یہ رقم دو سو پاؤنڈ کم کر کے لکھی گئی تھی کیونکہ مینڈک دو ہزار پاؤنڈ میں فروخت ہوا تھا۔ دو سو پاؤنڈ فرم نے کمیشن لیا تھا۔ میں یہ چیک دیکھ کر حیران تھا اپنے دوست کی باتیں سن کر بلاشبہ مجھے امید تو تھی کہ یہ شے کم از کم اس قدر رقم لے آئے گی کہ میں اگلے سہ ماہی کا کرایہ تو ادا کر ہی سکوں گا مگر اب ...... اتنی بڑی رقم کا تو میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ پورے اٹھارہ سو پاؤنڈ میں' اس رقم سے کرایہ ادا کرنے کی بجائے پوری ایک عمارت خرید سکتا تھا۔ اور پھر بھی کافی رقم بچ رہتی۔ واقعی میرے ساتھ ایک معجزہ ہوا تھا۔ ایسے معجزے گاہے گاہے دنیا میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔

میں جسمانی طور پر پوری طرح پر سکون نہ تھا اسی حالت میں' میں نے اپنے دوست کو فون کیا۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے جب مجھے مبارک باد دی تو مجھے

یقین آ گیا کہ میرے ساتھ کوئی مذاق نہیں ہوا ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ میں نے چیک کو ہاتھ میں لے کر دیکھا اور سوچنے لگا میرے اکاؤنٹ میں اس وقت ایک کوڑی تک نہ تھی بلکہ بیس پاؤنڈ کی رقم میں نے اوور ڈرافٹ بھی کر لی تھی۔ بے شک مجھے رقم کی اس وقت سخت ضرورت تھی لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ میں اپنے کردار میں کچا نہ تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی کسی کی نادانی سے کوئی مالی فائدہ اٹھانے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا تھا۔ خواہ یہ ان عورتوں کی نادانی ہوتی یا اس بوڑھے چوکیدار کی جس سے میں نے یہ مینڈک لیا تھا۔ میں اسے اپنی قسمت کا دیا ہوا تحفہ سمجھنے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔

میرے لیے ضروری تھا کہ میں کم از کم اس رقم میں سے آدھی تو ان لڑکیوں کو واپس ہی کر دوں جن کے ہاں سے میں نے یہ سنگی مینڈک لیا تھا۔ ایسا نہ کرنے کا مطلب ہوتا کہ میں جان بوجھ کر کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ یہ کھلی چوری کہی جا سکتی تھی۔ مجھے وہ دونوں لڑکیاں یوں بھی خاصی دوست قسم کی لگی تھیں۔ اپنے خیالات کے ساتھ ساتھ مجھے احساس ہوا کہ میں اب فوراً ہی اس دکان میں جا کر دونوں لڑکیوں کو حیران کر دوں لیکن بدقسمتی سے مجھے اس روز کورٹ اٹینڈ کرنا تھا پھر میسرز اسینک والوں کے چیک کو بھی جمع کرانا تھا میں نے پہلے یہ رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی اور پھر نو سو پاؤنڈ کا ایک چیک "کارنر کیور یو شاپ" کے نام بنا کر میں نے اسے جیب میں رکھ لیا۔

اس روز کورٹ میں بھی دیر ہو گئی اور کچھ دوسری مصروفیتیں ایسی تھیں کہ جب میں کارنر یو کیور شاپ پہنچا تو شام ہو چکی تھی اور دکان بند تھی۔ میں نے سوچا شاید بوڑھا چوکیدار اندر ہو لیکن اس سے مجھے کوئی کام نہ تھا۔ چیک کا معاملہ تو دکان کے مالکوں سے متعلق تھا۔ میں نے پھر دوسرے دن پر معاملہ ملتوی کر دیا اور ابھی میں وہاں سے چلنے ہی والا تھا کہ اچانک دکان کا دروازہ اندر سے کھول دیا گیا۔

دروازے کی دہلیز پر وہی بوڑھا چوکیدار کھڑا ہوا تھا اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

"فرمایئے جناب؟"

اس کی آواز میں سرگوشی کا عنصر کچھ اور بڑھ گیا تھا اور میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میں اس کی موجودگی میں رہنے سے گریزاں بھی ہوں پھر بھی میں خود کو اندر جانے سے روک نہ پایا۔

اس بار بھی اندر ویسی ہی سردی موجود تھی جیسی پچھلی بار میں نے محسوس کی تھی۔ میں اندر پہنچ کر کئی بار کپکپایا۔ اندر کئی ایک موم بتیاں روشن تھیں لگتا تھا انہیں ابھی ابھی جلایا گیا ہے۔ ان کی روشنی میں' میں نے دیکھا کہ بوڑھے چوکیدار کی نگاہیں سوالیہ انداز میں مجھے تک رہی ہیں' کیا چہرہ تھا وہ بھی' ایسا چہرہ ایسی انفرادیت بھرا چہرہ میں نے اب سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے سوچا اچھا ہوتا کہ آج یہ دروازہ نہ کھولتا۔

"کیوں جناب کوئی چیز دیکھنا پسند کریں گے؟" اس کی رعشہ زدہ آواز ابھری۔

"نہیں شکریہ۔" میں نے کہا۔ "آج میں دراصل اس چیز کے سلسلے میں آیا ہوں جو میں نے تم سے کچھ روز قبل خریدی تھی۔ وہ ایک اہم چیز تھی۔ خاصی قیمتی۔ برائے کرم تم اس دکان کی مالک لڑکیوں سے کہہ دینا کہ میں کل آ کر اس چیز کی مناسب قیمت ادا کروں گا۔"

میری گفتگو سن کر اس ضعیف بوڑھے کا چہرہ جیسے جگمگانے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہونٹوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

پر ابھرنے والی مسکراہٹ میں ایک ملکوتی حسن پنہاں ہے۔ مسکراہٹ کا لفظ بھی صحیح معنوں میں اس تاثر کی عکاسی سے قاصر ہے۔ لگتا تھا جیسے اس کے تھکے تھکے تاثرات یکا یک گرد کی طرح ڈھل گئے ہوں' یکا یک اس کا چہرہ ایک باطنی نور سے جیسے روشن روشن سا ہو گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے وقت رک گیا ہو۔

میں نے اس کے چہرے سے نگاہ ہٹا کر دوسری جانب دیکھا' جہاں ایک بڑی سی گھڑی رکھی ہوئی تھی۔ یہ قرونِ وسطیٰ کے زمانے کی تھی۔ یکا یک اس گھڑی نے گھنٹا بجایا اور وہاں تنی خاموشی یک لخت ٹوٹ گئی۔

میں نے چونک کر بوڑھے کی جانب دیکھا مگر وہ وہاں موجود نہ تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ نظر نہیں آیا۔ میری نظر دکان کے آتش دان پر پڑی میں اسے سرد سمجھ رہا تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہاں آگ کے شعلے موجود ہیں کمرا مناسب حد تک روشن تھا۔ مگر میں اس چوکیدار کو وہاں نہ دیکھ سکا۔

''ارے بھئی تم کدھر گئے؟'' میں نے آواز لگا کر اسے پکارا۔ مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے کمرے میں گھوم پھر کر اسے دیکھا۔ وہاں سوائے آتش دان کی لکڑیوں کے چٹخنے اور دیوار گیر گھڑی کی ٹک ٹک کے اور کوئی دوسری آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔

اسی وقت میری نگاہ دکان سے ملحق ایک اور چھوٹے کمرے پر پڑی۔ میں نے ایک شمع دان اٹھایا اور اس کا دروازہ کھولا۔ خیال تھا کہ شاید وہ کسی وجہ سے اس کے اندر چلا گیا ہو۔ یہ کمرا آگے جا کر ایک زینے پر رکتا تھا جو اوپر گیلری تک جاتے تھے۔ اس کے پاس میں نے رک کر دیکھا۔ وہاں مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے اور یہ عرصہ دراز سے غیر استعمال شدہ لگتا تھا۔ امید نہ تھی کہ وہ اوپر گیا ہوگا' ہو سکتا ہے وہ کسی وجہ سے چھپ گیا ہو۔ میں نے سوچا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں نے اسے اپنا پیغام دے دیا تھا۔ جب میں مین روم میں دوبارہ پلٹا تو مجھے یہ کمرا خاصا گرم اور آرام دہ محسوس ہوا۔ نہ جانے کیوں کچھ دیر قبل میں اس سے بے زار ہو رہا تھا؟ اب یہاں سے رخصت ہونے کو میرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ تاہم اب ٹھہرنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں دکان سے باہر نکل گیا۔ ویسے چلتے چلتے میں نے کئی بار مڑ کر دیکھا کہ شاید مجھے وہ ضعیف آدمی دکھائی دے جائے۔ یک بہ یک مجھے وہ چہرہ بے حد اچھا لگنے لگا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اس سے قبل آخر میں اس سے اس قدر گریزاں کیوں تھا؟

⌘......☯......⌘

اگلے اتوار کو میں بالکل آزاد تھا۔ اور میں دکان کی سمت سیدھا جا سکتا تھا۔ پھر میں چل پڑا۔ میں سوچتا جا رہا تھا کہ اس وقت وہ لڑکیاں کس قدر خوش ہوں گی جب انہیں میں چیک پیش کروں گا۔ جونہی میں نے دکان کا دروازہ کھولا' گھنٹیاں بجیں اور دونوں لڑکیوں نے جو اس وقت اپنی اشیاء کو جھاڑنے پونچھنے میں لگی ہوئی تھیں' میری جانب ہاتھ روک کر دیکھا کیونکہ اتنی جلدی صبح ہی صبح شاید وہ کسی گاہک کی آمد کی متوقع نہ تھیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے پہچان تو لیا اور مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے تھوڑا سا خم بھی ہوئیں لیکن میں نے ان کے اس استقبال میں کوئی غیر معمولی گرم جوشی نہیں محسوس کی حالانکہ مجھے اس کی امید تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید انہیں اس حیرت ناک خبر کا علم نہیں ہو سکا اور میرا اندازہ درست بھی نکلا کیونکہ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں چیک لے کر آیا ہوں تو وہ خاصی متعجب سی ہوئیں۔

''چیک...... کیسا چیک؟''

''اس سنگی مینڈک کا چیک جو میں نے کچھ روز قبل یہاں سے خریدا تھا۔''

''مینڈک؟ کیسا مینڈک' ہمیں جہاں تک یاد پڑتا ہے آپ نے ہم سے صرف ایک پلیٹ خریدی تھی۔''

گویا انہیں کچھ علم نہ تھا کہ میں بعد میں بھی دکان پر آیا ہوں۔ بہر حال میں نے انہیں آہستہ آہستہ ساری بات بتائی۔ وہ لوگ ساری بات سن کر بے حد حیرت میں تھیں۔ بڑی والی لڑکی تو ششدر سی نظر آ رہی تھی۔

''مجھے یقین نہیں آتا۔ بوڑھا چوکیدار خود اس بات کا مجاز نہیں کہ وہ ہماری غیر موجودگی میں کسی کو دکان میں آنے دے چہ جائے کہ وہ اشیاء بھی بیچے۔ وہ صرف شام کے وقت آتا ہے اور اس وقت تک ہی یہاں ٹھہرتا ہے جب تک پولیس والے ڈیوٹی پر نہیں آ جاتے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ اس نے آپ کو اندر آنے دیا اور پھر چیزیں بھی فروخت کیں اور ہمیں بتایا تک نہیں۔ یہ کس وقت کا ذکر ہے؟''

''میرے خیال میں چھ بجے شام کا وقت ہوگا۔''

''وہ عام طور سے ساڑھے پانچ بجے چلا جاتا ہے لیکن ہو سکتا ہے اس روز پولیس مین دیر میں آیا ہو۔''

''کل تو میں اور دیر سے آیا تھا۔ وہ تب بھی موجود تھا۔''

''اچھا تو کیا آپ کل بھی آئے تھے؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا اور انہیں بتا دیا کہ میں دراصل چیک کے سلسلے میں پیغام دینے کے لیے آیا تھا میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ آپ لوگوں کو بتا دے کہ میں آج چیک لے کر آؤں گا۔''

''کمال ہے کہ اس نے کچھ نہیں بتایا۔'' بڑی لڑکی نے حیرت سے کہا۔

''خیر وہ ابھی آنے والا ہے۔ صبح کے وقت وہی فرش کی صفائی کرتا ہے پھر پتا چلے گا کہ قصہ کیا ہے۔''

مجھے اس کی آمد کی خبر سن کر خاصی خوشی ہوئی۔ میں نے سوچا دیکھوں' یہ عجیب سا آدمی دن کی روشنی میں کیسا لگتا ہوگا۔ مجھے اس کے چہرے پر پیدا ہونے والی ملکوتی سی مسکراہٹ کو دیکھنے کا بھی اشتیاق تھا۔

''یہ چوکیدار' بہت بوڑھا ہے نا؟'' میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''بہت بوڑھا؟'' بڑی لڑکی نے مجھے دیکھا پھر بولی۔ ''بوڑھا تو ہے تاہم کام آسان سا ہے۔ ویسے یہ آدمی بے حد ایمان دار ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ اس نے خود سے کچھ بیچا ہوگا۔ بہر حال' اس میں ہماری اپنی غلطی بھی ہے کہ ہم نے کٹیلاگنگ میں سستی برتی تھی۔ میں تو سوچتی ہوں شاید وہ اس سے قبل بھی اشیاء بیچتا رہا ہوگا۔ ویسے جس مینڈک کا تذکرہ آپ نے کیا وہ رکھا کہاں تھا؟''

میں نے اس شیلف کی طرف اشارہ کیا جہاں سے چوکیدار نے اسے اٹھا کر مجھے دیا تھا۔

''اچھا تو ان متفرق اشیاء میں سے اس نے دیا تھا۔ ہم نے اسے حال ہی میں خریدا ہے۔ اور ابھی ہم نے ان کی فہرست بھی نہیں بنائی ہے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ ان اشیاء میں کوئی مینڈک بھی تھا۔

اسی وقت دکان کا ٹیلی فون بجنے لگا۔

''ہیلو' ہاں میں مس ولسن بول رہی ہوں۔ خیریت تو ہے کیا بات ہے مسز ہومز؟''

پھر چند لمحوں کا حیرت بھرا وقفہ رہا اور پھر مس ولسن نے دہرایا۔ ''کیا کہہ رہی ہو؟ انتقال ہو گیا اس کا ہارٹ فیل؟'' پھر چند اور الفاظ پر سے کے ادا کرنے کے بعد مس ولسن نے فون رکھ دیا اور اپنی بہن کی طرف دیکھ کر بولی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"بیسی!" اس کی آواز میں گہرا رنج شامل تھا۔ "بیسی بوڑھا ہومز مر گیا۔ کل جب وہ یہاں سے گیا تھا تو اس کے سینے میں درد تھا پھر آدھی رات کو ہی اس کا انتقال ہوگیا۔ غریب ہومز سمجھ میں نہیں آتا ہم لوگ کیا کریں۔ میرا خیال ہے ہمیں وہاں جانا چاہیے۔"

دونوں لڑکیاں اس بری طرح اپ سیٹ ہوگئی تھیں کہ میں نے وہاں سے رخصت ہونا ہی بہتر سمجھا۔

اس منفرد قسم کے بوڑھے آدمی نے میرے اوپر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا۔ مجھے خود اس کی موت پر تاسف سا ہوا۔ اس کی بیوی کے سوا اس سے آخری ملاقات کا شرف صرف مجھے حاصل تھا۔ یقیناً اس روز اس کی اچانک غیر حاضری میں اس کے سینے کے درد کا ہاتھ رہا ہوگا۔ ورنہ وہ ایک دم نہ چلا جاتا۔ ہوسکتا ہے جو حرکت اس نے کی تھی اس کے ضمیر پر ایک بوجھ بن گئی ہو اور وہ پھر دنیا ہی سے چل بسا۔ یقیناً یہی بات رہی ہوگی۔ جبھی تو وہ مسکرایا تھا۔ وہ نورانی مسکراہٹ ایک نوع کے ذہنی سکون ہی کی مظہر تھی۔ اس مسکراہٹ میں واقعی گہری طمانیت موجود تھی۔

دوسرے روز میں نے دونوں لڑکیوں کو اس سنگی مینڈک کی فروخت کی حیرت انگیز کہانی تفصیل سے سنائی اور آدھی قیمت کا چیک انہیں پیش کیا۔ خیال تھا کہ وہ لڑکیاں میری پیش کش پر خوش ہوں گی لیکن انہوں نے اسے لینے میں پس و پیش کا مظاہرہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں خود ہی اس ساری رقم کا مستحق ہوں اور انہیں کسی رقم کی کوئی ضرورت نہیں۔

"دیکھیے نا۔" مس ولسن نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دکان میرے باپ کا شوق تھی۔ وہ بوڑھے ہوگئے تو پھر ہم نے اسے صرف ان کی خوشی کے لیے چلانا شروع کردیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے والد نے اس شوق یا کاروبار سے اس قدر کمایا کہ ہمیں اب کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ ہم تو یہ دکان صرف وقت گزاری کے لیے چلاتے ہیں۔ نفع کی ہمیں کوئی طمع نہیں۔"

بہرحال، میں نے پھر کسی نہ کسی طرح انہیں راضی کر ہی لیا کہ وہ میرا چیک لے لیں اور اس رقم کو ان خیراتی کاموں میں لگادیں جو میری معلومات کے مطابق وہ کرتی رہتی تھیں۔

اس عجیب و غریب مینڈک کی فروخت کے واقعے نے دکان کی لڑکیوں سے مجھے خاصا بے تکلف کردیا تھا۔ میں پھر اکثر ان کے پاس یونہی آنے جانے لگا۔ رفتہ رفتہ ہماری جان پہچان ایک عمدہ دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ اس دوران میں نے ایک دو بار ان کے مرحوم چوکیدار کے بارے میں دریافت کیا لیکن وہ لوگ مجھے اس کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ بتا سکیں جو اس کی انوکھی شخصیت پر کچھ روشنی ڈال سکتی یا میرے لیے دلچسپ ثابت ہوتی۔ انہوں نے مجھے بس اتنا ہی بتایا کہ وہ ان کے باپ کے زمانے سے ہی ان کے پاس تھا اور اس طرح برسوں کا ملازم تھا۔ مینڈک کی فروخت کے بارے میں انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ شاید انہوں نے مرحوم چوکیدار کی بیوہ سے بھی اس بارے میں استفسار مناسب نہیں سمجھا تھا۔

ایک شام جب میں بڑی لڑکی مس ولسن کی ساتھ اندرونی کمرے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا مجھے وہاں ایک البم دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں اسے یونہی الٹ پلٹ رہا تھا کہ ایک جگہ میں رک گیا۔ وہاں ایک فوٹو لگا ہوا تھا جو بوڑھے چوکیدار کے چہرے سے بہت ملتا جلتا تھا۔ وہی کھڑے کھڑے سے نقوش اور روشن جلتی ہوئی آنکھیں، ویسے یہ تصویر غالباً بوڑھے کی

جوانی کی تھی کیونکہ اس میں اس کے گال پچکے ہوئے تھے نہ ہی آنکھوں تلے حلقے بنے تھے۔

"غریب ہومز کا یہ فوٹو کس قدر اچھا ہے۔" فوٹو کو دیکھتے ہوئے میں نے بآواز بلند کہا۔

"ہومز کی تصویر؟" مس ولسن نے حیرت سے کہا۔ "مجھے پتا نہ تھا کہ اس البم میں کوئی تصویر اس کی بھی ہے۔ لاؤ ذرا میں بھی دیکھوں۔"

ابھی میں البم اس کی سمت بڑھانے ہی والا تھا کہ دروازے میں سے مس ولسن کی چھوٹی بہن بیسی نے جھانکا اور پکاری۔

"میں پکچر دیکھنے جارہی ہوں۔" اس نے کہا۔ "فادر نے ابھی ابھی فون پر بتایا ہے کہ وہ یہاں آرہے ہیں وہ شیرائن سائڈ بورڈ دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بیسی۔" بڑی بہن نے کہا۔ "میں یہاں موجود ہوں مجھے فادر کی رائے جان کر خوشی ہوگی۔" اتنا کہہ کر اس نے البم مجھ سے لے لیا۔ اور اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کہاں ہے وہ تصویر؟"

میں نے اس ورق کی نشاندہی کی اور بتایا کہ اوپر والی تصویر دیکھو۔

"یہ تصویر؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔ "یہ تو میرے والد کی تصویر ہے۔"

"یہ تصویر تمہارے والد کی ہے؟" میں اس سے بھی زیادہ متحیر ہوا۔

"ہاں..... یہی بات ہوگی۔" میں نے جلدی سے بات بنادی۔ میں دراصل بے حد حیران ہو رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یقین تھا کہ میں نے ہومز کو دیکھنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی اور یہاں جو تصویر لگی تھی یہ یقیناً اسی آدمی کی تھی جسے میں نے دیکھا تھا۔

سوال یہ تھا کہ اگر اس روز وہاں اس کا باپ ہی تھا تو آخر اس نے اپنی بچیوں سے یہ بات کیوں چھپائی تھی، کیا ضرورت تھی اس کی؟ اس نے مینڈک کی فروخت کی بات بھی چھپائی تھی یہ بات بھی الجھاؤ والی تھی۔ پھر جب اسے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ یہ مینڈک غیر معمولی ثابت ہوا ہے تب بھی اس نے اپنی بچیوں کو بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ اور نہ جانے کیوں یہی تاثر دیتا رہا تھا کہ یہ حرکت بوڑھے چوکیدار ہومز کی ہے۔

اس کی صرف دو ہی تاویلیں ممکن تھیں۔ یا تو وہ اپنی بچیوں کو اس بارے میں بتانے سے شرمندگی محسوس کر رہا تھا یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ خود لڑکیوں نے اسے مینڈک سے ملنے والی رقم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس کی ضرور کوئی نہ کوئی وجہ بھی رہی ہوگی۔ میں بہرحال کسی خاندانی مخمصے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا لہٰذا میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہوگا کہ میں اپنی زبان بند رکھوں۔

نوجوان لڑکی بیسی نے کچھ دیر قبل اطلاع دی تھی کہ اس کا باپ کوئی شے دیکھنے کے لیے دکان میں آنے والا ہے۔ میں نے سوچا کیا وہ مجھے پہچانے گا نہیں؟ ہوسکتا ہے مجھے دیکھ کر وہ خاصا کھسیانا ہوجائے!

"یہ چہرہ حیرت انگیز ہے۔" میں نے تبصرہ کیا۔

"ہاں۔" لڑکی نے کہا۔ وہ خاصی خوش ہو رہی تھی۔ "یہ چہرہ ہوشیاری اور مضبوطی کی عکاسی کرتا ہے۔ کرتا ہے نا؟ مجھے یاد ہے جب یہ تصویر کھینچی گئی تھی انہی دنوں میرے والد ایک دم سے مذہبی خیالات کی طرف کھنچ گئے تھے۔" لڑکی نے یہ بات اس طرح بتائی جیسے یہ کسی تکلیف دہ بیماری کا تذکرہ رہا ہو۔

"کیا وہ اچانک ہی مذہبی بن گئے تھے؟"

"ہاں۔" اس نے قدرے تذبذب سے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”بے چارے والد۔ ان کی دوستی کسی پادری سے ہوگئی تھی۔ اور بس ان میں یہ تبدیلی آ گئی۔ اس کے بعد سے تو ان کے رنگ میں پھر کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔“

لڑکی کے انداز سے میں نے اخذ کیا کہ شاید اس کے باپ کے حواسوں میں کوئی خلل پڑا تھا۔ یہ بات دل کو لگتی بھی تھی۔ میں نے اسے دو بار دیکھا تھا اور دونوں بار مجھے اسے دیکھ کر محسوس ہوا تھا اس کی تشریح اسی طرح ہو سکتی تھی۔ وہ یقیناً کچھ خبط الحواس سا نظر آتا تھا۔

”کیا مذہبی بننے کے بعد سے وہ کچھ پریشان بھی رہنے لگے تھے؟“ میں نے پوچھا۔ دراصل میں اس سے اس وقت ملنے سے قبل اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان لینا چاہتا تھا۔

”ہاں بالکل......“ لڑکی تقریباً روہانسی ہو کر بولی۔ ”دیکھو نا...... وہ“ رک کر اس نے سوچا اور بولی۔ ”ٹھیک ہے تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں، تم ایک اچھے دوست ہو۔ دراصل میرے والد کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ان سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کے ہاتھوں خود کو تقریباً نیم مردہ محسوس کرنے لگے تھے۔ میں نے تم کو بتایا ہے نا کہ میرے والد کو قدیم اشیاء کو سمجھنے میں ملکہ حاصل تھا۔ جتنی بھی دولت انہوں نے جمع کی وہ اسی ہنر کی دین ہے۔ زندگی میں انہیں تین بار بزنس کے ایسے عمدہ مواقع ملے تھے جنہوں نے انہیں دولت کے ڈھیر پر کھڑا کر دیا تھا۔ میں اسی قسم کے واقعے کی بات کر رہی ہوں۔ جیسا تمہارے ساتھ ہوا ہے۔ اسی لیے میں یہ واقعات تمہیں سنا بھی رہی ہوں۔ ان کے اور تمہارے واقعے میں بڑی مماثلت ہے۔“ وہ تھوڑی دیر کے لیے رک گئی۔

”کہتی رہو۔“ میں نے اسے اکسایا۔

”تین مختلف موقعوں پر انہیں چند ایسی اشیا خریدنے کا اتفاق ہوا جو بے حد قیمتی تھیں لیکن اسے انہوں نے اونے پونے خرید لیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے تم کو دو ہزار کا مینڈک صرف آدھے کراؤن میں ملا تھا۔ البتہ تمہارے اور ان کے معاملے میں اتنا فرق تھا کہ تمہیں کچھ پتا نہ تھا کہ تم...... جو چیز سستے داموں لے رہے ہو دراصل بہت قیمتی ہے جب کہ والد ان اشیاء کو سستے داموں خریدتے وقت اچھی طرح آگاہ تھے کہ ان کی اصل قیمت کیا ہے۔ اس سے انہیں جتنا بڑا فائدہ ہوا تھا وہ ان کے لیے اچنبھے کی بات نہ تھی۔ تمہاری طرح انہوں نے ایسی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ ان لوگوں کو کچھ مناسب رقم ادا کر دیتے جن کی لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اشیاء ہتھیائی تھیں۔ ویسے بھی کوئی ڈیلر اتنا انصاف پسند نہیں ہوتا کہ ہوتا ہے؟“ رک کر اس نے پوچھا پھر بولی۔ ”اس طرح والد دولت مند ہوتے چلے گئے اور پھر اچانک ان کی ملاقات پادری سے ہو گئی۔ یہاں سے ان کے دماغ میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ وہ انتہائی گناہ گار شخص ہیں اور ان کی ساری دولت دوسروں سے چرائی ہوئی ہے۔ تین افراد سے حاصل کی ہوئی اشیاء ان کے لیے تین گناہ کبیرہ بن گئی تھیں۔ انہوں نے ان تینوں افراد کی تلاش شروع کی مگر بدقسمتی سے جب وہ ملے تو پتا چلا کہ وہ مر چکے ہیں۔ کمال کی بات تھی کہ وہ لوگ لاولد مرے تھے لہٰذا والد یہ بھی نہ کر سکے کہ ان کے بچوں کے لیے کچھ کر کے اپنے گناہ کی تلافی کرتے۔

”ان لوگوں نے انہیں بے حد رنجیدہ کر دیا۔ وہ مسلسل چاہتے تھے کہ کسی طرح اپنے گناہوں کی تلافی کر دیں پھر یہ خیال ان کے دماغ میں ایک نفسیاتی مرض بن گیا۔ ”اب صرف ایک ہی راستہ ہے“ انہوں نے کہنا شروع کر دیا۔ ”کہ میں اپنی بھلائی کے لیے تین ایسے افراد مہیا کروں جو میری جانب سے فراہم کیے موقعوں سے فائدہ اٹھانے کی بجائے ایک اچھے آدمی کا عمل کریں۔ میرے تینوں گناہ اب اسی طرح دھل سکتے ہیں کہ میں تین نیک کاموں کا سبب بنوں۔ بصورتِ دیگر میں کبھی بھی اس لائق نہ ہو سکوں گا کہ اپنے خدا کو منہ دکھا سکوں۔“

”ہم نے والد کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ انہیں سمجھایا کہ اپنی بساط بھر انہوں نے پوری کوشش کی تھی مگر ہماری باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ”میں نے جو کیا ہے اس کی تلافی ضروری ہے۔“ ان کے ذہن میں یہ خیال بری طرح جڑ پکڑے ہوئے تھا۔ تم دوسرے لفظوں میں اسے ان کا مذہبی جنون کہہ سکتے ہو۔

اس کے بعد انہوں نے یہ راستہ اختیار کیا کہ خاصی مہنگی اشیاء کو انہوں نے اکثر و بیشتر افراد کے ہاتھ معمولی داموں بیچنا شروع کر دیا۔ اور اس روز تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا جب ان گاہکوں میں سے پہلا آدمی ان کے پاس آیا اسے انہوں نے ایک قیمتی گلدان بے حد سستے داموں بیچا تھا۔ اس کے انہوں نے چھ شلنگ وصولے تھے جبکہ یہ چھ سو پاؤنڈ کا تھا آدمی نے آ کر ان سے کہا۔ ”جناب میرا خیال ہے آپ نے اس کے دام وصول کرنے میں غلطی کر دی ہے۔“ وہ بھی تمہارے جیسا ہی کوئی آدمی تھا۔ یقین کرو والد اس روز بے حد خوش تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ آج ان کا ایک گناہ دھل گیا ہے۔

پانچ سال گزر گئے اور انہیں ایک بار پھر خوشی سے دوچار ہوتے دیکھا۔ ایک اور گاہک اپنے نیک خیالوں کے ساتھ آیا تھا۔ ان کے دو گناہ دنیا کے دو نیکوکاروں کی وجہ سے ختم ہو گئے تھے۔

”لیکن اس کے بعد پھر برس پر برس گزرتے رہے اللہ کا کوئی نیک بندہ پھر نہیں آیا پھر والد مایوسی سے بڑبڑانے لگے کہ میں کبھی سکون نہیں پا سکوں گا۔ اگر میرا تیسرا گناہ نہ دھلا تو میں کبھی سکون کا سانس نہیں لے سکوں گا......“ لڑکی بولتے بولتے رو پڑی اس نے اپنا منہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور بڑبڑائی۔ ”کاش تم پہلے آ گئے ہوتے۔“

میرے کانوں نے گھنٹیاں بجنے کی آوازیں سنیں اور میں سمجھ گیا کہ شاید دکان کا دروازہ کھلا ہے۔

”بے شک میں ان کے انتظار کی اذیت کا اندازہ کر رہا ہوں“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن خیر مجھے خوشی ہے کہ اب میں ان کا تیسرا آدمی بن کر آ گیا ہوں۔ امید ہے اب وہ سکون سے رہ سکیں گے۔

کیوں؟“ اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیے اور مجھے دیکھنے لگی۔

باہر قدموں کی چاپیں لحہ لحہ قریب ہوتی جا رہی تھیں۔

”مجھے خوشی ہے کہ میں آج ایک بار پھر ان سے ملنے والا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کس سے ملنے والے ہو؟“ لڑکی نے چونک کر پوچھا۔

”تمہارے والد سے اور کس سے؟ تمہاری بہن نے بتایا تھا نا کہ وہ کچھ دیر بعد یہاں دکان میں کچھ دیکھنے آ رہے ہیں۔“

”اوہ میں سمجھی۔“ لڑکی استعجابیہ لہجے میں بولی۔ ”تم بیسی کے والد کا ذکر کر رہے ہو۔ تمہیں پتا نہیں بیسی دراصل میری سوتیلی بہن ہے۔ میرے والد کو تو مرے ہوئے برسہا برس بیت چکے ہیں۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

شریکِ سفر

یعقوب جمیل

محبت جب سر چڑھ کر بولتی ہے تو جنون کی شکل اختیار کرلیتی ہے اس کے زیر اثر محب اور محبوب کے لیے موت بھی زندگی بن جاتی ہے۔
علائو الدین خلجی کے دور میں جنم لینے والی عشق کی ایک ایسی داستان جس کا خود علائو الدین خلجی ایک اہم کردار بلکہ ولن تھا۔

تاریخ کے جھروکوں سے پہلی مختصر لیکن سچی کہانی

تقدیر کے آگے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بے بس ہے اتفاقات جب حادثات کو جنم دیتے ہیں تو اسے تقدیر کا ہی کھیل کہا جاتا ہے اور اتفاقات کو روکنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے، بس یہیں آ کر انسان بے بس، مجبور اور لاچار ہو کر اپنی تقدیر سے شکست کھا جاتا ہے۔ جلیل القدر بادشاہوں سے لے کر طاقت ور مہاراجا، راجا جو اپنے ایک اشارے سے دھرتی پر آندھیاں اٹھا دیا کرتے تھے، وہ بھی اپنے ساتھ ہونے والے حادثات کو نہ روک سکے اور انہوں نے بھی تقدیر کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔

اور آج منجولا دیوی کے چہرے پر بھی کچھ ایسی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں جس سے اس کی ذہنی پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ آج وہ صبح سے ہی پریشان پریشان سی نظر آ رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بھیانک خوف اسے اندر ہی اندر ڈستا جا رہا تھا۔ اس کے پورے وجود پر ایک دہشت سی طاری تھی۔ چہرے پر خوف تھا، آنکھوں میں پریشانی اور دل و دماغ میں گہری سوچ کی تڑپ تھی۔ اپنے محل میں تنہا ہونے کی وجہ سے اسے اپنی آنکھوں کے دیے ٹمٹماتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے جیسے ان دیوں کا تیل ختم ہوتا جا رہا ہو۔ آج وہ بے حد مضطرب تھی اور بڑی ہی بے چینی سے اپنے شوہر کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس شوہر کی جو زندگی کی کڑی صعوبتوں میں اس کا ہم سفر تھا۔ راجپوتانی منجولا دیوی نے خلجی خاندان کے شہزادے قدر خان سے محبت کی تھی، دونوں نے ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھا تھا، پرکھا تھا اور پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن گئے تھے۔ اس طرح راجپوتانی حسینہ منجولا دیوی، خلجی بادشاہ جلال الدین خلجی کی بہو بن چکی تھی۔

اگر کوئی عام آدمی یا کوئی عام سی عورت کسی الجھن میں مبتلا ہو جائے تو اسے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اسے ایک معمولی سی بات سمجھ کر ٹال دیا جاتا ہے لیکن منجولا دیوی ایسی عورت جو خلجی خاندان کے ایک شہزادے کی محبوبہ اور بیوی تھی۔ جس کے اشارے پر میدانِ جنگ میں تلواریں ٹکرا سکتی تھیں۔ ایسی عورت پریشانیوں اور الجھنوں میں پھنس کر مایوسیوں اور ناامیدی کے گھٹا ٹوپ بادلوں میں خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ یہ بات آسانی سے ماننے والی نہیں تھی اور اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو واقعی یہ ایک حیران کن بات تھی اور ہر شخص کو سوچنے پر مجبور کر سکتی تھی۔

وہ بات کچھ ایسی ہی تھی تقریباً ایک ہفتے پہلے سلطنت کے آس پاس کا ماحول ایک عجیب سے وحشت ناک سناٹے میں ڈوبا دکھائی دے رہا تھا۔ چاروں طرف موت کا سا سکوت طاری تھا اور اس سکوت سے حکومت کے ستون اندر ہی اندر لرزنے لگے تھے یوں لگ رہا تھا کہ موت کا بھیانک پنجہ آہستہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

آہستہ حکومت کو اپنی مٹھی میں دبوچ لے گا کبھی بھی کسی بھی لمحے ایسا ہو سکتا ہے۔ بس یہی خوف منجولا دیوی کی پریشانی اور اس کی بے چینی کا سبب تھا۔

بغاوت اپنے ہی نے کی تھی۔ سلطان جلال الدین خلجی کے بھتیجے علاؤ الدین خلجی نے اپنے چچا کی حکومت کے خلاف اپنا سر اٹھایا تھا۔ اس نے تمام چھوٹے بڑے فوجی سرداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ یوں بھی وہ اپنے لشکر کا سپہ سالار تھا اور اس وجہ سے لشکر کی لگام پوری طرح اس کی مٹھی میں تھی لیکن دوسرے سرداروں کو اپنے ساتھ شریک کر کے اس نے اپنی مٹھی کو اور مضبوط بنا لیا تھا۔

اس نے اپنے جس چچا کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تھا اس کے اسی چچا یعنی جلال الدین خلجی نے اسے کڑا کی جاگیر کا حاکم مقرر کیا تھا اور اسی جاگیر کی مٹی میں علاؤ الدین نے بغاوت کا بیج بو دیا پھر اسی مٹی سے اس نے بغاوت کے چھینٹے اڑائے۔

اتفاق زمانہ کہ فتح کے ہار گلے میں ڈالنے کے لیے علاؤ الدین چچا کے سامنے آ کر کھڑا ہوا تھا اور چچا کی گود میں پل کر جوان ہونے والے بھتیجے نے اپنے چہرے پر سے شرافت اور ایمان داری کا نقاب اتار پھینکا۔ تخت اور تاج حاصل کرنے کا لالچ انسان کے دل و دماغ میں ایسے ایسے شیطانی خیالات کو جنم دیتا ہے کہ وہ انسان سے شیطان اور آدمی سے درندہ بن جانے پر مجبور ہو جاتا ہے پھر اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی کی کوئی اہمیت اس کی نظر میں باقی نہیں رہتی۔

علاؤ الدین کی ہیبت کے ڈنکے چاروں طرف بجنے لگے تھے اپنی دہشت کا سکہ وہ بہت پہلے بٹھا چکا تھا جب وہ جنگ کے میدان میں اترتا تو زندگی توبہ توبہ پکار اٹھتی تھی۔ زندگی اتنی مجبور ہو جاتی تھی کہ اسے علاؤ الدین کی آنکھ کے اشارے پر دوڑنا پڑتا تھا۔ علاؤ الدین خلجی خاندان اور سلطان جلال الدین کا سب سے طاقت ور بازو تھا لیکن یہی طاقت ور بازو یکا یک خود اپنے چچا کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی بغاوت نے ہر سو خوف کی لہر دوڑا دی چاروں طرف ایک وحشت ناک سناٹا پھیل گیا۔ محل کے اندر محل کے باہر چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں اور جگہ جگہ سازشی جال بنتے نظر آنے لگے اور اسی لیے منجولا دیوی پریشان تھی۔

علاؤ الدین کے باغی بن جانے کی خبر سنتے ہی شہزادہ قدر خان اپنے باپ سلطان جلال الدین کے محل میں پہنچ گیا۔ سلطان جلال الدین بوڑھا اور ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی تھا، وہ زندگی کو زندگی سمجھ کر نہایت سکون اور اطمینان سے گزارنے کا عادی تھا۔ جنگ و جدل اور لڑائی جھگڑے سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے کبھی انقلاب کی آگ اور آندھیوں کی اندھا دھند نہیں دیکھی تھی۔ اس نے اپنے دشمنوں کو بھی جاگیروں سے نوازا تھا۔ وہ بے حد رحم دل اور خدا ترس آدمی تھا۔ ایسے آدمی کو اپنے بھتیجے کی بغاوت کی خبر سن کر دھچکا نہ لگے یہ ناممکن بات تھی۔ اسے شہزادے قدر خان کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی اطلاع مل چکی تھی۔ اسی لیے تو وہ اپنے باغی بھتیجے کو سمجھانے کے لیے کڑا جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

ابھی وہ اپنی روانگی کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ ٹھیک اسی وقت اسے علاؤ الدین کا دعوت نامہ بھی موصول ہو گیا۔ اس نے فوراً ہی سلطان جلال الدین کو کڑا آنے کی دعوت دی تھی لیکن وہ اپنے بھتیجے کی یہ چال بازی سمجھ نہ سکا اور بے خوف و خطر کڑا کی جاگیر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب شہزادہ قدر خان وہاں پہنچا تو سلطان جلال الدین کا گھوڑا اپنے حفاظتی دستے کے ساتھ کافی دور نکل چکا تھا۔

منجولا دیوی کو اپنے شوہر کا ہی انتظار تھا کیونکہ جب

تک قدر خان واپس نہیں آ جاتا' اس وقت تک اسے کوئی خبر نہیں مل سکتی تھی۔ کافی دیر بعد منجولا دیوی کو محل کی کھڑکی سے شہزادہ قدر خان کا گھوڑا آتا دکھائی دیا۔ دور سے اپنے شوہر کا گھوڑا پہچان کر اس نے طویل انتظار کے بعد سکھ کا سانس لیا تھا پھر وہ تیزی سے محل کے پھاٹک تک دوڑتی چلی گئی۔ نوجوان شہزادہ جب محل میں داخل ہوا تو اس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھی۔ منجولا نے حسب عادت اس کا استقبال کیا اور پھر دھیرے سے پوچھا۔

"سرتاج! سب خیریت تو ہے؟"

"نہیں...... خیریت نہیں ہے۔" شہزاد قدر خان جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا اوپر آ گیا۔ منجولا اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

"سرتاج! آخر ایسی کیا بات ہوگئی۔" منجولا دیوی سے یہ خاموشی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"علاؤ الدین نے دھوکے سے بابا جان کو اپنے پاس بلا کر انہیں راستے میں ہی قتل کرا دیا ہے۔" یہ کہہ کر شہزادہ قدر خان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور منجولا دیوی ایک جھٹکے سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سلطان جلال الدین کو خود ان کا بھتیجا اس طرح قتل بھی کر سکتا ہے؟

لیکن وہ ایک راجپوت عورت تھی' اس کی رگوں میں راجپوتی خون دوڑ رہا تھا وہ باہمت اور سمجھ دار تھی۔ اس لیے جھٹکا کھا کر گرنے سے پہلے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ بادشاہ حضور کا قتل؟" اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ "وہ بھی بیٹے جیسے بھتیجے علاؤ الدین کے ہاتھوں۔"

"ہاں اسی نمک حرام کے ہاتھوں۔" قدر خان نے جواب دیا۔ "اور یہ بات بالکل سچ ہے۔" حالات کے ہاتھوں قدر خان اتنا بے بس ہو چکا تھا کہ وہ کھل کر رو بھی نہیں سکتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں کے آنسو اندر ہی اندر سوکھ گئے ہوں' وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اپنے شوہر کی یہ حالت منجولا سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

"اب ہماری مصیبتوں کی ابتداء ہو چکی ہے۔" اچانک شہزادہ قدر خان سر اٹھا کر بولا۔ اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ "علاؤ الدین نے میری گرفتاری کا فرمان بھی جاری کر دیا ہے اور وہ ظالم دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے لیے کوچ بھی کر چکا ہے۔" شہزادہ قدر خان نے اپنی بیوی کے لمبے ہوتے ہوئے سائے کی جانب انگلی اٹھائی۔ شہزادے میں بھی اپنے باپ جلال الدین کی خاصیت موجود تھی' ہر ایک مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کا عادی تھا اور دھیرے دھیرے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتا تھا۔

منجولا دیوی نے اپنے شوہر کو ایک بار پھر خاموش دیکھا تو اس کی الجھن اور بڑھ گئی۔ وہ اپنے شوہر کو مایوس ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی' اسی لیے بولی۔

"تو اب کیا ارادہ ہے' کون سا قدم آپ اٹھانا چاہتے ہیں؟" اس کے ان لفظوں میں وزن تھا اور لہجے میں خود اعتمادی کی جھلک تھی اور کوئی فیصلہ کرنے کی طاقت تھی۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے؟" شہزادہ قدر خان خلاء میں گھورتا ہوا بولا۔ "میری گردن اڑا دینے کے لیے اس ظالم کی تلوار بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہے اور علاؤ الدین جیسے سنگ دل انسان سے رحم کی کوئی امید رکھنا بھی بے کار ہے' وہ مجھے اور خاندان کے کسی فرد کو زندہ نہیں رہنے دے گا۔ طاقت اس کی مٹھی میں ہے' جب کہ ہم بے یار و مددگار ہیں۔ وہ

فیصلہ کر چکا ہے۔"

منجولا دیوی چپ چاپ کھڑی اپنے شوہر کی یہ باتیں سنتی رہی' درد کی ایک لہر اس کے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے شہزادے کے قریب آ گئی پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"شہزادے! آپ کو اپنی موت کا یقین ہی ہو چکا ہے اور جب آپ کو علاؤ الدین کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترنا ہی ہے تو پھر آپ ایک بہادر کی موت کیوں نہیں مرتے؟ ایک مرد کی طرح موت کا سامنا کیوں نہیں کرتے؟ آپ اپنے بے گناہ اور بے قصور باپ کے قتل کا انتقام لینے کی قسم کھائیں اور انتقام لینے کے لیے میدان میں کود پڑیں۔" منجولا دیوی کی شریانوں میں بہتا ہوا راجپوتی خون الفاظ کا جامہ پہن کر اس کے منہ سے پھوٹ رہا تھا۔ شہزادہ قدر خان اس کی یہ بات سن کر چونک پڑا۔ اس نے منجولا دیوی کی آنکھوں میں ایک شعلہ سا جلتا ہوا دیکھا لیکن پھر بھی وہ اپنی مایوسیوں کے اندھیرے کو اپنے سامنے سے نہ ہٹا سکا اور بولا۔

"منجو! تمہاری بات میں مانتا ہوں لیکن تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ بدلہ لینے کے لیے پیٹھ پیچھے طاقت بھی ہونی چاہیے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ حالات میں کتنی تبدیلی آ چکی ہے۔ رعایا مجبوراً اپنے پیارے سلطان جلال الدین کو فراموش کرنے پر مجبور ہو جائے گی اور لشکر کا ایک ایک سپاہی علاؤ الدین کا وفادار بن چکا ہے۔ یہ خونی انقلاب ہے اور جہاں حالات ایسے ہوں وہاں میں اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہوں؟ ذرا یہ بھی تو سوچو۔"

"سب کچھ ہو سکتا ہے۔" منجولا دیوی کی یقین سے بھرپور آواز کمرے کی فضا میں گونجی۔ "دنیا میں ابھی انصاف زندہ ہے اور اس کی سانسوں میں گرمی بھی موجود ہے' تاج اور تخت کے وارث آپ ہیں' دہلی کی سلطنت کے سچے وارث کی حیثیت سے آپ کو کون نہیں جانتا؟ اوپر اوپر سے سلطنت کا ماحول علاؤ الدین کا طرف دار ہی کیوں نہ لگتا ہو لیکن اندر اندر ایسے بہت سے لوگ ہوں گے جو علاؤ الدین کی ناانصافی اور بد نیتی کو پسند نہیں کرتے ہوں گے اور جو اس کے نام پر تھوکتے ہوں گے' ایسے ہی لوگوں میں سے آپ کو سلطنت کے وفادار امیر' وزیر مل جائیں گے۔ آپ اٹھیے تو سہی' انہیں آواز تو دیجیے۔ مجھے یقین ہے آپ کو ان کی مدد ضرور ملے گی۔"

منجولا دیوی نے کبھی بھی امور سلطنت اور نظام حکومت میں دخل اندازی نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے سیاسی چالوں سے کوئی دلچسپی تھی مگر اس کے خیالوں میں' اس کی سوچ کی گہرائیوں میں سیاست کی چالوں اور نظام حکومت کی باریکیوں کو سمجھنے کی ساری خوبیاں موجود تھیں اور اسی لیے اپنے شوہر کو حوصلہ دینے کے لیے اس نے ان باتوں سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن شہزادے قدر خان کی دلیل بھی کمزور نہیں تھی۔ منجولا کی بات سن کر اس نے کہا۔

"منجو! جب حالات ہی آدمی کے دشمن بن جائیں تب ناامیدی اور ناکامیابی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا' ایسے وقت میں کامیابی کے ساتھ بھی دور دور تک نظر نہیں آتے' ان حالات میں دشمن سے مقابلہ کر کے میں اپنے تھوڑے بہت وفادار ساتھیوں کو انتقام کی جنگ میں بلاوجہ کھپا دینا نہیں چاہتا۔"

منجولا دیوی اپنے پریشان اور مایوس شوہر کا چہرہ دیر تک دیکھتی رہی۔ اسے لگا کہ اس کی بھرپور دلیل کے آگے اس کا شوہر اپنی کمزوری اور مجبوری کا اظہار کر رہا ہے اور یہ بات منجولا کو پسند نہیں آئی وہ بولی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ موت سے ڈر

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہے ہیں۔" اس کے منہ سے ابھی یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ قدر خان کا ہاتھ پھرتی سے اپنی تلوار کے دستے پر پڑا۔ ایک خلجی شہزادے کو ڈرپوک کہنے کی ہمت اس کی بیوی میں تو کیا کسی اور میں بھی نہیں تھی۔ اس بات کا ثبوت شہزادے قدر خان کی آگ برساتی آنکھیں دے رہی تھیں۔

"میں موت سے نہیں ڈرتا منجولا۔" قدر خان نے بے خوف لہجے میں جواب دیا۔ "موت تو اس وقت بھی مجھ سے دور نہیں، آنے والا کوئی بھی لمحہ اپنی مٹھی میں میرے لیے موت کا پیغام لاسکتا ہے۔ یہ بات میں جانتا ہوں۔"

"تب آپ علاؤ الدین کے غصے سے ڈر رہے ہیں؟"

"نہیں......!" شہزادہ قدر خان چیخا۔

"تو پھر کون سی چیز ہے جو آپ کو اس ظالم کے خلاف تلوار اٹھانے سے روک رہی ہے؟" اس کے غصے کی پروانہ کرتے ہوئے بولی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں؟ تمہارے سوال کا کس طرح جواب دوں؟ کیسے تمہیں تفصیلات بتاؤں؟" شہزادہ قدر خان نے پریشان کن لہجے میں اپنی مجبوری ظاہر کی۔

"میں سمجھ گئی ہوں، آپ بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں۔" منجولا نے پھر چوٹ کی۔

"نہیں...... منجولا نہیں، میں کوئی بہانہ نہیں کررہا ہوں۔" قدر خان اٹھ کر بولا۔ "تم میری بیوی ہو اور تمہارے آگے مجھے کوئی بہانہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن میں کسی کام کو شروع کرنے سے پہلے اس کے انجام پر ضرور غور کرلیا کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر میں اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے نکلتا ہوں تو مجھے کامیابی نہیں ہوگی کیونکہ پوری فوج اس کے قبضے میں ہے، میرے ساتھ ساتھ میرے بے قصور ساتھی بھی کٹ جائیں گے اور میں یہ بات ہرگز پسند نہیں کرتا۔ میری تقدیر میں اگر ناکامیابی اور موت ہی لکھی ہے تب میں خود ہی مرنے کے لیے تیار ہوں، میں اپنے ساتھ بے گناہ لوگوں کو موت کے منہ میں کیوں لے جاؤں؟"

یہ سن کر منجولا بڑی دیر تک چپ رہی اور دل ہی دل میں سوچتی رہی پھر تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔

"سرتاج! تو پھر آپ میری ایک بات مان لیں آپ اگر علاؤ الدین سے مقابلہ کرنا نہیں چاہتے تو نہ کریں مگر یہ محل چھوڑ کر ضرور چلے جائیں۔ کہیں روپوش ہوجائیں اور میری یہ کٹار اپنے ساتھ لیتے جائیں۔"

منجولا دیوی نے اپنی کمر سے بندھی ہوئی راجپوتی کٹار نیام سمیت نکال کر قدر خان کے ہاتھ میں تھمادی اور بولی۔ "سرتاج! یہ کٹار میں آپ کو اس لیے دے رہی ہوں کہ روپوش ہوجانے کے بعد بھی آپ کسی ایسے موقع کی تلاش میں رہیں کہ آپ کو چھپ کر علاؤ الدین کے سینے میں یہ کٹار اتار دینے کی مہلت مل جائے اگر اس طرح بھی آپ نے اسے ختم کردیا تو پھر بعد میں آپ کو پھانسی پر بھی چڑھا دیا گیا تو مجھے اتنا دکھ نہیں ہوگا جتنا دکھ آپ کی گرفتاری سے ہوگا۔"

راجپوتی خمیر بہادری کے خمیر کے سوا اور کسی کو نہیں پہچانتا۔ اسی لیے راجپوتانی منجولا دیوی نے اپنے شوہر کو یہ مشورہ دیا تھا۔ ابھی وہ اپنے شوہر کو سمجھانے میں مصروف تھی کہ اچانک محل کے باہر سے لوگوں کی بھاگ دوڑ اور شور وغل کی آوازیں سنائی دیں پھر انہیں پتا چل گیا کہ علاؤ الدین کی فوج دہلی شہر کی سرحد تک آپہنچی ہے اور شاہی محل کے امراء کی گرفتاری کے لیے اس کی فوج کا ایک دستہ محل کی جانب پیش قدمی کررہا ہے۔ منجولا دیوی نے پھر سے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑلیا

اور اسے کھینچتے ہوئے بولی۔

"سرتاج! جلدی کیجیے میرے ساتھ آئیے، میں آپ کو تہہ خانے کے خفیہ راستے پر چھوڑ آؤں مگر یہ بات آپ ضرور یاد رکھیے گا کہ اگر آپ گرفتار ہوگئے تو انتقام لینے کے سارے راستے بند ہوجائیں گے۔"

یہ سن کر شہزادہ قدر خان چونک پڑا۔

"کیا تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گی؟"

"نہیں!" منجولا نے جواب دیا۔ وہ دونوں اس وقت محل کے خفیہ راستے کے زینے اتر رہے تھے۔ "میں اگر آپ کے ساتھ چلوں گی تو آپ کی پریشانیوں میں اور اضافہ ہوجائے گا۔"

"لیکن یہاں رہو گی تو تم اس ظالم علاؤ الدین کے ظلم کا شکار ہوجاؤ گی۔" شہزادہ قدر خان اپنے خوف کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں...... آپ اس کی فکر نہ کریں میں اس آدمی سے نہیں ڈرتی، مجھے اپنی جان سے مرحوم سلطان کی موت کا بدلہ لینا زیادہ پیارا ہے۔ میں اگر آپ کے ساتھ رہی تو علاؤ الدین کے سپاہی آسانی سے ہماری شناخت کرلیں گے اور اس طرح آپ گرفتار ہوجائیں گے۔"

❀......☆......❀
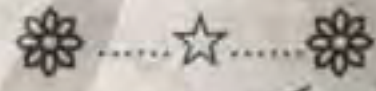
دہلی کے تخت پر کئی بادشاہ آئے اور اپنی اپنی شان دکھا کر چلے گئے۔ دہلی شہر بادشاہوں کی اس آمد اور رفت سے کئی بار اجڑا اور کئی بار بسایا گیا۔ اس لیے عام رعایا کو اس کی کوئی فکر نہیں تھی جو بادشاہ چلا گیا اسے لوگ بھول گئے اور جو تخت پر بیٹھ گیا لوگوں نے اس کے سامنے اپنے سر جھکا دیئے۔

علاؤ الدین اپنے چچا کو قتل کرکے تخت پر بیٹھا تھا لیکن ایک فکر اب بھی ایسی تھی جو اسے رات بھر سونے نہیں دیتی تھی۔ اپنے چچا جلال الدین کی طرح وہ اپنے چچازاد بھائی قدر خان کا سر بھی اپنے قدموں میں دیکھنا چاہتا تھا، سلطان جلال الدین کا وہ بیٹا دہلی کے تخت کا وارث تھا جو زندہ سلامت نکل بھاگا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ شہزادہ قدر خان موقع ملتے ہی اپنا سر اٹھائے گا اور وہ اس کے سر کو اٹھنے سے پہلے ہی کچل دینا چاہتا تھا۔

ایک رات علاؤ الدین کو نیند نہیں آرہی تھی، وہ بے چین ہوکر اپنے کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ اس کی بے چینی کی وجہ شاہی محل میں ایک نئی داسی تھی۔ دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے بعد جن عورتوں کو گرفتار کیا گیا تھا ان میں منجولا دیوی بھی تھی اور یہ اس کا حسن ہی تھا جس نے علاؤ الدین کو مسخر کرلیا تھا۔

علاؤ الدین خلجی نے بہت کوشش کی لیکن منجولا دیوی نے اس ظالم کے تابع ہونے سے صاف انکار کردیا تھا۔ علاؤ الدین کی ہر پیش کش اس نے ٹھکرادی تھی اور اسی لیے وہ پریشان تھا۔ علاؤ الدین ظالم تھا لیکن منجولا کا دل جیتنے کے لیے وہ زبردستی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات تو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عورت کو بے وقوف بنا کر جیتا جاسکتا ہے، اسے فریب دے کر قابو میں کیا جاسکتا ہے لیکن زبردستی کسی عورت کا دل نہیں جیتا جاسکتا۔

منجولا دیوی اب کسی شہزادے کی بیوی نہیں رہی تھی بلکہ اب اس کی حیثیت نئے شہنشاہ کی ایک ادنیٰ کنیز کی سی تھی لیکن علاؤ الدین خلجی کی حالت تو ایسی تھی کہ وہ ایک ادنیٰ کنیز کی خاطر حکومت اور تاج وتخت کو بھی قربان کردینے کے لیے تیار تھا۔

ٹہلتے ٹہلتے اس نے ایک آخری کوشش کرنے کا فیصلہ کیا اور منجولا کو اپنے خاص کمرے میں طلب کرلیا جو علاؤ الدین تھوڑی دیر پہلے غصے سے تنا بیٹھا تھا، وہ منجولا دیوی کی جھلک دیکھتے ہی نرم پڑ گیا۔ اس نے بے حد میٹھا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”منجولا! کیا تم جانتی ہو کہ میں نے تمہیں اس وقت یہاں کیوں بلایا ہے؟“

”جی ہاں! میں جانتی ہوں۔“ منجولا نے بے حد پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ”جس بات سے میں بار بار انکار کرتی چلی آئی ہوں، وہی انکار ایک بار پھر سننے کو آپ کا جی چاہ رہا ہے۔“ اس کی یہ خود اعتمادی دیکھ کر علاؤ الدین خلجی اپنے چہرے پر غمگینی اور اداسی کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں منجولا! میں نے تمہیں اس لیے نہیں بلایا ہے، اس وقت تو میں نے تمہیں ایک دردناک خبر سنانے کے لیے بلایا ہے۔“

یہ سن کر منجولا دیوی ایک پل کے لیے تو تھرتھرا گئی لیکن اس نے اپنے چہرے سے اپنی اس کمزوری کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اس نے بہت ہی سنبھل کر پوچھا۔

”اب ایسی کون سی دردناک خبر باقی رہ گئی ہے؟“

”شاید تم سن نہ سکو یا سن کر پھر سنبھل نہ سکو۔“ علاؤ الدین بہت سنجیدہ اور اداس لہجے میں بولا۔ ”ابھی تھوڑی دیر قبل ہی گجرات سے ایک قاصد یہ خبر لایا تھا......“ اتنا کہہ کر علاؤ الدین تھوڑی دیر کے لیے رکا تو منجولا دیوی کو اس کی آواز میں تھرتھراہٹ سی محسوس ہوئی، اس نے دیکھا تو علاؤ الدین کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں اور مشعل کی روشنی میں اس کی آنکھوں کا پانی چمکتا ہوا اور بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد علاؤ الدین نے پھر کہا۔

”شہزادہ قدر خان یعنی تمہارا شوہر گجرات میں کسی راجپوت کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔“ اتنا کہہ کر علاؤ الدین خلجی نے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے۔

منجولا دیوی کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی۔

”سرتاج!“ پھر وہ بے حال ہو کر زمین پر گر پڑی۔ یہ دیکھ کر علاؤ الدین خلجی بھی اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا اور بولا۔

”منجولا......! مجھے بھی واقعی اس کی موت کا بے حد افسوس ہے، وہ بے وقوف بے کار ہی مجھ سے خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلا تھا۔ کاش! وہ اتنا تو سمجھتا کہ میں اسے کتنا چاہتا تھا۔“ منجولا سسک سسک اور بلک بلک کر رو رہی تھی اور علاؤ الدین کہتا جا رہا تھا۔ ”اس کے باپ سے تو میری نہ بننے کی وجہ کوئی اور ہی تھی لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ میں اس کا بھی دشمن ہوں۔ کچھ بھی ہو آخر وہ میرا بھائی ہی تو تھا اور میں تو اسے اس لیے تلاش کر رہا تھا کہ اس کا حق اسے سونپ دوں، میری خواہش تھی کہ میں اپنے ہاتھوں سے اسے دہلی کے تخت پر بٹھاؤں لیکن افسوس کہ وہ مجھے نہیں سمجھ سکا۔“

مگر منجولا دیوی کے دل پر تو بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔ اس وقت تو وہ دُہرے غم سے دوچار تھی۔ پہلا غم تو اس بات کا تھا کہ اس کا شوہر اپنے باپ کا بدلہ نہیں لے سکا تھا اور دوسرا غم اسے شوہر کی بے وقت موت کا تھا۔ وہ روتے ہوئے بولی

”اب مجھے بھی زندہ رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں بھی مر کر اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤں گی۔“

”نہیں، منجولا نہیں...... کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئیں؟“ علاؤ الدین اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں ایسی باتیں سوچنا بھی نہیں چاہیے، تمہیں زندہ رہنا ہے اور زندہ رہنا چاہیے۔“

”مگر کیوں...... کس لیے؟ کس کے لیے میں زندہ رہوں؟“ منجولا دیوی تڑپ کر بلک پڑی۔ ”اب میری دنیا میں رکھا ہی کیا ہے؟“

”تمہارے لیے بہت کچھ ہے منجولا! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔“ علاؤ الدین اپنے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔ ”اب تو تمہارے لیے ہر راستا کھلا ہوا ہے، تم چاہو تو ہندوستان کی ملکہ بن سکتی ہو، تم چاہو تو سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہو۔“ یہ کہہ کر علاؤ الدین نے اپنا جال پھیلا دیا تھا۔

”منجولا مرنے والے پر افسوس تو ہوتا ہی ہے، یہ ایک قدرتی بات ہے لیکن مرنے والے کی یاد میں زندگی کو وقف کر دینا یہ تو سراسر بے وقوفی ہے، آگے دیکھو، تمہیں شریکِ سفر تو اور بھی مل سکتا ہے۔“

یہ سن کر منجولا دیوی نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اٹھایا اور اپنی بھیگی سرخ آنکھیں علاؤ الدین کی آنکھوں میں ڈال کر بولی۔

”ہندوستان کے بادشاہ! آپ اگر یہ بات نہ جانتے ہوں تو آج جان لیں کہ ایک باعزت، باکردار اور خاندانی عورت اپنی زندگی میں صرف ایک مرد کی ہی ہو سکتی ہے اور وہ مرد اس کا شوہر ہوتا ہے۔ ہندوستان کا یہ تاج و تخت جو ایک دن مٹ جانے والا ہے تو ایسی مٹ جانے والی چیز کے لیے کیا میں اپنے ماتھے پر ایسا داغ لگا لوں جو کبھی بھی نہ مٹ سکے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔“

یہ سن کر علاؤ الدین خلجی کو لگا کہ تخت و تاج جیتنا آسان ہے لیکن عورت کی ضد کو توڑنا اور اس کے دل کو جیت لینا انتہائی مشکل ہے۔ اپنی ناکامی پر اسے غصہ آ گیا اور وہ اپنی آنکھیں سرخ کر کے بولا۔

”منجولا! اب جب کہ تمہارا شوہر مر چکا ہے تو میرے لیے بھی راستہ صاف ہے، تم ٹھنڈے دل سے سوچ لو میں ایک دن کی تمہیں مہلت دیتا ہوں اور یہ بات کان کھول کر سن لو کہ انکار مجھے پسند نہیں ہے، میری تلوار ہر الجھن کا فیصلہ کرتی ہے۔ ایک دن میں جو بھی سوچنا ہو وہ سوچ لو۔“

علاؤ الدین خلجی کی یہ دھمکی سن کر منجولا دیوی اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے اور پُرجوش لہجے میں بولی۔

”ایک دن کی مہلت کس لیے؟ میں تو ابھی اور اسی پل مرنے کے لیے تیار ہوں۔“ اتنا کہہ کر اس نے اپنی گردن جھکا دی۔

یہ دیکھ کر علاؤ الدین کا غصہ اپنی آخری حدوں کو چھونے لگا۔ منجولا کے لیے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اسے ایک معمولی عورت کے گھمنڈ پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ اس نے اپنی تلوار نیام سے کھینچ نکالی لیکن اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ اوپر اٹھتا، ایک راجپوتی کٹار اس کی پیٹھ میں گھس گئی۔ علاؤ الدین زخم کھا کر نیچے گرا اور اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔

اس کی پیٹھ پر کٹار سے وار کرنے والا شخص اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ شہزادہ قدر خان تھا۔ منجولا دیوی کا شوہر قدر خان کو اپنے سامنے دیکھ کر زخمی علاؤ الدین خلجی نے اپنے سپاہیوں کو پکارا تو آن کی آن میں پہرے دار حاضر ہو گئے اور انہوں نے پل بھر میں منجولا اور شہزادہ قدر خان کو گرفتار کر لیا۔

علاؤ الدین خلجی موٹی چمڑی کا کھردرا اور سخت جان آدمی تھا۔ کٹار اس کی پیٹھ میں لگی تو ضرور تھی لیکن وہ گہرائی تک اس کے جسم میں نہیں اتر سکی تھی، اس لیے وہ بچ گیا۔

منجولا دیوی اور شہزادہ قدر خان کو قید خانے کی کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا تھا۔ وہ دونوں اس قید خانے میں خوش تھے کہ انہیں ایک ساتھ موت کی سزا ملنے والی تھی۔ اس طرح وہ ہم سفر موت کی منزل تک شریک سفر رہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

قسط نمبر 20

گردشِ شہر

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

اس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی تحیر خیز سلسلے وار کہانی

انکل طلال نے جو دھما کہ خیز نیوز سنائی تھی اسے سن کر مجھے خود پر قابو نہیں رہا اور میں چیخ اٹھی۔

''انکل حشام...... انکل حشام تو ٹھیک ہے ناں......''

میرا لہجہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ میں نے پھر پوچھا...... ''یہ سب آخر ہوا کیسے؟''

''بیٹا! اب سب خیریت ہے اور اللہ پاک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حشام بھی بالکل خیریت سے ہے ان لوگوں نے فائرنگ ضرور کی تھی لیکن میں داد دیتا ہوں کرنل کے کمانڈوز کو کہ انہوں نے خوب مقابلہ کیا ان کے بندے زخمی بھی ہوئے ہیں اور ایک بندہ سر میں گولی لگنے کی وجہ سے فوری طور پر ہلاک بھی ہوگیا ہے۔ بعد میں پولیس بھی آ گئی انہوں نے لاش اپنے قبضے میں لے لی ہے' کرنل بھی فوری طور پر موقع پر پہنچ گیا' میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ایسا کیسے ہوگیا؟ وہ لوگ حشام کے کمرے تک پہنچ کیسے گئے وہ تو شکر ہے کہ حشام نیند کی دوا کے زیر اثر گہری نیند میں تھا پھر بھی اتنے شور و ہنگامے کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اسے تھوڑی بہت بات بتائی ہے لیکن وہ خاصا ڈسٹرب ہے۔''

''انکل آپ اس وقت کہاں ہیں؟'' میں نے حشام کی خیریت کی اطلاع پا کر اللہ کا شکر ادا کرنے کے بعد پوچھا۔

''میں یہاں اسپتال میں موجود ہوں۔'' انکل نے جواب دیا۔

''پھر میں ابھی فوری طور پر آ رہی ہوں۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''نہیں بیٹا تم ابھی مت آؤ' ایک تو تمہارا اس وقت گھر سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ یہاں کسی کو بھی آنے کی اجازت نہیں ہے۔'' انکل نے منع کرتے ہوئے کہا۔

''انکل میری حشام سے بات کرادیں پلیز......'' میں نے کہا کیوں کہ اس سے بات کرکے میں اس کے خیریت سے ہونے کی تسلی کرنا چاہتی تھی۔

''سوری بیٹا! میں تمہاری حشام سے بات نہیں کرواسکتا کیوں کہ اسے ڈاکٹر نے سکون بخش دوا دے کر سلا دیا ہے۔ جاگنا اور ان باتوں کے بارے میں سوچنا اس کے لیے بہتر نہیں تھا۔'' انکل نے کہا۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں ناں انکل! مجھے بہلا تو نہیں رہے' حشام بالکل خیریت سے ہیں ناں۔'' میں نے غیر یقینی لہجے میں پوچھا۔

''بیٹا آپ نے کیسے یہ سوچ لیا کہ میں آپ سے کوئی بات چھپا سکتا ہوں' مطمئن رہو اللہ نے کرم کردیا ہے۔ کرنل مشتاق کہہ رہے تھے کہ اب وہ حشام کی سیکیورٹی مزید سخت کردیں گے' ویسے بھی یہ خبر تمام نیوز چینلز پر نشر ہو رہی ہے۔ فائرنگ کا یہ واقعہ چھپایا نہیں جاسکتا تھا۔'' انکل نے کہا تو میں نے انہیں اللہ حافظ کہا اور ٹی وی آن کرلیا' سارے ہی چینلز پر یہ بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔

تب ہی امی میرے کمرے میں چلی آئیں اور میں جو اتنی فکر مند اور دل برداشتہ ہو رہی تھی' بھاگ کر ان کے سینے سے لگ کر سسک پڑی۔

''اللہ رحم کرے اب کیا ہوگیا؟'' امی نے لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

تب میں نے امی کو آنسوؤں کے درمیان اٹک اٹک کر ساری بات بتادی' میرے ساتھ ساتھ امی بھی فکر مند ہوگئیں لیکن مجھے تسلیاں بھی دیتی رہیں۔ وہ ساری رات میں نے جاگتے ہوئے گزاری آنکھوں میں آنسو اور زبان پر دعائیں تھیں۔

دوسرے دن صبح ہی سے ساری صحافی برادری سڑکوں پر نکل آئی گورنر ہاؤس کے سامنے مظاہرے ہو رہے تھے' ہر ایک سراپا احتجاج بنا ہوا تھا اور ان لوگوں کی گرفتاری پر اصرار کر رہا تھا' جو اس ساری صورت حال کے ذمہ دار تھے' حشام کے ساتھ ساتھ رمضان صاحب کے لیے بھی ساری صحافی برادری سراپا احتجاج تھی۔

میں نے طلال انکل سے اس احتجاج میں شرکت کی اجازت مانگی تو انہوں نے مجھے منع کردیا کہ اس طرح تو تمہارے دشمنوں کو تمہیں راستے سے ہٹانے کے لیے راستہ صاف مل جائے گا' بہتر یہی ہے کہ ابھی گھر سے باہر مت نکلو' انہوں نے مجھے اسپتال آنے سے بھی منع کردیا۔

مشکل یہ تھی کہ ابھی حشام کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ اسے اسپتال سے کہیں اور شفٹ کیا جاسکتا ابھی زخموں کو خشک ہونے میں ٹائم تھا' کسی بھی جگہ موومنٹ میں اس کے ٹانکے کھل سکتے تھے۔ ڈاکٹرز کے مطابق کم از کم پندرہ دن اسے مزید اسپتال میں رہنا تھا اور یہ پندرہ دن مجھے سولی پر گزارنے تھے۔ میرا مسلسل انکل سے فون پر رابطہ تھا انہوں نے مجھے ایک خوش خبری یہ بھی سنائی کہ کرنل مشتاق نے جیسا کہا تھا وہی کیا ہے' میں سمجھ گئی کہ حماد کو انہوں نے اٹھا کر اپنی گرفت میں لے لیا ہے' ہم نے کوڈ ورڈ میں بات کی پھر انکل بولے۔

''ایک منٹ ہولڈ کرو۔'' اور تقریباً ایک منٹ کے بعد مجھے حشام کی نحیف اور کمزور آواز سنائی دی۔

''ہیلو جان حشام! کہاں ہو؟''

''ہش...... حشام...... کیسے ہو......؟'' میں لرزتی ہوئی آواز میں بمشکل کہہ سکی۔

''جب ڈاکٹر کو ہی مریض کی پروا نہ ہو تو خود سوچ لو کہ مریض کا کیا حال ہوگا۔'' اس نے روٹھے روٹھے لہجے میں کہا۔

''وہ...... وہ...... حشام...... میں...... میں۔''

''کوئی بہانہ مت کرو میری نگاہیں تمہارے لیے مستقل دروازے پر لگی ہوئی ہیں۔ تم آج آئیں کیوں نہیں؟'' اس کا روٹھا روٹھا سا لہجہ برقرار تھا۔

''وہ...... دراصل حشام خود میری طبیعت خراب ہے' بخار ہوگیا ہے' جیسے ہی طبیعت ٹھیک ہوگی میں فوراً تمہارے پاس آؤں گی پلیز مجھ سے ناراض تو مت ہو۔'' میں نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

''تو کم از کم تم مجھے فون ہی کرتیں' وہ تو میں نے ڈیڈی کی اتنی خوشامد کی تو انہوں نے تم سے بات کروائی۔'' وہ ظالم شکوے پر شکوے کیے جا رہا تھا اور میں بس بے بسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے ہونٹ کاٹتی رہی۔

"میں نے فون اس لیے نہیں کیا تھا کہ مجھے تو تمہارے پاس خود آنا تھا لیکن یہ بخار راہ میں رکاوٹ بن گیا ہے۔ بستر سے اٹھا ہی نہیں جارہا' بہت چکر آرہے ہیں اگر تم اسی طرح روٹھے رہے تو پھر مجھے آنا ہی پڑے گا چاہے میرا جو بھی حال ہو۔" میں نے لگا کہ جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"واقعی تم بیمار ہو' سچ کہہ رہی ہو؟" اس نے فکرمندی سے تڑپ کر پوچھا

"تمہیں شک کیوں ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں میری عمر بھی لگادے' بس تم جلدی سے ٹھیک ہوجاؤ' اپنا خیال رکھنا دوائی وقت پر لینا اور ٹھنڈا پانی مت پینا پلیز...... میرے لیے۔" اس نے ہمیشہ کی طرح ڈھیر ساری نصیحتیں کرنا شروع کردیں' اسے پتا تھا کہ میں ہمیشہ ٹھنڈا پانی پیتی ہوں اور اسی وجہ سے بار بار میرا گلا بھی خراب ہوجاتا تھا اور پھر ٹمپریچر بھی ہوجاتا تھا۔

"اوکے سر! آپ کی ہدایت پر سختی سے عمل کیا جائے گا اور ہاں آئندہ تم مجھ سے کبھی ایسا مت کہنا کہ تمہیں میری عمر لگ جائے' تمہاری عمر لے کر میں جی کر کیا کروں گی' ہمیں جینا ہے تو ایک دوسرے کے ساتھ ایک دوسرے کے لیے۔" میں نے محبت سے چور لہجے میں کہا۔

اور جواباً مجھے دھیرے سے اس کے چومنے کی آواز سنائی دی۔ وہ خمار آلود لہجے میں بولا۔

"میں جلدی سے ٹھیک ہوکر آجاؤں جانو......" میں اس کی اس حرکت سے مارے شرم کے لال ہوگئی اور کہا۔

"یہ کیا حرکت کی ہے تم نے انکل کہاں ہیں؟"

"وہ مجھے فون دے کر کمرے سے باہر چلے گئے ہیں' اچھا ایک بات تو بتاؤ' وعدہ کرو کہ بالکل سچ سچ بتاؤ گی۔" اس نے یکایک سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا......؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا' پتا نہیں وہ کیا پوچھنے والا تھا۔

"رات یہاں اسپتال میں کیا ہوا تھا؟ میری آنکھ کھلی تو کافی افراتفری مچی ہوئی تھی' فائرنگ بھی ہوئی تھی۔"

"تم نے انکل سے نہیں پوچھا' مجھے تو اس بارے میں کوئی علم ہی نہیں ہے۔" میں نے ایک بار پھر جھوٹ بولا۔

"پوچھا تھا وہ کہہ رہے تھے کہ اسپتال میں چند ڈاکو گھس آئے تھے' کیوں کہ پولیس ایک زخمی ڈاکو کو اسپتال لے کر آئی تھی' وہ لوگ اپنے اس زخمی ڈاکو کو پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لیے آئے تھے لیکن بدقسمتی سے ان کا زخمی ساتھی ہی پولیس یا ان کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔" حشام نے کہا۔

"ایسا ہی ہوا ہوگا' تمہیں ایسا کیوں لگا کہ انکل نے تم سے غلط بیانی کی ہے اور تم مجھ سے اس کی تصدیق کررہے ہو؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے کہا اور تب ہی مجھے انکل کی آواز سنائی دی وہ طلال سے فون مانگ رہے تھے' تب حشام نے مجھے اللہ حافظ کہا اور فون بند کردیا۔

ابھی تک حشام کو اس سارے معاملے کا پتا نہیں تھا یا کم از کم ہم سب تو یہی سمجھ رہے تھے کہ حشام ابھی تک یہی سمجھ رہا ہے کہ اسے اتفاقیہ گولیاں لگی ہیں لیکن حشام کی اس بات سے کہ اس نے انکل کی بات کا یقین کیا ہے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کردیا تھا کہ ہم غلط سمجھ رہے ہیں' حشام کو اصل حالات کا بخوبی علم ہے' ایسا کیسے ہوا یا وہ کس طرح سارے معاملے کی تہہ تک پہنچا' یہ تو وہ خود ہی بتاسکتا تھا۔ اس بارے میں بھی مجھے انکل سے بات کرلی تھی۔

اسی رات سارے نیوز چینل پر ایک پروگرام میں انکل کو بھی مدعو کیا گیا اور ان سے حشام کے بارے میں کریدنے کی کوشش کی۔ انکل نے بہت محتاط ہوکر گفتگو کی اور اپنے آپ کو اس سارے معاملے سے لاعلم ظاہر کیا' اینکر نے زور دے کر کہا کہ "حشام کو اسپتال میں

کیوں جان سے مارنے کی کوشش کی' آپ بھی ایک منجھے ہوئے صحافی ہیں اور ناممکن ہے کہ آپ کو پتا نہ ہو کہ کون لوگ ہیں جو حشام کی جان لینا چاہتے ہیں اور کیوں؟"

"حقیقت یہی ہے کہ میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی حشام نے مجھ سے کسی بھی قسم کے اندیشے کو ظاہر کیا تھا اور ویسے بھی آپ فی الحال اس موضوع پر کوئی بات نہ کریں اور نہ ہی میں کرنا چاہتا ہوں اگر کوئی بات ہوگی تو وہ سب کے سامنے آجائے گی۔" انکل نے کہا۔

"اور یہ جو سارے ملک میں صحافی برادری کی جانب سے مظاہرے ہورہے ہیں' ان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔" اینکر نے پوچھا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ان مظاہروں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہونے والا' سوائے اپنے اور دوسروں کے وقت کے ضیاع کے۔ ارباب اختیار اپنی آنکھیں اور کان بند کیے حکومت چلا رہے ہیں' روز لوگ مررہے ہیں' مارے جارہے ہیں۔ آئے دن کے فسادات' ہنگامے لوٹ مار غرض کہ کیا نہیں ہورہا۔ آپ مجھے بتائیے حکومت کی جانب سے اس کا کوئی سدباب کیا گیا ہے' نہیں ناں تو بس پھر یہ سب کرنا بے کار ہے۔" انکل نے واشگاف الفاظ میں دلیرانہ لہجے میں کہا۔

اور پھر دیر تک بحث ہوتی رہی اور میں نے اکتا کر ٹی وی آف کردیا' اینکر انکل سے راز اگلوانے میں ناکام رہا تھا۔

۞......☆......۞
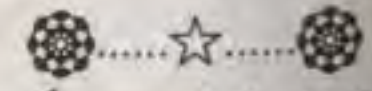
میں جیسے اپنی گاڑی کے فرنٹ ڈور کی جانب بڑھا وہاں میں نے ایک انسانی وجود کو مڑی تڑی حالت میں پڑے ہوئے دیکھا' میرے قدموں کی تیزی کو ایک دم بریک لگ گئے اور میں وہیں رک کر اسے غور سے دیکھنے لگا' سب سے پہلا جو خیال میرے ذہن میں آیا وہ یہی تھا کہ کہیں یہ کوئی لاش تو نہیں۔ کیوں کہ وہ عجیب انداز میں زمین پر پڑا تھا پھر میں یہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ کوئی مرد ہے یا عورت' یہاں بہت ہلکی روشنی تھی' وہ بھی چاند کی۔ میں بہت آہستہ روی سے اس کی جانب بڑھا' مجھے یہ بھی خیال آرہا تھا کہ یہ کہیں بن کہ یہاں نہ لیٹا ہو کہ میں جیسے ہی اس کے نزدیک پہنچوں گا وہ اچانک اٹھ کر میرے اوپر حملہ کردے گا۔ کوئی چور اچکا بھی ہوسکتا ہے۔

آگے بڑھتے ہوئے میں نے ریوالور بھی نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور محتاط اور چوکنے انداز میں آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھنے لگا میں چند قدم چل کر رک جاتا پھر دو قدم آگے بڑھاتا لیکن اس بے حس و بے حرکت وجود میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔

اچانک مجھے اپنے موبائل کا خیال آیا میں نے اس کی ٹارچ آن کی اور اس کی روشنی اس بے حرکت وجود پر ڈالی۔

روشنی میں وہ مجھے صاف دکھائی دینے لگا' وہ ایک مرد تھا' اس کا چہرہ نیچے زمین کی جانب تھا ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ اندر کی جانب مڑی ہوئی تھی اور دوسرا ہاتھ اور ٹانگ پھیلے ہوئے تھے' میں بالکل اس کے نزدیک پہنچ گیا اور جھک کر اچھی طرح اس کا جائزہ لیا پھر ایک ہاتھ سے اسے بالکل سیدھا کردیا وہ پچیس چھبیس سال کا جوان لڑکا تھا۔ جینز کی پینٹ اور گرے ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی' چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی تھی یا صرف شیو بڑھی ہوئی تھی' میرے سیدھا کرنے پر بھی وہ یوں ہی بے سدھ پڑا رہا تب میں نے اس کی کلائی پکڑ کر تھامی اور محسوس کیا کہ اس کی نبض چل رہی ہے وہ زندہ تھا اور صرف بے ہوش تھا۔

میں نے بیٹھ کر موبائل فون کی روشنی میں اس کے جسم کا جائزہ لیا لیکن وہ مجھے کہیں سے زخمی دکھائی نہیں دیا لیکن سر کی جانب جب روشنی کا دائرہ آیا تب میں نے اس کی گردن پر خون لگا ہوا دیکھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے سوچا کہ اس کے سر پر چوٹ لگی ہے اور اسی وجہ سے یہ بے ہوش بھی ہے' میں نے اس کے زخم کا جائزہ لیا' ضرب کسی آہنی شے سے لگائی گئی تھی۔

میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا پھر خیال آیا کہ نہ جانے یہ شخص کون ہے اور کس نے اسے زخمی کرکے یہاں پھینک دیا ہے' مجھے اس سے کیا یہ مرے یا جیئے' مجھے اپنا راستہ ناپنا چاہیے۔

یہی سوچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا لیکن فوراً ہی میرے اندر کا ڈاکٹر شاہ زیب بیدار ہوگیا اور میں دوبارہ اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا' گاڑی سے پانی کی بوتل نکال کر اس کے منہ پر چھینٹے مارے' میری تھوڑی سی کوششوں کے بعد اس کے اندر کسمساہٹ بیدار ہوئی۔

اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں پھر بے ساختہ اس کا ہاتھ اپنے سر پر زخمی مقام پر چلا گیا پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور سسک پڑا' وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔

''اے مسٹر کون ہو تم اور تمہیں کس نے زخمی کیا؟'' میں نے اسے پکارا تو وہ یوں دیدے پھاڑ پھاڑ کر میری جانب دیکھنے لگا جیسے اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا ہو یا پھر اپنے سامنے والے کو پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔

''کون ہو تم اور کس نے تمہیں زخمی کیا ہے؟'' میں نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا تو وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''آ...... آہ...... آپ کون ہیں؟'' اس کے منہ سے کراہ نکل گئی اور اس نے الٹا مجھ سے سوال کرڈالا۔

''بھئی تم میری گاڑی کے پاس بے ہوش پڑے تھے' میں نے انسانی ہمدردی کے تحت تمہیں دیکھا اور رک گیا پھر تمہیں ہوش میں لایا' تمہارا جائزہ لینے سے معلوم ہوا کہ تمہارے سر پر زخم ہے' تمہیں یقیناً کسی سیرے سے زک پہنچائی ہے اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ' ورنہ آج کے دور میں کون کسی کی مدد کرتا ہے' میں اپنے بارے میں کیا بتاؤں یہ سمجھ لیں کہ ستم کا مارا ہوں' کوئی ٹھکانہ نہیں ہے ہر جگہ سے ٹھوکریں مار کر نکال دیا جاتا ہوں' آج بھی میرے ناکردہ جرم کی سزا ملی ہے۔ زندگی تھی شاید اسی لیے آپ نے بچالیا' ورنہ شاید یہیں پڑے پڑے مرجاتا۔'' اس نے آہستہ آہستہ کراہتے ہوئے بتایا۔

''خیر تم اتنے زخمی نہیں ہو کہ تمہاری زندگی کو خطرہ ہو' سر پر معمولی سا زخم ہے جلد ہی ٹھیک ہوجائے گا۔'' یہ کہہ کر میں اٹھ کر اپنی گاڑی کا دروازہ کھولنے لگا تو اس نے لیٹے لیٹے میرا ایک پاؤں پکڑ لیا اور بولا۔

''آپ مجھے اس زخمی حالت میں کیوں چھوڑ کر جارہے ہیں میرے پاس تو نہ کوئی سواری ہے اور نہ کرائے کے پیسے' میں یہاں سے کہاں جاؤں گا' ویسے بھی بھوک اور کمزوری سے میرے اندر ایک قدم بھی چلنے کی سکت نہیں ہے۔''

''اوہ! اچھا تمہیں کچھ رقم چاہیے؟'' میں نے جیب سے اپنا پرس نکالتے ہوئے کہا اور کچھ رقم نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

''یہاں کون سی بسیں چل رہی ہیں جو میں یہاں سے جاؤں گا پلیز ایک مہربانی اور کریں اور مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے چلیں اور آگے کہیں اتار دیجیے گا اوہ...... آہ...... ہائے......'' اس نے کہا اور پھر ہائے ہائے کرنے لگا۔

''کیا مصیبت ہے یار!'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ انگلی پکڑاؤ تو پنجا پکڑ لیتے ہیں۔ اماں یہ مثال دیا کرتی تھیں جو اس موقع پر مجھے یاد آ گئی۔

''کیا سوچ رہے ہیں جناب! میں اس وقت بہت مجبور ہوں اس لیے آپ کی خوشامد کررہا ہوں' ویسے میں بہت کام کا بندہ ہوں' ہوسکتا ہے کبھی آپ کے بھی کسی کام آ جاؤں۔'' اس نے کہا تو میں چونک پڑا۔

''کیا مطلب...... کون ہو تم؟'' میں نے تیزی سے سوال کیا تو وہ ایک بار پھر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر ہائے ہائے کرنے لگا۔

''ہائے ہائے تم بعد میں اطمینان سے کرتے رہنا پہلے تم سیدھی طرح سے میرے سوال کا جواب دو؟'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سر سے ہٹاتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

''کس سوال کا؟'' اس نے بے زار کن لہجے میں کہا۔

''یہی کہ تم کون ہو اور کس نے تمہیں زخمی کس لیے کیا ہے اور وہ بھی اس جگہ پر؟'' میں نے اپنی برچھی نما نگاہیں اس کے اندر اتارتے ہوئے کہا۔

''تو آپ اصل بات جانے بغیر میرا یقین نہیں کریں گے۔'' اس نے ایک گہرا سانس اندر کھینچتے ہوئے کہا۔

''بولنے سے پہلے ایک بات یاد رکھنا کہ میں کوئی جھوٹی کہانی نہیں صرف سچ جاننا چاہتا ہوں اور یہ بھی بتادوں کہ میں سچ اور جھوٹ میں فرق کرنا جانتا ہوں۔'' میرے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ لمحہ بھر کو اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا مگر فوراً ہی وہ نارمل ہوگیا اور بولا۔

''کیا یہیں زمین پر پڑے پڑے اپنی کہانی سنادوں' مہربانی کریں اور مجھے سہارا دے کر اپنی گاڑی میں بٹھالیں پھر وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو سب کچھ سچ سچ بتادوں گا۔'' اس نے کہا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے ایک ہاتھ کو میرے کاندھے پر رکھ کر اپنے جسم کا پورا وزن ڈال کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو ناچار میں نے بھی اسے سہارا دے دیا' وہ مزے سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور پشت گاہ سے سر ٹکا کر بولا۔

''اپنے تجربے سے میں ایک بات تو سیکھ گیا ہوں کبھی بھی بندہ یہ محبت شوہبت کے چکر میں نہ پڑے' سوائے خواری کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔''

''کیوں ایسا کیا ہوگیا تمہارے ساتھ؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی محبت اور کیا...... میں تو کر بھی نہیں رہا تھا وہی میرے پیچھے پڑی تھی' یہ لمبے لمبے لولیٹر لکھتی تھی' میں اسے سمجھاتا کہ بھائی معاف کردے میں بے کار بے روزگار بندہ ہوں کوئی گھر ٹھکانہ بھی نہیں' مجھ سے محبت کرکے تجھے کچھ نہیں ملنے والا لیکن وہ تو میری خاطر جان دینے کو تیار ہوگئی۔ دھمکی دے ڈالی کہ اگر تُو نے میری محبت کا جواب محبت سے نہ دیا اور مجھ سے شادی نہ کی تو میں پیٹرول پی کر اپنی جان دے دوں گی' میں نے کہا واہ بھئی واہ تیری تو بڑی شان ہے' جان بھی دے گی تو پیٹرول پی کے۔ ارے کوئی سستی سی چیز پی لے' اس پر وہ ناراض ہوگئی اور کہہ گئی کہ کل جب محلے کی مسجد میں میرے جنازے کا اعلان ہوگا تب تجھے میری محبت کا یقین آئے گا۔

اور صاحب پھر پتا ہے کیا ہوا؟'' وہ بہت جذباتی انداز میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور بولا۔

''دوسرے دن میں نے اس کے گھر کے دروازے پر ایدھی کی ایمبولینس کو کھڑے دیکھا' محلے کے بہت سے لوگوں کے ساتھ میں بھی پتا کرنے چلا گیا تو معلوم ہوا کہ ''خوشبو'' نے کیڑے مار دوا پی کے خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے' میرے تو چھکے چھوٹ گئے۔ ابے لے یہ تو سچ مچ مرنے چلی تھی' اسے اسپتال لے گئے پھر ڈاکٹروں نے اس کا معدہ صاف کیا وہ زندہ بچ گئی۔''

''تم نے اس سے محبت کیوں نہیں کی' کیا وہ خوب صورت نہیں تھی یا پھر تم کہیں اور......؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا' اس کی گفتگو کے متن سے زیادہ اس کا انداز بیان بڑا دلچسپ تھا۔

''کیا بات کردی آپ نے؟'' اس نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔ ''ارے اس کے حسن کے آگے کیا مادھوری اور کیا ریکھا...... سب ہی اس کے آگے پانی بھرتی دکھائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیتی ہیں۔ مجھے تو اس کے خونخوار قسم کے پہلوان نما چار چار بھائیوں سے ڈر لگتا تھا۔ اگر انہیں ذرا بھی اس بات کی بھنک پڑ جاتی کہ میں نے ان کی لاڈلی اور چہیتی بہن کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھا ہے تو وہ چاروں ہاتھی مجھے منٹوں میں چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیتے اور پھر اپنے اسی خدشے کا اظہار اس کے سامنے کیا تو وہ بُری طرح ہنسنے لگی اور میرا مذاق اڑانے لگی پھر طعنوں پر اتر آئی کہ تم بہت بزدل ہو اور اس قابل نہیں ہو کہ کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑ سکو۔ بس صاحب پھر کیا تھا میں اپنی مردانگی پر یہ طعنہ برداشت نہیں کر سکا اور سینہ تان کر کہا "میری بلو میں بزدل نہیں ہوں، بس ذرا محتاط ہوں ابھی تو میرے سہرے کے پھول بھی نہیں کھلے دنیا بھی نہیں دیکھی بھری جوانی میں بجائے محبوبہ کے موت کو گلے لگاتے ہوئے کچھ عجیب سا لگتا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے اگر تو بہادر ہے اور تجھے میرے بھائیوں سے ڈر بھی لگتا ہے تو لے پکڑ میرا ہاتھ اور مجھے بھگا کے لے چل۔" اس نے کہا۔

"اری کہاں بھگا کے لے جاؤں؟" میں نے احتجاجاً کہا۔

"کہیں بھی لے چل دنیا بہت بڑی ہے، ہم دونوں کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے اور کسی بنگلے میں نوکری کرلیں گے تو کھانے پکانے کا کام سنبھال لینا اور میں صفائی ستھرائی کا۔" بس ہم نے دنیا والوں کی آنکھوں میں مٹی جھونکی اور بھاگ نکلے۔ ہم نے اسٹیشن پر لاہور کے ٹکٹ لیے، پتا چلا کہ ٹرین تو صبح چھ بجے چلے گی اتنی دیر ہم کہاں گزارتے، وقت گزاری کے لیے یہاں آگئے۔ مزے سے بیٹھے بھٹہ کھا رہے تھے کہ اچانک میرے سر پر ایک زوردار دھماکا ہوا اور آنکھ کھلی تو میں یہاں پڑا تھا اور آپ سامنے تھے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان منحوس پہلوانوں کو یہ خبر مل گئی تھی کہ ہم یہاں آگئے ہیں انہوں نے مجھے زخمی کیا، زخمی کیا کیا انہوں نے مجھے یقیناً جان سے مارنے کی کوشش کی ہوگی اور میں ان کے ایک ہی وار میں اتنا غفیل ہوگیا تھا اس لیے وہ مجھے مردہ سمجھ کر یہاں اندھیرے میں پھینک کر میری خوشبو کو لے کر چلے گئے۔"

اس نے اپنی دلچسپ کہانی ختم کی اور میری جانب دیکھنے لگا، میرا دل کبھی اس کی کہانی کا یقین کرنے لگتا، کبھی لگتا یہ کوئی بہت ہی شاطر آدمی ہے، صاف جھوٹ بول رہا ہے۔

"کہانی تو تم نے بہت دلچسپ سنائی ہے لیکن بیٹا مجھے تمہارے ایک لفظ کا بھی یقین نہیں آیا ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر یقین نہیں آیا تو ابھی اسی وقت منظور کالونی کے مکان نمبر...... میں چلے جائیں۔" اس نے مجھے نمبر بتاتے ہوئے کہا "اور وہاں جا کر خوشبو کو آواز دیدیں جواب میں وہ چاروں پہلوان باہر نکل آئیں گے اور آپ کی اچھی خاصی خاطر تواضع بھی کردیں گے اور اگر ان کی خاطر تواضع سے مطمئن نہ ہوں تو میرا نام لے لیجیے گا۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے اپنی مسکراہٹ کو لبوں میں دباتے ہوئے پوچھا۔

"دلارے...... پوچھیے گا، دلارے کہاں ہے؟ بس پھر وہ آپ کو میرا مکمل پتا بتا دیں گے۔" اس نے جلتے لہجے میں کہا اور میں نے ایک ہلکے سے قہقہے کے ساتھ گاڑی اسٹارٹ کردی اور پھر میں اسے اپنے ساتھ گلشن والے فلیٹ میں لے آیا۔

۞......☆......۞

سفیان نے عشاء کی نماز سے فارغ ہوکر جائے نماز سمیٹ کر ریک میں رکھی اور اوپر دیوار میں لگے بک شیلف سے وہ چھوٹا سا قرآن کریم کا نسخہ نکال لیا جسے وہ ہر وقت گھر سے باہر جاتے ہوئے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ گھر واپس آتا تو وہ شیلف کی زینت بن جاتا۔ اس نے اپنے بچپن کی اس نعمت کو ہمیشہ کے لیے گرہ میں باندھ لیا تھا جو اس کے استاد قاری منظم نے کی تھی، انہوں نے کہا تھا۔

"بیٹا الحمدللہ! آج تم نے سارا قرآن پاک پڑھنا سیکھ لیا ہے، لیکن اسے ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر بھول مت جانا، روز اس کی تلاوت ضرور کرنا اور اگر ہو سکے تو اسے ترجمہ کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کرنا تاکہ تم یہ بات جان سکو کہ تمہارا اللہ تمہیں کیسا مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔ تمہارے لیے زندگی گزارنے کے لیے اس نے کون کون سے اصول وضع کیے ہیں۔ کیا حرام کیا ہے اور کیا حلال؟ اور وہ کون سے اعمال ہیں جو تمہیں آخرت کی فلاح نصیب کریں گے۔"

گھر سے باہر تو نہیں البتہ جب بھی اس کے پاس وقت ہوتا وہ قرآن پاک ترجمہ کے ساتھ پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا۔

اس وقت بھی اس نے قرآن کو ترجمہ کے ساتھ پڑھا اور پھر سونے کے لیے بستر پر لیٹ گیا وہ سوچنے لگا۔

یا اللہ ہماری نوجوان نسل مذہب اور قرآن سے دور ہوکر کہاں پہنچ گئی ہے اے مالک! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بھٹکتے ہوئے کہیں اتنی دور نکل جائیں کہ واپسی ممکن ہی نہ ہو۔

اپنے ملک کی بگڑتی ہوئی صورت حال سے وہ بے حد پریشان اور دل گرفتہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں آپس میں دست و گریباں ہونے اور ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے کے بجائے ان طاغوتی طاقتوں کی گرفت سے نکلنے کی کوششیں کرنی چاہئیں اور نہ صرف ہمیں ان طاغوتی طاقتوں کی گرفت سے نکلنا ہے بلکہ انہیں نیست و نابود بھی کرنا ہے اور اس میں ہماری بقاء ہے، یہودی اور صیہونی قومیں اپنے ہر ہر حربے سے ہمیں اسلام سے دور لے جا رہی ہیں۔ ایسی ہی باتیں سوچتا ہوا وہ نیند کی وادی میں اتر گیا۔

سفیان کے والد محکمہ پولیس میں حوالدار تھے، ایک پولیس مقابلے میں ان کے بازو میں گولی لگی اور زخم اتنا کاری تھا کہ انہیں اپنے ایک ہاتھ سے محروم ہونا پڑا، اس وقت سفیان کی عمر چھ سال تھی وہ جہلم کے قریب ایک گاؤں میں رہائش پذیر تھے۔

ایک ہاتھ سے محروم ہوجانے کے بعد انہیں محکمہ نے فارغ کردیا لیکن اس بہادر انسان نے کبھی بھی اپنی اس معذوری کا کسی کو احساس نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنی آنکھوں میں کبھی نہ مٹنے والی چمک لیے صبح سے شام تک کھیتی باڑی میں مصروف رہتے۔ سفیان سے چھوٹی ایک بہن تھی، نام تو اس کا سفینہ تھا لیکن اس کی بھنجی آنکھوں کی وجہ سے سفیان ہمیشہ اسے مانو بلی کہہ کر چھیڑتا رہتا تھا۔

بابا کی ایک ہی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ان کی جگہ سنبھال لے لیکن ایک ایمان دار پولیس آفیسر کو محکمہ کے لوگ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ حوالدار رضوان نے دن رات یہی دیکھا تھا کہ یہاں انصاف نہیں ہے، بڑا اور پیسے والا آدمی چاہے کتنے ہی جرائم کرلے، پولیس اپنا حصہ وصول کر کے اسے پلٹ کر دیکھتی بھی نہیں بلکہ ایسے کئی لوگ تھے جو باقاعدہ ماہانہ رقم بھجواتے تھے اور پولیس اطمینان سے ان کی جانب سے آنکھیں بند کر لیتی اور جو غریب ان کی جیب گرم نہ کرسکنے کی سکت رکھتا، اس کی کوئی دادرسی نہ ہوتی بلکہ شکایت لے کر آنے والے کو بغیر کسی وجہ کے کوئی بھی الزام لگا کر لاک اپ میں ڈال دیا جاتا۔ یوں لامحالہ اسے رشوت دے کر اسے برائی کے خلاف جہاد کرنا ہے اور ایسے محکمہ کا انتخاب کرنا ہے جہاں رہ کر اسے بہتر سپورٹ ملے اور وہ کچھ بہتر کام کرسکے۔

وہ دل لگا کر دن رات محنت کر کے تعلیم حاصل کر رہا تھا اس نے خفیہ ایجنسی میں ملازمت حاصل کی۔ اسے یاد تھا کہ اسے آنے والی مشکلات، زندگی کے خطرے اور پکڑے جانے کی صورت میں انتہائی تشدد سے ڈرایا گیا کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ اس ادارے کے لیے کام

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرنے والا محض ایک وقتی جنون میں مبتلا ہو کر یہاں آیا ہے تو وہ بلیک آوٹ ہو جاتے لیکن جب انہوں نے سفیان کی ثابت قدمی کو دیکھا تو سمجھ لیا کہ وہ وقتی جنون کا شکار نہیں ہے بلکہ اپنے وطن کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو دل کی گہرائیوں سے تیار ہے۔

پھر اس کا تربیتی پیریڈ شروع ہو گیا' یہ پیریڈ چھ ماہ مقرر کیا گیا تربیت کے دوران بے پناہ جسمانی مشقت' جوڈو کراٹے کے علاوہ اگر دشمن کے نرغے میں پھنس جائے تو کسی طرح خود کو اس جال سے نکالے' کسی بھی مشکل مرحلے پر فوری اور بہترین فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور ہر طرح کے ماحول میں خود کو ڈھالنے کی تربیت دی گئی۔

جس دن وہ اپنی کامیابی کا پروانہ لے کر اپنے گاؤں آیا اور سارا گاؤں اس کے بابا کو مبارک باد دینے کے لیے امڈ آیا۔ اسے دیکھ کے بابا کی آنکھوں کی چمک دوچند ہو گئی۔ انہوں نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا اور ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں اور بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بیٹا میں چاہتا ہوں کہ جو کام میں اپنے ملک کے لیے نہ کر سکا وہ تم کرو۔''

اندر بڑے سے صحن میں گھنے درخت کی چھاؤں تلے چارپائی پر اس کی بے بے بیٹھی تھیں اور ان کے قریب اپنی کنجی آنکھوں میں ڈھیر ساری چمک لیے سفینہ موجود تھی۔

سفیان تقریباً بھاگتا ہوا بے بے کے نزدیک گیا اور ان کے ممتا بھرے سینے سے لگ گیا۔ ماں کے سینے سے لگ کر وہ اپنی ٹریننگ کی ساری سختیاں بھول گیا' سفر کی ساری کلفت مٹ گئی۔

''میرا شیر پتر......'' بے بے نے محبت سے کہتے ہوئے اس کا ماتھا چوم لیا۔

بے بے سے فارغ ہوا تو قریب کھڑی سفینہ کے سر پر پیار سے ایک چپت لگاتے ہوئے کہا۔

''ارے! یہ تو سچ مچ مانو بلی بن گئی ہے' ہیں ناں بے بے! اس کی شکل گاؤں میں پھرنے والی بلیوں جیسی ہو گئی ہے۔''

''خوں......خوں......'' سفینہ نے برا مانتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کے پنجے اس کی جانب بڑھائے اور بولی۔

''بچ کے رہنا بھیا! بلی پنجہ بہت زور سے مارتی ہے۔''

''چل اب میرے پتر نوں زیادہ تنگ نہ کر' شربت بنا لائیں۔'' بے بے نے پیار بھرے لہجے میں سفینہ کو گھرکا تو سفیان نے جھٹ اسے گلے سے لگا لیا اور اس کے سر پر بوسہ دیتے ہوئے بولا۔

''اسے نہ ڈانٹا کر بے بے! سارے پرائے گھر جانا ہے۔''

''میں نے نہیں جانا۔'' سفینہ منہ چڑاتی اور انگوٹھا دکھاتی وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی تو سب کا مشترکہ قہقہہ گونج اٹھا۔

سفیان اپنے گاؤں پندرہ دنوں کے لیے آیا تھا پھر اسے کراچی واپس جانا تھا شام کو ماما عنایت کے تمام گھر والے اس سے ملنے کے لیے آ چکے تھے لیکن وہ نہیں آئی تھی' جس کی دید کی آس سفیان کی آنکھوں میں تھی۔

وہ غزالہ تھی' سفیان کی بچپن کی منگ اور اس کی محبت۔ وہ ماما کے گھر آیا تو سامنے ہی غزالہ دکھائی دے گئی۔ وہ گلابی رنگ کے سوٹ میں گلاب کی کوئی ادھ کھلی کلی دکھائی دے رہی تھی۔ سفیان کی آنکھوں میں تراوٹ اتر آئی' ایک تازگی کا احساس ہوا اور یہ احساس اس کے روئیں روئیں میں سما گیا۔

''کیسی ہو غزالہ!'' وہ بے خودی کی کیفیت میں اس کے قریب چلا آیا۔

گلابی دوپٹے کے ہالے میں اس کا چاند چہرہ جگمگا رہا تھا' نگاہیں نیچی کیے اور دوپٹے کے کونے کو اپنی مخروطی اور حنائی انگلیوں میں لپیٹے ہوئے وہ خاموش رہی' تیز تیز

چلتی ہوئی سانسیں یہ پیغام دے رہی تھیں کہ اس کے دل کی دنیا اتھل پتھل ہو رہی ہے اور لرزتے ہوئے ہاتھوں کو قابو میں کرنے کے لیے وہ دوپٹے کے پلو پر ستم آزمائی کر رہی تھی۔ لبوں کے گوشے پھڑپھڑا رہے تھے لیکن زبان حال دل کہنے سے قاصر تھی اس کا سر مزید کچھ اور جھک گیا۔

جواب کا منتظر سفیان دیر تک محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر بہت نرمی آہستگی سے اس نے اپنا ایک ہاتھ غزالہ کے لرزتے ہوئے ہاتھوں پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے ایک انگلی کو آہستہ سے اس کی تھوڑی پر ٹکا کر اس کے جھکے ہوئے سر کو اوپر اٹھایا اور پھر اپنا سوال دہرایا۔

''میں نے پوچھا ہے کیسی ہو؟ مجھے یاد کیا تھا؟''

''اس سوال کا جواب تو آپ خود سے پوچھیں۔'' اس نے لمحہ بھر کو اپنی سنہری دبیز پلکوں کی جھالر اوپر اٹھائی اور پھر گرا لی۔

سفیان کو اس کی آنکھوں میں نمکین پانی ہلکورے لیتا دکھائی دیا۔ اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

''ارے یہ کیا؟''

''خوشی کے ہیں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''اور دکھ کے بھی......''

''کون سے دکھ کے؟'' سفیان نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہی کہ آپ پندرہ دن بعد پھر چلے جائیں گے لمبے عرصے کے لیے اور پھر میں کیا کروں گی۔'' اس کے منہ سے سسکی سی نکل گئی۔

''ابھی تو آیا ہوں غزالہ! ملن کی بات کرو' محبت کی' پیار کی' ابھی جدائی کہاں اور پھر وہ جدائی بھی تو عارضی ہے۔ سفینہ کو اس کے گھر بار کا کرتے ہی بے بے تمہیں ہمیشہ کے لیے گھر لے آئیں گی۔'' اس نے غزالہ کے لرزتے ہاتھوں پر اپنے گرم ہاتھوں کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

''اور کتنا انتظار کروں۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''کیوں! بہت جلدی ہے میری بانہوں میں آنے کی' میرے سینے میں سمانے کی اور......اور......'' اس نے شوخ لہجے میں کہا اور اس سے پہلے کہ وہ اور بے باک ہوتا اچانک اندر کمرے سے مامی سکینہ یہ کہتے ہوئے نکل آئیں۔

''سفیان پتر آیا ہے' آجا اندر آجا' باہر کیوں کھڑا ہے۔'' اور سفیان غزالہ کے سرخ ہوتے چہرے پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے مامی کے ساتھ اندر کمرے میں چلا گیا۔

پتا ہی نہیں چلا کہ وہ پندرہ دن کس طرح پر لگا کر اڑ گئے اور اس کی واپسی کا دن آ گیا۔

وہ ڈھیر ساری دعائیں' کپکپاتے لبوں سے سسکتا ہوا الوداع اور غزالہ کے آنسو اپنے رومال میں سمیٹ کر کراچی آ گیا۔

کراچی آ کر اس نے ہیڈ کوارٹر میں جوائننگ رپورٹ دی' یہاں آ کر اسے معلوم ہوا کہ اس کا باس کرنل احتشام ایک بہت سخت مزاج کا انسان ہے' نرم گفتاری کیا ہوتی ہے وہ یہ بات جانتا ہی نہیں ہے۔ زیادہ تر لوگ اس کا سامنا کرنے سے کتراتے تھے خصوصاً ہر بلاک کے آپریشن انچارج کی تو جان پر بن جاتی تھی۔

بہت سی سنی سنائی باتوں کی وجہ سے وہ بھی دل ہی دل میں اس سے خوف کھانے لگا۔

اس روز جب اسے انٹر کام پر کرنل احتشام کے سامنے پیش ہونے کا حکم ملا تو اسے اپنے ہاتھ پیروں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے لکڑی کی جس کرسی پر وہ بیٹھا تھا یکایک اس میں مقناطیسی لہر دوڑنے لگی' جس نے اس کے ایک ایک عضو کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا ہو' اپنے اندر بہت ہمت پیدا کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اس نے خود ہی اپنے آپ کو تسلی دی کہ آج نہیں تو کل اسے کرنل کا سامنا کرنا ہی تھا' اس سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ملاقات کیے بغیر اس کا کام کیسے ہوتا۔

چل بیٹا سفیان تیار ہو جا' اس نے اپنے شانے کو تھپتھپایا اور سامنے لگے ہوئے بڑے سے گلاس میں اپنے چہرے کی اڑتی ہوئی رنگت کا نظارہ کیا پھر سامنے پڑے پانی کے بھرے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور دو ہی سانسوں میں اپنے اندر انڈیل لیا۔ پانی پیتے ہی اسے حواس بجا ہوتے دکھائی دیئے۔

اپنے سر پر کیپ ٹھیک طریقے سے جمائی' ہولسٹر میں رکھے ریوالور کو تھپتھپایا اور اپنے قدموں میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا جب تک وہ کرنل احتشام کے کمرے کے دروازے پر پہنچا تو خود کو کافی حد تک پرسکون محسوس کر رہا تھا۔

دروازے کے باہر موجود دونوں گارڈز کی ریکویسٹ پر اس نے ہولسٹر سے اپنا ریوالور نکال کر ان کے حوالے کر دیا اور خود خاصے پُراعتماد انداز میں اندر داخل ہو گیا۔

اندر ایک بہت بڑی ساری میز کے پیچھے رکھی گھومنے والی کرسی پر کرنل احتشام اس کا منتظر تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کے لبوں پر ایک خیر مقدمی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

سفیان نے دونوں ایڑیاں بجا کر کرنل احتشام کو زور دار سلوٹ کیا۔

''خوش آمدید مسٹر سفیان!'' کرنل احتشام نے خوش گوار لہجے میں کہا اور سامنے رکھی ہوئی کرسی پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''تھینک یو سر!'' اس نے نیاز مندی سے سر کو ہلکے سے خم کے ساتھ کہا اور کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔

''میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا تم خود کیوں نہیں آئے مجھ سے ملنے کے لیے۔'' کرنل احتشام نے اس کی جانب جھکتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''سوری سر!'' اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

''بے شک مجھے آنا چاہیے تھا لیکن یہاں آ کر میں نے سنا کہ آپ خوامخواہ بلا ضرورت کسی سے بھی ملنا پسند نہیں کرتے ہیں' سو اسی لیے آپ کے بلاوے کا منتظر رہا۔'' اس کی تمام تر خود اعتمادی لوٹ آئی تھی' اس لیے اس نے بنا کسی لگی لپٹی کے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''ہوں!'' کرنل نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے ایک گہری ہنکاری بھری اور بولا۔

''مجھے تمہاری صاف گوئی پسند آئی جوان! انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیے' صاف گو اور کھرا۔ میں بھی ایسا ہی ہوں شاید اسی بناء پر لوگ مجھے زیادہ پسند نہیں کرتے۔'' سفیان نے کرنل کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور خاموش رہا' کرنل نے چند لمحے اس کے کسی جواب کا انتظار کیا پھر بولا۔

''میرا خیال ہے اب ہمیں کام کی بات کر لینی چاہیے۔'' اور اس کے ساتھ ہی وہ اسے اس کے پہلے مشن کے بارے میں بتانے لگا۔ سفیان بہت توجہ اور غور سے اس کی ساری باتیں اور احکامات سنتا رہا اور گردن ہلاتا رہا۔

کرنل کی بات مکمل ہوئی تو سفیان نے اسے یقین دلایا کہ وہ کرنل کی امیدوں پر پورا اترنے کے لیے اپنی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

اس مشن پر کرنل نے اس کے ساتھ چار جوان کی ڈیوٹی لگائی اور ان کے نام اسے بتانے لگا۔ سفیان نے کمرے سے نکلنے سے پہلے کرنل کو سیلوٹ کیا اور باہر آ گیا۔

❀......☆......❀
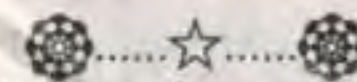
آگے کے کئی دن سکون سے گزر گئے اور کوئی نیا واقعہ نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ حشام کے روم کی سیکورٹی مزید سخت کر دی گئی۔ میں بھی بیماری کا بہانہ کر کے حشام سے نہیں ملی اور اسپتال نہیں گئی پھر طلال انکل کا فون آیا کہ کرنل مشتاق آ رہے ہیں اور میرے گھر آ جاؤ تو میں آصف کے ہمراہ طلال انکل کے گھر پہنچ گئی۔

میں وہاں پہنچی تو کرنل مشتاق وہاں پہنچ چکے تھے' حسب معمول دونوں لائبریری میں تھے۔ میں نے چند لمحے رک کر آنٹی سے علیک سلیک کی اور ان سے معذرت کرنے کے بعد اوپر طلال انکل کی اسٹڈی میں پہنچ گئی' دروازہ بند تھا میں نے دستک دی تو انکل کی آواز آئی۔

''آ جاؤ سر مئی بیٹا......!''

''السلام علیکم!'' میں نے دونوں کو ایک ساتھ سلام کیا تو دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ دونوں کے چہرے مجھے بہت پُرجوش دکھائی دیئے' اندر داخل ہو کر اپنے پیچھے دروازے کو بند کر کے میں پلٹی اور کہا۔

''انکل! آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں آئی ہوں۔''

''میں تمہاری دستک پہچانتا ہوں اور ویسے بھی تمہارے علاوہ اس دروازے پر صرف روشن خان ہی دستک دیتا ہے' وہ بھی اس وقت جب وہ چائے لے کر آتا ہے اور اس کے دستک دینے کا انداز تم سے مختلف ہے۔'' انکل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آؤ بیٹھو بھئی' ہم تو بڑی بے قراری سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔'' کرنل مشتاق نے کہا۔

''کیوں خیریت ہے سب؟'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بھئی سب خیریت ہے' بہت سی اہم باتیں تمہیں بتانا ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''اور وہ یقیناً حماد سے آپ کو معلوم ہوئی ہوں گی۔'' میں نے کہا۔

''تم بہت ذہین ہو۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں اس میں ذہین ہونے کی کوئی بات نہیں ہے' حماد کو آپ نے مہمان نوازی کرنے کے لیے تو نہیں اٹھایا تھا' بہت کچھ اگلوایا ہوگا۔'' میں نے کہا تو ان کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

''ہاں تو کیا بتایا اس نے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''لیکن نہیں۔'' میں نے تیزی سے کہا تو دونوں چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔ ''آپ شروع سے مجھے سب کچھ بتائیں کہ اسے کس طرح اور کہاں سے اٹھایا تھا اور اس نے کس طرح سے سچائی کو اگلا؟''

''اچھا تو تمہیں سب کچھ ہی سننا ہے' میرا خیال ہے اسے رہنے ہی دو' تمہارے لیے یہ باتیں غیر ضروری ہیں اور بلاوجہ انہیں دہرانے میں ٹائم ضائع ہی ہوگا۔'' کرنل مشتاق نے کہا۔

''یوں کہیں ناں انکل کہ آپ یہ باتیں ہم سے شیئر نہیں کرنا چاہتے۔'' میں نے منہ پھلا کر کہا۔

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا تو میں نے مزید ضد نہیں کی' میں خاموش رہی تو طلال انکل بولے۔

''ناراض ہو۔''

''نہیں تو انکل!'' میں نے جلدی سے کہا پھر کرنل مشتاق سے کہا۔ ''ہاں تو بتائیے کہ حماد نے کیا بتایا؟''

''پہلے تو اس نے کچھ بھی بتانے سے صاف انکار کر دیا' میرا مطلب ہے کہ وہ مکمل طور پر ساری باتوں کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا رہا لیکن جب اس کی خاطر تواضع کی گئی تو وہ فر فر بولنے لگا۔'' کرنل مشتاق نے کہا۔

''کیا آپ لوگوں نے اسے مارا پیٹا ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''یہ تو ٹھیک نہیں ہوا' ابھی تو رمضانی صاحب کے بارے میں پتا چلا ہے کہ انہیں اغواء کر لیا گیا تھا اب یہ حماد والا معاملہ لوگوں کے سامنے آئے گا تو کافی گڑبڑ پیدا ہو سکتی ہے۔''

''ارے نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں ہے' ہمارے کام کرنے کا طریقہ ذرا مختلف ہے' ہم اپنے ملزموں کو جسمانی نہیں بلکہ ذہنی طور پر ٹارچر کرتے ہیں اور پھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

انہیں زیادہ ٹائم اپنے پاس رکھتے بھی نہیں ہیں، ہم نے تو اسے رہا کر بھی دیا اس وقت وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہے۔"

"آپ نے کتنے دن اپنے پاس رکھا تھا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"دو دن۔" کرنل مشتاق نے مختصر جواب دیا۔

"اور آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ان دو دنوں کی اپنے گھر سے غیر حاضری کا اس نے کیا جواز پیش کیا ہوگا۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"جب وہ ہمارے پاس آیا تھا ہم نے اسی وقت اس سے اس کے گھر فون کروا دیا تھا کہ وہ اپنے چینل کے کام کے سلسلے میں ایک دو روز کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے، اس لیے پریشان نہ ہوا جائے، جیسے ہی کام ختم ہوگا وہ لوٹ آئے گا۔"

"وہ آپ کی بات مان کیسے گیا؟" میں نے پوچھا۔

"شاید تم یہ بات نہیں جانتیں کہ اس کی تین جوان بہنیں اور ایک بیوہ ماں ہے، دو بہنیں مقامی گرلز کالج میں پڑھتی ہیں اور سب سے چھوٹی بہن ایک اسکول میں میٹرک کی طالبہ ہے اور اس کی ماں نے انتہائی مشقت سے انہیں پالا ہے۔ اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے، حماد کے جاب کرنے سے پہلے تک تو ان کے گھریلو اور مالی حالات بہت زیادہ خراب تھے لیکن جب سے حماد نے نیوز چینل پر ملازمت کی ہے تو ان کے مالی حالات کافی حد تک بہتر ہو گئے ہیں۔ ایک غیرت مند بھائی کے لیے اس کی جوان بہنوں کو آسانی سے اغواء کرنے کا کہنا ہی کافی ہوتا ہے۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔" میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اور تم اس بات سے بھی قطعی بے فکر رہو کہ اسے یہ کبھی بھی معلوم ہو سکے گا کہ اسے کن لوگوں نے اغواء کیا تھا اور اغواء کرنے کے بعد اسے کسی جگہ پر رکھا گیا تھا کیوں کہ اسے بے ہوشی کی حالت میں ہم نے سینٹر پر پہنچایا تھا اور ہمارا کوئی بھی بندہ اپنا چہرہ چھپائے بغیر اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔" کرنل مشتاق نے بتایا تو میں مطمئن ہو گئی پھر بھی ایک خیال کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا اس لیے پوچھا۔

"کرنل صاحب! کیا آپ کو یقین ہے کہ اب وہ کسی سے بھی اپنے اغواء کی کہانی بیان نہیں کرے گا۔"

"بالکل۔" انہوں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"وہ کیسے؟"

"اسے چھوڑتے وقت اچھی طرح یہ باور کرا دیا گیا تھا کہ اس نے اگر اپنی زبان کھولنے کی کوشش کی تو اس کے اسے بہت سنگین نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ اس کی ماں اور بہنیں اس کی کمزوری ہیں اور ہم نے اس کی اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ بھی مجرموں میں شامل ہے لیکن اپنے بارے میں اس نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اسے اپنی بہنوں کی شادی کے لیے ایک ساتھ بہت ساری رقم کی ضرورت تھی اس لیے اس نے ان لوگوں کا ساتھ دیا، دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ......" کرنل مشتاق انکل طلال کی جانب دیکھتے ہوئے کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

"کہیے ناں...... آپ رک کیوں گئے؟" میں نے چونک کر انکل اور کرنل مشتاق کی جانب دیکھا وہ معنی خیز نگاہوں سے طلال انکل کی جانب دیکھ رہے تھے گویا پوچھ رہے ہوں کہ آگے کی بات مجھے بتائی جائے یا نہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ طلال انکل نے ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سر کو آہستگی سے اثبات میں جنبش دی۔

"اس کا کہنا تھا کہ وہ نیوز اینکر سرمئی کو دل ہی دل میں چاہتا تھا لیکن اسے حشام کے علاوہ کوئی اور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے وہ دل سے چاہتا تھا کہ حشام نہ رہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کیا......؟" میرے منہ سے نہایت حیرت سے نکلا۔

"ہوں! اس نے یہ بھی بتایا کہ سرمئی کے آگے بات کرتے ہوئے وہ ہمیشہ جھجکتا رہا ہے نہ جانے کیوں جب وہ سامنے آتی تھی تو وہ اپنی ساری خوداعتمادی بھول جاتا تھا۔"

"میری حیرانی کی وجہ بھی یہی ہے کہ مجھے تو وہ ہمیشہ ہی بہت دبو سا انسان دکھائی دیتا تھا' اینی وے آپ یہ بتائیں کہ اس نے کس کے کہنے پر یہ سب کیا' میرا مطلب ہے کیا کیا؟" میں نے حماد کے عشق سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"شاید تمہیں اندازہ ہو کہ یہ سب اس نے رمضانی صاحب کے کہنے پر کیا ہے' رمضانی صاحب کس کے اشارے پر کام کر رہے ہیں یہ بات اس نے نہیں بتائی لیکن یہ ضرور بتایا کہ رمضانی صاحب کو ان ہی لوگوں نے اٹھایا تھا اور ٹارچر کیا تھا کہ ان کا خیال یہ تھا کہ رمضانی صاحب نے تمہیں یا حشام کو ساری انفارمیشن دے دی ہے جب ہی فوراً ہی اس ریکارڈنگ کی کیسٹ ویڈیو کیمرے سے غائب کر دی گئی اور تمہارے گھر پر سیکورٹی کا سخت انتظام کر دیا گیا ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے جب ہی وہ الٹی سیدھی کہانیاں سنا رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "اچھا اور کیا بتایا اس نے کہ رمضانی صاحب نے اسے کیا بتایا اور کیا کام لیا؟"

"رمضانی صاحب اس کے گھریلو حالات سے اچھی طرح واقف تھے شاید پہلے ہی سے ان کی جان پہچان تھی شاید اس کے والد کے حوالے سے۔"

رمضانی صاحب کو کس حوالے سے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ حشام ایک بہت حساس اور اہم رپورٹ بنا رہا ہے' اسے کسی بھی طرح راستے سے ہٹانا ہے اور اس کی رپورٹ کو ضائع کرنا ہے۔

اتفاق سے وہ سنہرا موقع انہیں جلد ہی مل گیا' انہیں حکم دیا گیا کہ سرمئی کو موقع سے ہٹا کر حشام کو وہاں بھیج دیا جائے گا کہ فائرنگ کی آڑ میں حشام کا کام تمام کیا جا سکے۔ حماد نے سرمئی کو وہاں سے لانے کی ذمہ داری خود لی اور وہ زخمی سرمئی کو لے کر اس کے گھر گیا' اس کو اس بات کا علم تھا کہ حشام کے ساتھ کچھ برا ہونے والا ہے اور اس بات کی اطلاع اسے دے دی گئی کہ حشام فائرنگ کے واقعے میں شدید زخمی ہو گیا ہے اور اس وقت شاید وہ تمہارے ہی گھر تھا پھر وہ تمہیں اپنے ساتھ اسپتال بھی لے کر گیا تھا۔

اسپتال سے اس کے پاس کسی ان نون نمبر سے کال آئی اور اسے پارکنگ میں بلایا تھا' وہ وہاں پہنچا تو اس سے حشام کے بارے میں معلوم کیا گیا پھر اس کی یہ ذمہ داری بھی لگائی کہ وہ جاوید کے ویڈیو کیمرے سے اس سارے واقعے کی ویڈیو کیسٹ بھی فوراً غائب کر کے رمضانی صاحب کے حوالے کر دے کیوں کہ انہیں اس بات کا شک تھا کہ ہو سکتا ہے کہ ویڈیو میں حشام کا براہ راست نشانہ لینے والے کی ویڈیو نہ بن گئی ہو' لیکن کیسٹ غائب ہونے کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ کیسٹ کو جان بوجھ کر وہاں سے غائب کیا گیا ہے اور یہ کام سوائے تمہارے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ یہ بات رمضانی صاحب اور حماد کو معلوم ہو چکی تھی کہ تم اسپتال سے یہ کہہ کر گئی تھیں کہ پیر میں بہت زیادہ تکلیف کی وجہ سے تم ریسٹ کرنے گھر جا رہی ہو' لیکن تم گھر نہیں گئیں بلکہ جاوید کے ساتھ نیوز چینل ذرا دیر کے لیے آئی تھیں۔ رمضانی صاحب اظہار ہمدردی کے لیے کافی دیر طلال کے ساتھ بیٹھے رہے یا پھر وہ کسی بری خبر اور اپنے لیے خوش خبری سننے کے انتظار میں بیٹھے رہے بعد میں تمہارے جانے کے بعد حماد نے انہیں فون کے ذریعے جب ویڈیو کیسٹ غائب کرنے کے حکم کے بارے میں بتایا تو وہ نیوز چینل پہنچ گئے لیکن اللہ کے کرم اور سب کی دعاؤں کے نتیجے میں اللہ نے حشام کی زندگی

بخش دی تو ان لوگوں نے ڈاکٹر ذیشان کو خریدنے کی کوشش کی اور یہاں سے بھی ناکام ہونے کے بعد اس پر قاتلانہ حملہ بھی کروایا۔ تمہیں بھی وہ لوگ راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں' حالاں کہ حشام کا لیپ ٹاپ تو انہوں نے ضائع کر دیا ہے لیکن انہیں یقین ہے کہ حشام کی مرتب کردہ وہ اہم اور حساس رپورٹ یقیناً کہیں اور بھی محفوظ ہو گی۔"

کرنل مشتاق یہ سب بیان کر رہے تھے اور میرے ذہن میں پرانی ساری باتیں ایک ایک کر کے آ رہی تھیں۔ رمضانی صاحب تو اس وقت میری نگاہوں میں مشکوک ہو گئے تھے جب نیوز چینل سے ویڈیو کیسٹ لے جاتے ہوئے میں نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے رمضانی صاحب اور حماد کو ایک ساتھ آتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ حشام کے بارے میں بات کرتے ہوئے آ رہے تھے کہ دیکھو حشام کا کیا ہوتا ہے' مجھے اس لمحے ایسا لگا تھا کہ جیسے وہ نہیں چاہتے کہ حشام زندہ بچے' بعد میں میں نے اپنے اس خیال کو اپنا وہم سمجھ کر اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

لیکن آج ساری بات آئینے کی طرح صاف ہو چکی تھی' حشام پر فائر کرنے والے آدمی کو شمروز بھائی نے میرے نام نہاد باپ نواب سطوت کے پاس آتے ہوئے اور معافی مانگتے اور گڑگڑاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اس بات پر معذرت کر رہا تھا کہ وہ اس صحافی لڑکے کو جان سے مارنے میں ناکام رہا ہے۔

"اس ساری کہانی کو سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس سارے پلان کا ماسٹر مائنڈ نواب سطوت ہے۔" میں نے انتہائی نفرت انگیز اور زہر خند لہجے میں کہا تو طلال انکل اور کرنل مشتاق چونک کر میری جانب دیکھنے لگے کچھ لمحے گمبھیر خاموشی کی نذر ہو گئے تب انکل طلال نے اس خاموشی کو توڑا اور بولے۔

"نہیں۔" انہوں نے پرخیال انداز میں بھاری لہجے میں کہا تو میں نے حیرت سے ان کی جانب دیکھا انہوں نے اس مرتبہ قطعی لہجے میں کہا۔ "نہیں! تمہارا خیال غلط ہے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"ریلیکس بیٹا ریلیکس!" انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ نواب سطوت اس سارے معاملے کا ماسٹر مائنڈ ہے' تمہیں یاد ہے میں نے گزشتہ ملاقات میں بھی تم سے یہی کہا تھا کہ یہ پلان نواب سطوت کا نہیں ہے اور نہ ہی ہمارا اصل مجرم نواب سطوت ہے' اس کے ذریعے تو یہ کام لیا گیا ہے اصل مجرم تو سردار شیر افضل ہے میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا لگتا ہے تم یہ سب بھول گئی ہو۔" انکل کا لہجہ بدستور دھیما اور نرم تھا تب مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔

جو کچھ حماد کی زبانی ہمیں معلوم ہوا ہے تقریباً ان ساری باتوں پر اپنا اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے پہلے بھی ڈسکس کر چکے تھے۔ حماد نے تو صرف ہمارا خیال اور سوچ کی تصدیق کر دی ہے۔ تب میں نے شرمندگی سے کہا۔

"انکل آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں پتا نہیں کیسے یہ سب میرے ذہن سے نکل گیا۔"

"میرا خیال ہے کہ تم حشام کو لے کر بہت زیادہ ڈیپریس رہنے لگی ہو اور پھر دو تین واقعات اوپر تلے تمہارے ساتھ ایسے ہو گئے شاید اس لیے تمہارا ذہن منتشر ہو گیا' میں ایک بار پھر تمہیں یاد دلا دوں بیٹا جی کہ ہم لوگ جس لائن میں ہیں وہاں چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی دھیان میں رکھنا پڑتا ہے اگر اہم اہم باتوں کو بھی بھولنے لگے تو کھرے اور کھوٹے کی پہچان کیسے کریں اور ویسے بھی اب تو ماشاء اللہ حشام بہت تیزی کے ساتھ صحت یاب ہو رہا ہے' تم مطمئن رہو وہ جلد گھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

آئے گا اور ہم سب ایک بار پھر نئے سرے سے اس اہم کام کو انجام دیں گے۔"

"ان شاء اللہ!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تو انکل مسکرانے لگے' کرنل مشتاق اس دوران بالکل خاموشی سے بیٹھے ہماری گفتگو سنتے رہے تھے' بولے۔

"طلال کیا تم مجھے وہ یو ایس بی دے سکتے ہو جس میں تم نے حشام کی بنائی ہوئی وہ رپورٹ سیو کی ہے۔"

"کیوں تم کیا کرو گے؟" انکل نے پوچھا۔

"کیوں کیا میں تمہارے اس مشن میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں' تم شاید بھول رہے ہو کہ میں نے اپنی یہ خفیہ ایجنسی کیوں کھولی ہے اور کمانڈو ٹریننگ کیوں دے رہا ہوں' اسی لیے میرے دوست کہ میں اور تم دونوں یہ بات اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ہمارے اپنے ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والے ہمارے اندر کے لوگ ہیں اور یہی لوگ ہیں جو اونچی مسندوں پر بیٹھے اپنے ملک کا ملک کی معیشت کا اور عوام کا سودا کر رہے ہیں تو پھر ہمارے ملک کی پولیس اتنی جرأت مند تو ہے نہیں کہ ان لوگوں پر ہاتھ ڈال سکے یہ کام بھی ہمیں ہی خفیہ طور پر انجام دینا ہے۔ ہمارا مشن ایسے ہی ملک کے غداروں کا قلع قمع کرنا ہے اور حشام کی مرتب کردہ رپورٹ کی روشنی میں' میں ان سب ملک دشمن عناصر کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" کرنل مشتاق نے تفصیل سے انکل کو جواب دیا' تو طلال انکل کی آنکھوں میں چمک لہرانے لگی۔"

"کیا آپ مجھے ایک ادنیٰ سی کارکن کی حیثیت سے اپنے گروپ میں شامل کریں گے کرنل صاحب؟" میں نے پُرجوش لہجے میں ان کے قریب جا کر کہا۔

"وائے ناٹ بے بی!" جواباً انہوں نے بھی اسی جوش سے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے میں نیوز چینل کی جاب چھوڑ کر صرف آپ لوگوں کے ساتھ منسلک ہو جاتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"نہیں میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہوگا تم اپنی جاب برقرار رکھو یہاں رہ کر تم زیادہ فائدہ حاصل کر سکتی ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں طلال!" کرنل مشتاق نے میری جانب سے رخ پھیر کر انکل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کرنل مشتاق ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" انکل نے ان کی تائید کی تو میں نے انہیں بتا دیا کہ میں رمضانی صاحب کا چینل چھوڑ رہی ہوں' اس پر بھی انکل نے مجھے منع کیا اور کہا کہ اس کی وجہ بھی تمہیں خود سمجھ میں آ جائے گی کہ میں تمہیں کیوں منع کر رہا ہوں۔"

"جیسا آپ کہہ رہے ہیں میں ویسا ہی کروں گی' مجھے تو قدم قدم پر آپ دونوں کی راہ نمائی کی ضرورت ہے' آپ نے صحافت کی دنیا میں ساری عمر گزار دی جب کہ میں تو ابھی طفل مکتب ہوں' آپ کے ساتھ رہ کر میں بہت کچھ سیکھوں گی۔" میں نے انکل کے قریب جا کر کہا تو انہوں نے میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے بہادر بیٹا اور ایک بہادر بیٹی عطا کی ہے حالاں کہ میں تو......" اتنا کہہ کر ان کی آواز بھرا گئی اور وہ خاموش ہو گئے اور میں سمجھ گئی کہ وہ کیا بات کہتے کہتے رک گئے' ان کے دل یقیناً یہ خیال آیا ہوگا کہ وہ تو حشام کے حقیقی باپ نہیں ہیں' میں سوچنے لگی کہ بعض رشتے جو ہم خود سے ایک دوسرے کے ساتھ بنا لیتے ہیں' کتنی مضبوطی اختیار کر لیتے ہیں' ایسی مضبوطی خون کے رشتوں میں بھی نہیں بن پاتی۔ آج ہمارا معاشرہ جس راہ پر چل رہا ہے' وہاں لوگ اپنے حقیقی اور خون کے رشتوں سے بھی وفادار نہیں ہوتے اپنے ذرا سے مادی مفاد کی خاطر انہیں کاٹ رہے ہوتے ہیں' اس کے مقابلے میں غیروں کے ساتھ جوڑے گئے پُرخلوص اور دل کے رشتے کتنے مضبوط اور پائیدار ہوتے

ہیں' جیسے میرا رشتہ اماں اور بابا کے ساتھ۔ طلال انکل کا میرے اور حشام کے ساتھ اور ایک اور نیا رشتہ بھائی کا میرا شمروز بھائی کے ساتھ۔"

شمروز بھائی کا خیال آیا تو میں نے کرنل مشتاق سے کہا کہ آپ شمروز بھائی کو بھی کمانڈو ٹریننگ دیں' وہ بھی ہمارے اس مشن میں ہمارے ساتھ ہیں تب کرنل مشتاق نے مجھ سے شمروز بھائی کے بارے میں پوچھا تو میں نے مختصراً انہیں شمروز بھائی کی کہانی سنا دی اور یہ بھی کہ حادثاتی طور پر وہ نواب سطوت کے پاس پہنچ گئے اور اللہ جانے کس طرح نواب سطوت ان پر اتنا زیادہ اعتبار کرنے لگے ہیں۔

کرنل مشتاق شمروز بھائی کی کہانی سے تھوڑے سے متاثر ہوئے اور بولے۔

"اس سے کہنا کہ مجھ سے آ کر ملے۔" پھر انہوں نے اپنا ایک کارڈ مجھے دیتے ہوئے کہا کہ یہ میں شمروز بھائی کو دے دوں۔ اس کارڈ پر ان کا فون نمبر اور رہائش کا ایڈریس لکھا تھا یہ ایک عام اور سادہ سا کارڈ تھا' جسے میں نے احتیاط کے ساتھ اپنے پرس میں رکھ لیا۔

❀......☆......❀
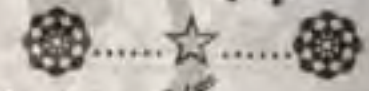
میں نے اپنی کار جیسے ہی گلشن اقبال کے اس پلازہ کے سامنے روکی جہاں میرا فلیٹ تھا تو وہ بُری طرح چونک پڑا اور احمقوں کی مانند آنکھیں پھاڑتے ہوئے بولا۔

"آپ یہاں رہتے ہو؟"

"ہاں! لیکن تمہیں اس پر اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے؟" میں نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

"یہ تو اتنی بڑی بلڈنگ ہے' پھر تو آپ بہت زیادہ امیر آدمی ہوں گے۔" اس نے ایک بار پھر احمقانہ انداز میں آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا۔

"احمق آدمی یہ ساری بلڈنگ میری نہیں ہے' اس میں بہت سارے فلیٹ ہیں اور ایک چھوٹا سا فلیٹ میرا ہے' وہ بھی ذاتی نہیں ہے میں یہاں کرائے پر رہتا ہوں۔" میں نے کہا اور گاڑی کا انجن بند کر کے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور اسے بھی اشارہ کیا کہ وہ بھی باہر آ جائے۔

وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور احمقوں کے انداز میں ادھر اُدھر گردن گھماتے ہوئے دیکھتا ہوا آ رہا تھا' نہ جانے کیوں مجھے اس کا اتنا زیادہ احمقانہ انداز بناوٹی لگ رہا تھا۔ وہ تو اس طرح سے ظاہر کر رہا تھا کہ ابھی نیا نیا کسی دیہات سے وارد ہوا ہو' ایک ایسا دیہاتی جس کی ساری زندگی کسی دیہات میں گزری ہو اور وہ پہلی مرتبہ شہر آیا ہو۔ میں اب صرف یہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ شخص کون ہے اور میری گاڑی کے قریب بے ہوشی کی حالت میں اس کا ملنا اور ضد کر کے میرے ساتھ چلے آنا' ضرور اس میں کوئی راز ہے کیوں کہ اس کے بے سروپا عشق کی کہانی کا میں نے ایک فیصد بھی یقین نہیں کیا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ گلشن اقبال والے اس فلیٹ میں لے کر بھی اسی ارادے سے آیا تھا کہ اطمینان سے اپنے طریقے سے اس کی اصلیت معلوم کروں گا۔

میں سیڑھیوں کے ذریعے تھرڈ فلور پر پہنچا' میں بہت غور سے اس کو واچ کر رہا تھا' وہ ایک خاص انداز میں سیڑھیاں طے کر رہا تھا' عام افراد سے بالکل الگ انداز تھا اور پھر جیسے اسے کوئی خیال آ گیا تو اس نے اپنی چال بدل لی۔ اب تو مجھے پورا پورا یقین ہو گیا کہ یہ شخص اصل میں کوئی اور ہی شخصیت رکھتا ہے اب اس کا ارادہ مجھے جاننا تھا۔

میں سیڑھیاں طے کرتا ہوا فلیٹ کے دروازے پر پہنچا اور جیب سے چابی نکال کر دروازے کا لاک کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ بھی اندر آ گیا تو میں نے دروازہ بند کر کے لاک کر دیا۔

فلیٹ کئی روز سے بند تھا اور ویسے بھی میں نے اس کی صفائی ستھرائی کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا اس لیے کافی گرد و غبار ساری چیزوں پر پڑا ہوا تھا فرنیچر پر بھی کافی گرد جمع تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آیا اور اس سے کہا کہ وہ ایک صوفے پر جا کر سو جائے اور میں دوسرے کمرے میں جہاں بیڈ پڑا تھا جا کر لیٹ گیا۔ میں نے ابھی جوتے بھی نہیں اتارے تھے یوں ہی تھوڑی دیر کے لیے جوتوں سمیت لیٹ گیا تھا یہاں میرے پاس رات کو پہننے کے لیے دوسرا لباس بھی نہیں تھا میں نے اس طرح سوچا ہی نہیں تھا کہ کبھی یہاں رات بھی گزارنی پڑے گی۔ تیسرے کمرے میں صرف فرش پر قالین بچھا تھا اس لیے وہ میرے روم میں کھلے دروازے سے اندر آ گیا اور بولا۔

"بھائی مجھے اتنے نرم بستر پر سونے کی عادت نہیں ہے اگر آپ اجازت دو تو دوسرے کمرے میں زمین پر سو جاؤں۔"

"سو جاؤ۔" میں نے بےزار کن لہجے میں جواب دیا۔

"بھائی لگتا ہے آپ کافی دنوں کے بعد اپنے گھر لوٹے ہو کیوں کہ یہاں کافی ساری مٹی پڑی ہے لگتا ہے کب سے صفائی نہیں ہوئی ہے۔"

"ارے نہیں یار! میں رہتا تو یہیں ہوں لیکن کیوں کہ گھر میں کوئی عورت نہیں ہے اس لیے میں کبھی کبھار مہینے میں ایک بار صفائی کر لیتا ہوں۔ کچن میں برتن وغیرہ بھی زیادہ نہیں ہیں، کھانا بھی ہوٹل سے کھاتا ہوں۔ میں نے کہا۔ وہ تو شکر ہوا کہ روشن آنٹی کے یہاں رہنے کے خیال سے میں نے کچن میں کچھ برتن لا کر رکھ دیئے تھے ورنہ یہ میری بات کا کبھی یقین نہ کرتا۔

"بھائی آپ فکر نہ کرو میں سو کے اٹھ کے سارا گھر جھاڑ پونچھ کر اچھی طرح سے چمکا دوں گا۔" اس نے میرے خاموش ہوتے ہی پُرجوش لہجے میں کہا۔

"اچھا یار ٹھیک ہے تم زیادہ باتیں نہ کرو میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے ساری رات گزر گئی مجھے سونے دو اور تم بھی جا کر سو جاؤ۔" میں نے کہا۔

"سر میں درد ہو رہا ہے۔ ارے بھائی تو مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا، میں بڑا اچھا سر دباتا ہوں، دو منٹ میں سارا درد بھاگ جائے اور آپ کو بڑی اچھی اور گہری نیند آ جائے گی۔" اس نے میرے بیڈ کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"نہیں رہنے دو، مجھے سر دبوانے کی عادت نہیں ہے ٹیبلٹ لے لوں گا اب تم جا کر سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔" مہوش سے ملاقات کے بعد میں ابھی تک ڈسٹرب تھا اور پھر اس کی کہانی سن کر تو میرے اوپر سوچوں اور فکروں کے کئی دروازے کھل گئے تھے اور میں اس بارے میں تنہائی میں بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔

میں بیڈ سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور جوتے اتارنے لگا تو وہ منہ بناتا ہوا میرے کمرے سے باہر نکل گیا اس کے باہر جاتے ہی میں نے روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور لاک کر کے لائٹ آف کر دی اور بیڈ پر لیٹ گیا۔

دلارے کی جاب سے میں بےفکر تھا کہ میں نے دروازہ لاک کر دیا ہے، وہ کہیں نہیں جا سکتا اور پھر اپنا کمرہ بھی لاک کر دیا تھا، وہ مجھے ڈسٹرب بھی نہیں کر سکتا تھا، صبح اٹھ کر اس سے اچھی طرح بات کرنے کا پروگرام تھا اور پھر مہوش کے بارے میں، میں سوچتے ہوئے گہری نیند میں چلا گیا، رات بھر خواب میں مجھے مہوش دکھائی دیتی رہی۔ کبھی وہ مجھے اپنے ساتھ پیار و محبت کے انداز میں دکھائی دیتی تو کبھی مجھے لگتا کہ وہ ایک بھیانک اور طاقت ور جن کی قید میں ہے اور سسکیاں لے لے کر رو رہی ہے، کبھی روتے ہوئے مجھے مدد کے لیے پکار رہی ہے۔

میں پُرسکون ہو کر سو نہ سکا اور ایسے ہی پریشان کن خواب دیکھتا رہا، صبح نو بجے میری آنکھ کھل گئی۔ سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ایک بہت اسٹرانگ سی چائے کی طلب ہو رہی تھی، میں نے واش روم میں جا کر ٹھنڈے پانی سے شاور لیا۔ میری آنکھوں میں سرخی جھلک رہی تھی، نہانے سے سر کا بوجھل پن تھوڑا دور ہو گیا

تھا میں دروازہ کھول کر کمرے سے باہر آیا تو باہر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا ہر شے صاف ستھری تھی اور چمک رہی تھی۔ دلارے مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا، میں سیدھا کچن میں آ گیا۔ چائے کی دلفریب مہک سارے کچن میں پھیلی ہوئی تھی، وہ مجھے کچن میں ہی مل گیا، کچن کی صفائی میں لگا ہوا تھا۔

"دلارے۔" میں نے آواز دی تو اس نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا اور سلام کے بعد بولا۔

"بھائی آپ اٹھ گئے، آپ نے گھر دیکھا میں نے سارا صاف کر دیا۔ اب چائے بنانے کے بعد کچن کی صفائی کر رہا تھا۔ چائے دوں آپ کو......؟" اس نے فخریہ لہجے میں کہا اور چائے کی پیشکش کی۔

"واقعی تم نے تو کمال کر دیا، اتنی جلدی سارا صاف کر دیا کب اٹھے تھے تم؟" میں نے کہا۔

"میں تو صبح سویرے ہی اٹھنے کا عادی ہوں اور ویسے بھی رات بھر بےچینی سی رہی۔ میں غریب ضرور ہوں لیکن صاف ستھرا رہتا ہوں، اسی لیے جلدی اٹھ کر کام سے لگ گیا۔" یہ بات کہتے ہوئے اس نے چائے نکال کر مجھے پیش کر دی اور ناشتے کے لیے پوچھا۔

"وہ تو بازار سے لانا پڑے گا۔" میں چائے کا کپ لے کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اب میں جو آ گیا ہوں آپ کو بازار سے کھانے کی ضرورت نہیں ہے، میں آپ کو اچھے اچھے کھانے بنا کر کھلاؤں گا۔ مجھے بہت طرح کے کھانے بنانے آتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"تم کہیں کام کرتے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"جی بھائی! اُدھر ڈیفنس میں کمال صاحب رہتے ہیں ان کے ہاں ملازم تھا۔ کھانا بناتا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"وہاں سے کام کیوں چھوڑ دیا؟" میں نے اس کی جانب دیکھے بنا بظاہر بےپروائی سے پوچھا۔

"اس بات کو رہنے ہی دیں۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"پھر بھی۔" میں نے اصرار کیا۔

"ان کی بیٹی جو تھی ناں وہ بڑی حسین تھی، مجھے بڑی اچھی لگتی تھی، بس کبھی کبھار اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے تکتا رہتا تھا، بس مجھ سے یہی خطا ہوتی تھی۔ اس نے غصے میں میری شکایت اپنے باپ سے کر دی اور اس نے یہ کہہ کر مجھے نوکری سے نکال دیا کہ تو اپنی اوقات دیکھ، میری بیٹی کو گھورتا رہتا ہے، اب بھلا کوئی اس سے یہ پوچھے کہ اس کی جوان جہان اور حسین بیٹی جو سارے جہان میں ننگے منہ اور ننگے سر پھرتی رہتی تو ہر اوقات اور بےاوقات بندہ اسے دیکھتا ہی ہے اسے دیکھنے کے لیے اس سے اجازت تھوڑی نہ لیتا ہے پر غریب ہونا ہی اس دنیا کا سب سے بڑا جرم ہے، واقعی غریب کی کوئی عزت کوئی اوقات نہیں ہوتی۔" اس نے اداس لہجے میں کہا۔

"ویسے تم خاصے حسن پرست واقع ہوئے ہو۔" میں نے ہلکے سے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بس بھائی!" اس نے شرماتے ہوئے کہا۔ "جوانی بڑی ظالم ہوتی ہے، حسن کس کو اچھا نہیں لگتا۔" پھر بولا۔

"بھائی آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"تمہارے سر کی چوٹ کا کیا حال ہے، زیادہ تکلیف تو نہیں ہے؟" میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"سر میں درد تو ہے لیکن ہلکا ہے آپ بتا رہے تھے کہ آپ ڈاکٹر ہو تو کوئی دوا دے دینا اس درد کی، ختم ہو جائے گا۔" اس نے کہا تو میں خاموش رہا اور بولا۔

"بھائی کچھ پیسے دے دیں تاکہ میں ناشتے اور دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ سامان لے آؤں۔" میں نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا تو وہ معصوم نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں ابھی اجنبی ہوں ناں اس لیے آپ ابھی مجھ پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

یقین نہیں کرو بھائی میں چور یا بے ایمان ہرگز نہیں ہوں ہمیشہ حق حلال کی اور اپنی محنت کی روٹی کھائی ہے ایسا کرو کہ آپ خود میرے ساتھ چلو اور سامان دلا دو۔"

"ایسی بات نہیں ہے دلارے! میں نے کب منع کیا ہے پیسے دینے کے لیے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا پرس نکالا اور ہزار کا نوٹ اسے دیتے ہوئے کہا کہ وہ ضرورت کی چیزیں لے آئے۔

وہ شکریہ کہہ کر پیسے لے کر چلا گیا' پھر فوراً ہی واپس آیا اور بولا۔

"بھائی دروازے کی چابی؟"

"اوہ ہاں! اندر پڑی ہے جا کر اٹھالو۔" میں نے کہا تو وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ چابی اس نے کی ہول میں لگی رہنے دی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آ گیا' ڈھیر سارا سامان لے آیا تھا' ایک پرچے پر سارا حساب لکھا تھا' مجھے دے کر بولا۔

"بھائی سارا حساب اس پر لکھا ہے' بس تھوڑے سے پیسے بچے ہیں۔"

"ٹھیک ہے وہ تم رکھ لو۔" میں نے کہا تو وہ شکریہ کہہ کر کچن میں چلا گیا۔

وہ میرے لیے ناشتہ بنا رہا تھا اور میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا' اس کا رویہ بہت سادہ اور عام سا تھا ایسی کوئی شک وشبے والی بات نہیں تھی مگر نہ جانے کیوں میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔

میں جب ناشتے سے فارغ ہوا تو دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے' تب ہی میرے سیل فون پر روزی کی کال آئی' میں نے فون ریسیو کیا تو وہ جھٹ بولی۔

"ہوگئی تمہاری صبح؟"

"بہت دیر ہوئی۔" میں نے بشاشت بھرے لہجے میں کہا۔

"اور میں احمقوں کی طرح رات سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں اگر آپ اپنی خاص مصروفیات" اس نے خاص مصروفیات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "فارغ ہو گئے ہوں تو تشریف لے آئیے' بندی سر تا پا منتظر ہے۔"

"اوہو بھئی بڑا غصہ ہے' ناراض مت ہو' میں اب فارغ ہوں اور ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔" میں نے کہا پھر اپنے سراپا پر نگاہ ڈالی میرے سارے کپڑے مسل سے گئے تھے' پینٹ تو جینز کی تھی لیکن شرٹ مسل گئی تھی' اس لیے کہا۔

"یار میرا حلیہ بہت خراب ہو رہا ہے' تمہارے پاس اس حال میں آنا اچھا نہیں لگ رہا' اگر تم کہو تو تھوڑی دیر......"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے' تم ہر حال میں ایک سے ہی لگتے ہو اس لیے حلیے کی فکر نہ کرو اور چلے آؤ۔" اس نے میری بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ تم ہر حال میں شہزادے ہی لگتے ہو' اگر دیوار پر کوئلے سے بھی تمہاری تصویر بنا دی جائے تب بھی کوئلے میں بھی اجلے اور سندر لگو گے۔" اس نے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ کہا۔

"شٹ اپ! تم سے تو ہر لحاظ سے کم ہی ہوں۔" میں نے بھی جواباً ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا اب باقی باتیں آمنے سامنے ہوں گی' تم فوراً چل دو' ویسے اس وقت کہاں ہو؟" اس نے پوچھا۔

آ کر بتاتا ہوں۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا' میں نے چور نگاہوں سے دلارے کی جانب دیکھا کہ وہ میری باتیں سن رہا ہے یا اپنے کام میں مصروف ہے۔

میں سوچنے لگا کہ دلارے کو یہاں چھوڑ کر ذرا دیر کو روزی سے مل کر آ جاتا ہوں' گھر میں کوئی بھی ایسی قیمتی شے موجود نہیں تھی جس کی مجھے فکر ہوتی' اس لیے کچن میں دلارے کے پاس چلا آیا اور اسے آواز دی۔

"دلارے۔" تو اس نے میری آواز پر چونک کر مجھے دیکھا۔ وہ پیاز کاٹنے میں مصروف تھا۔

"جی بھائی۔" اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھوں سے بہنے والا پانی صاف کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے ذرا ایک کام سے جانا ہے تم دروازہ اندر سے لاک کر لو۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

"جلدی آیئے گا بھائی مجھے اکیلے گھر میں ڈر لگتا ہے۔" اس نے معصوم سے لہجے میں کہا۔

"ارے کیسے مرد ہو' اکیلے گھر میں ڈرتے ہو' اکیلے گھر میں کس کا ڈر۔" میں نے دھیرے سے ہنستے ہوئے کہا۔

"جن اور چڑیلوں سے۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"احمق۔" میں نے کہا اور باہر جانے لگا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آنے لگا اور یہی کہتا رہا کہ میں جلدی گھر آ جاؤں۔

مجھے اپنے فلیٹ میں دلارے کو تنہا چھوڑتے ہوئے کوئی ٹینشن نہیں تھی۔ اس فلیٹ میں میرے حوالے سے کوئی بھی چیز نہیں تھی۔ پھر بھی بہت سی چیزوں پر میں نگاہ رکھ کے آیا تھا تاکہ واپس آ کر میں اس بات کا اندازہ کر سکوں کہ میری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دلارے میرے روم میں آ کر کسی چیز کو چھیڑتا ہے یا الماری کے لاک کو ہاتھ لگاتا ہے یا نہیں۔

میں اپنی کار کو برق رفتاری سے دوڑاتے ہوئے ڈیفنس کے فلیٹ پر پہنچا اور جیسا کہ اس نے کہا تھا وہ اپنے حسن کے تمام تر ہتھیاروں سے لیس بے قراری سے میرا انتظار کر رہی تھی۔

"اب بتاؤ مجھ سے ایسا کون سا ضروری کام آن پڑا جو اتنی بے تابی سے میرا انتظار ہو رہا تھا۔" میں نے صوفے پر خود کو گراتے ہوئے پوچھا۔

"کام تو میں تمہیں بتا ہی دوں گی پہلے تم ایک بات بتاؤ بالکل سچ سچ۔" اس نے گہری نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا؟" میں نے چونکنے کے انداز میں پوچھا۔

"کل رات کس مہہ جبین کے ساتھ تھے؟" اس نے بدستور گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ایسی تو کوئی بات نہیں ہے وہ تو میں......!" میں نے تیز اور اپنے اندر اترتی ہوئی برچھی کی مانند اس کی نگاہوں سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

"ہمارے درمیان دوستی کی ابتدا کرتے ہوئے یہ معاہدہ ہوا تھا کہ ہم کبھی بھی ایک دوسرے سے غلط بیانی نہیں کریں گے پھر تم کیوں ایسا کر رہے ہو' ویسے ضروری نہیں ہے کہ تم مجھے اپنے پرسنل میٹر بتاؤ لیکن جھوٹ نہ بولو۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیسے اس بات کا علم ہوا کہ میں کل رات کسی لڑکی کے ساتھ تھا کیا تم نے اب بھی میری جاسوسی نہیں چھوڑی۔" میرے لہجے میں خود بخود ناگواری اتر آئی۔

"اب تم بدگمانی کی باتیں کر رہے ہو' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جب میں نے تم سے کہا تھا کہ اپنے بندوں کو تمہاری نگرانی سے ہٹا لوں گی تو اس وقت ہٹا لیا تھا۔ دراصل کل رات اتفاق سے میری گاڑی تمہاری گاڑی کے پیچھے تھی۔ اس وقت تم بدلے ہوئے حلیے میں تھے لیکن میں نے گاڑی کے نمبر سے تمہاری گاڑی کو پہچانا تھا لیکن تمہاری جگہ جب میں نے اس میں کسی اور کو دیکھا تو اس کا پیچھا کرنے لگی۔ خوامخواہ تمہاری فکر میں پڑ گئی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ تم نے اپنی گاڑی کو پیٹرول پمپ کے سائیڈ میں ایک جگہ روکا میں یہ سوچ رہی تھی کہ اچانک پیچھے سے آ کر تمہیں سرپرائز دوں گی۔ لیکن اچانک چلتے چلتے تم کسی ٹیکسی کا پیچھا کرنے لگے اور پیچھا کرتے کرتے تم سی سائیڈ پر جا پہنچے تم نے کچھ دیر اس لڑکی کو ساحل پر کھڑے ہو کر دیکھا پھر پتھروں سے اتر کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

تم اس کے پاس چلے گئے اور پھر تم دونوں قریبی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔

میں نے ایک بار پھر تمہیں کال کی لیکن تم نے آنے سے معذرت کرلی اور اپنا موبائل آف کرلیا۔ پھر میں اپنے فلیٹ پر واپس آ گئی اب بتاؤ میں نے کیا غلط کہا ہے۔" وہ پوری تفصیل کے ساتھ ایک ایک بات بالکل سچ بیان کررہی تھی اور میں شرمندگی سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے روزی پر بالکل دھیان نہیں دیا اس کی اصل وجہ مجھے مہ وش کا اچانک دکھائی دے جانا تھا ورنہ ایسا ہوتا نہیں ہے کہ راستا چلتے ہوئے میں اتنا بے خبر رہا کہ اپنے آگے پیچھے کا کوئی ہوش ہی نہ تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو بالکل ایسا ہی ہوا تھا آئی ایم رئیلی سوری۔" میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے معذرت کے کلمات کہے۔

"اٹس او کے شمروز۔" اس نے میرے ہتھیار ڈالنے پر نرم لہجے میں کہا۔ "ویسے پتا نہیں کیوں مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ اس لڑکی کا تعلق تمہارے ماضی سے ہے ایم آئی رائٹ؟"

میں نے بنا کچھ کہے اثبات میں سر ہلادیا۔ شاید اس لمحے میرے چہرے پر ڈھیروں اداسی چھا گئی ہوگی تب روزی نے بڑی نرمی سے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولی۔

"کیا وہ تمہارا گمشدہ پیار تھی؟"

میں نے اس بار بھی صرف گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ "تم لوگ علیحدہ کیوں ہوئے تھے؟" اس نے بدستور نرم لہجے میں پوچھا۔

"چھوڑو نا یار اس موضوع کو کیا ہم کوئی اور بات نہیں کرسکتے۔" میں نے جھنجلائے ہوئے قدرے تیز لہجے میں کہا کیونکہ روزی کے جملے میرے بڑی مشکلوں سے باندھے ہوئے بندوں کو توڑ رہے تھے۔

"او کے جان، ٹیک ایزی، ریلیکس ہوجاؤ، آئی پرامس یو آئندہ ہم اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔" اس نے میرے لہجے کا برا مانے بغیر اس مرتبہ بھی اپنا لہجہ نرم ہی رکھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے اس لہجے میں روزی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس لیے ایک بار پھر معذرت آمیز لہجے میں اسے سوری کہا۔

"میں جانتی ہوں ہماری زندگی کے کچھ ایسے کمزور پہلو بھی ہوتے ہیں جنہیں ہم کبھی کسی پر ظاہر نہیں کرتے کبھی اپنے ماضی کے ان پنوں کو کسی کے سامنے نہیں کھولتے، شاید ماضی کے لمحات میں وہ بہت وقت یا تو بہت حسین گزرا ہوتا ہے یا بہت زیادہ تکلیف سہنا پڑتی ہے۔" وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ میرے ہاتھ کو بھی سہلا رہی تھی۔ پھر اٹھی اور ٹھنڈے جوس کا ایک گلاس لے آئی اور بولی۔

"لو یہ پی لو شاید اس سے تمہارے اندر کی تپش کچھ کم ہوجائے۔"

"اگر ایسی چیزیں انسان کے اندر کی جلن اور تپش کو کم کردیں تو بات ہی کیا ہے۔" میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا لیکن پھر فوراً ہی شوخ لہجے میں بولی۔

"دفع کرو جلن اور تپش کو فی الحال تو تمہارا حلق خشک ہورہا ہوگا اسے تو تر کردو۔"

پھر میری جانب جھکتے ہوئے شوخ لہجے میں میری آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے بولی۔

"کہیں مجھے دیکھ کر تو تمہیں کچھ نہیں ہورہا ہوسکتا ہے مجھے دیکھ کر تمہارا بی پی ہائی ہوگیا ہو اور تمہارا حلق خشک ہوگیا ہو۔"

اور میں نے جھٹ اس کے سراپا سے اپنی نگاہیں ہٹا لیں اس کے کشادہ گریبان سے جھانکتا ہوا اس کا دو آتشہ حسن کسی بھی زاہد کا ایمان ڈگمگانے کے لیے کافی تھا۔

میں نے دوسری جانب اپنا رخ پھیر کر کہا۔

"شٹ اپ روزی، تم جانتی ہو میں ایسا ہرگز نہیں ہوں۔"

"واقعی۔" اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور سیدھی ہوگئی پھر بولی۔ "ایک بات سچ سچ بتاؤ گے۔" تو میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

"حقیقت میں پاک باز ہو یا اپنی محبوبہ سے کیے گئے عہد وفا کو نبھا رہے ہو۔ وہ عہد جو تم نے کبھی اس سے کیا ہوگا کہ جان من میرا دل اور جسم و جاں صرف تمہاری امانت ہے اس پر تمہارے علاوہ کبھی کسی اور کا تصرف نہیں ہوگا۔"

"تمہارا جو دل چاہے سمجھ لو۔" میں نے گلاس کو لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو کوئی جواب نہیں ہوا میں اپنی مرضی سے کیسے تمہارا جواب سمجھ سکتی ہوں تم ایک جواب دو نا۔" اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

"بھئی آخر تم چاہتی کیا ہو؟" میں نے قدرے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابھی ابھی تم نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ ہم اس موضوع پر دوبارہ بات نہیں کریں گے۔"

"آئیم سوری۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "میں تو تمہارا زہد و تقویٰ دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اور طنز کرلو دو چار باتیں اور کہہ لو لیکن پلیز آئندہ کبھی اس موضوع کو مت چھیڑنا۔" میں نے سخت اور قطعی لہجے میں کہا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور ٹہلنے لگی میں سمجھ گیا کہ اسے میری بات بہت بری لگی ہے لیکن مجھے اس کی قطعی پروا نہیں تھی بری لگتی ہے تو لگا کرے۔ اگر میں اسے صاف جواب نہ دیتا تو وہ میرے پیچھے پڑی رہتی۔

بہت سے لمحے خاموشی کی نذر ہوگئے تقریباً پانچ منٹ گزر گئے میں خاموشی سے جوس پیتا رہا اور ٹہلتی رہی تب میں نے ہی اس خاموشی کو توڑا اور اسے مخاطب کیا۔

"واک اگر کرنی ہو تو کسی پارک کا رخ کیا کرو، بلکہ یہیں نزدیک میں نثار شہید پارک ہے روز صبح شام وہاں چلی جایا کرو اور اپنا شوق پورا کرلیا کرو فی الحال تو بیٹھ جاؤ اور وہ کام بتاؤ جس کے لیے مجھے بلایا ہے۔"

اس نے خفگی بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور بولی۔ "بہت ہی سنگ دل اور بے حس انسان ہو۔"

"اتنی تعریف کرنے پر بندہ آپ کا شکر گزار ہے اب فرمایئے۔" میں نے ایک دوستانہ مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجا کے کہا تو وہ میرے نزدیک آ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

"مجھے حیرت ہوتی ہے تمہارے اوپر تمہارے جیسے لوگ اب اس دنیا میں کہاں ہوتے ہیں۔"

"تم غلط کہہ رہی ہو میں تو بہت ہی گناہ گار انسان ہوں تمہارا واسطہ ابھی تک جن لوگوں سے پڑا ہے وہ دوسری قسم کے لوگ ہوں گے لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں بہت اچھے لوگ موجود ہیں میں تو ان کے قدموں کی دھول بھی نہیں ہوں اور شاید بہت زیادہ گناہ ہونے کے باوجود یہ دنیا ابھی تک قائم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود بھی نیک کام کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بھلائی اور نیکی کی جانب بلاتے ہیں خود بھی گناہ کے کاموں سے دور رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی گناہ کے کام کرنے سے روکتے ہیں۔"

"اف اللہ۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اسلامیات کے ٹیچر آ گئے۔ سر ذرا رک جایے میں دوپٹا سر پر اوڑھ لوں۔" پھر بولی۔ "اوہ! سوری سر میرے پاس دوپٹا تو ہے نہیں اس لیے اسلامیات کی کلاس اب ختم کردیں۔"

میں بہت تاسف بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا کہ یہ لڑکی جب اپنے گھر سے نکلی تھی تو کیسی تھی اور زمانے کی گندگی میں لتھڑ کر کیسی بن گئی ہے۔

"یہ تم کن نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہے ہو۔" وہ غصے سے چیخ پڑی اور لمحہ بھر میں اس کی حالت بگڑ گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ چیخ چیخ کر کہنے لگی۔ "ہاں میں بدکار ہوں بدکاری کرتی ہوں لوگوں کو قتل کرواتی ہوں لوگوں کی عزتیں اتروانی ہوں نفرت ہے مجھے شرافت سے اور شریف لوگوں سے۔ جب مجھے کسی نے شریف نہیں رہنے دیا تو میں کیوں کسی کے ساتھ رعایت کروں میں تمہیں بھی شریف نہیں رہنے دوں گی اپنے جیسا بدکار بنادوں گی بڑی شرافت ہے تمہارے اندر میں سب سمجھتی ہو سارے ناٹک ہیں تمہیں بھی جب موقع ملے گا تم لمحہ بھی نہیں لگاؤ گے اپنا یہ شرافت کا چولا اتارنے میں۔ تو پھر دیر کس بات کی ہے ابھی کیوں نہیں۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنے جسم پر کسا ہوا چھوٹا سا بلاؤز اتار پھینکا۔

میری آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ اس پر دیوانگی سی طاری تھی۔ ایک جنون کی کیفیت مجھے اس کی آنکھوں میں دکھائی دی۔ اس نے اندر کچھ بھی نہیں پہنا ہوا تھا وہ بڑی بے باکی کے ساتھ دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھے ہانپ رہی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم روزی! پاگل تو نہیں ہوگئی ہو پہنو اسے۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"اب بتاؤ میرے اندر کیا کمی ہے ہے نا میرا حسن توبہ شکن۔" اس نے اسی طرح کھڑے کھڑے کہا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور زمین پر پڑے ہوئے جرسی کے کپڑے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو اٹھالیا جس کے ذریعے اس نے ناکافی ستر پوشی کی ہوئی تھی اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم بری نہیں ایک اچھی لڑکی ہو چلو اس کو پہن لو۔"

اس نے میرے ہاتھ سے بلاؤز لے کر دور پھینک دیا اور پھر اس نے وہ حرکت کی کہ میں بھونچکا سا کھڑا رہ گیا۔ اس کے جسم پر بہت ہی مختصر سا زیر جامہ تھا دوسرے ہی لمحے وہ میرے ساتھ لپٹ گئی۔

اس کا نرم اور گداز جسم جب میرے جسم سے ٹکرایا تو مجھے اپنے جسم سے چنگاریاں سی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔ وہ بڑی بے تابی سے میرے چہرے اور گردن کے بوسے لے رہی تھی۔ میں کمزور پڑنے لگا میری جانب سے ہونے والی معمولی سی مزاحمت بھی دم توڑنے لگی اور میں نے اس کے پھول سے نازک وجود کو اٹھا کر صوفے پر ڈال دیا وہ فخریہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی ایک فتح مندی دکھائی دی مجھے اس کی آنکھوں میں۔

میں اس پر جھکنے لگا تب ہی مہہ وش کی شبیہ میری آنکھوں میں لہرا گئی۔ جب وہ پہلی مرتبہ میری برتھ ڈے پر مشرقی لباس چوڑی دار پاجامہ اور کرتا اور جالی کا ستاروں بھرا دوپٹا اوڑھ کر آئی تھی۔ میری دی ہوئی سرخ اور ہری کانچ کی چوڑیاں اس کی گوری گوری کلائیوں میں سج رہی تھیں اور اس لمحے مجھے اس پر بے انتہا پیار آیا تھا۔ تب پہلی مرتبہ میں نے اسے اپنی بانہوں میں تھاما تھا اور اسے چومنا چاہا تھا تب وہ تڑپ کر میری بانہوں سے نکل گئی اور مجھ سے بہت معذرت کرنے کے بعد اس نے کہا تھا۔

"شاہو جب ہمارے پیار میں پاکیزگی ہے اور ہم سچے دل سے ایک دوسرے کے ہو کے اپنی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو پھر اس پیار کو آلودہ مت کرو۔" لیکن میں بری طرح بہک گیا تھا اس کی خوشامد کرنے لگا کہ میں صرف تمہارے ملیح چہرے کو چومنا چاہتا ہوں تمہارے اس حسین روپ کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز...... پلیز مت روکو تو وہ جھٹ مجھ سے ہٹ کر دور کھڑی ہوگئی تھی اور بولی۔

"شاہو کیا میں یہ سمجھوں کہ تم نے مجھ سے سچی محبت نہیں کی اور تم بھی محض اپنی ہوس کے غلام ہو تمہارے نزدیک محبت کے اظہار کے لیے اللہ کی اجازت کے بغیر جسموں سے اظہار کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔"

تب میں نے شرمندگی سے اس سے معذرت کی اور وعدہ کیا کہ شادی سے پہلے میں آئندہ کبھی اس سے ایسی

کوئی بھی فرمائش نہیں کروں گا۔

جواباً اس نے بھی مجھ سے معذرت کی کہ وہ ایسا کبھی نہیں چاہے گی کہ اس کی محبت کے پاکیزہ لباس پر گندگی کا ایک بھی قطرہ گرے۔

اور اب وہی مہہ وش میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"شاہو میرے شاہو اگر آج تم نے اپنے آپ کو نہ روکا تو پھر میں دوبارہ تم سے ہمیشہ کے لیے دور چلی جاؤں گی۔ کیونکہ نہ میں بدکار ہوں اور نہ کسی بدکار کو پسند کروں گی۔"

میں گھومتے ہوئے دماغ کے ساتھ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں اس کے جسم پر تھیں لیکن ذہن کوسوں فاصلے پر بیٹھی مہہ وش کی جانب تھا۔

وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے اپنی جانب بلانے لگی۔ میں اس کی جانب جھکا اور پھر کمرے میں "چٹاخ" کی زور دار آواز گونجی اور وہ ہکا بکا میری جانب آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگی۔ میں نے آلود لہجے میں کہا۔

"اگر تم نے ایک منٹ کے اندر اٹھ کر اپنا لباس نہیں پہنا تو اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اپنے ان ہاتھوں سے تمہاری یہ خوب صورت گردن دبا دوں گا۔"

"یہ...... کک...... کیا ہوگیا...... تت...... تمہیں...... آ...... ابھی تو...... سب ٹھیک تھا۔" اس نے ہکلاتے ہوئے بمشکل کہا۔

"تم نے سنا نہیں۔" میں پھر دھاڑا۔

"اوکے۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ مصالحت کے انداز میں اٹھاتے ہوئے کہا اور جھٹ صوفے سے اٹھ کر اپنا لباس پہن لیا۔ اس دوران میں اس کی جانب سے رخ پھیر کے کھڑا رہا۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ اپنے کندھوں پر محسوس ہوئے اور اس نے دھیرے سے کہا۔

"شاہ زمان ڈاکٹر شاہ زمان...... تم واقعی ڈاکٹر شاہ زمان ہو۔"

میں نے اس کے اس جملے پر تڑپ کر پیچھے مڑ کر دیکھا وہ تھوڑی دیر پہلے والی روزی سے یکسر مختلف روزی مجھے دکھائی دی اس نے اپنے دونوں ہاتھ بازو موڑتے ہوئے سینے پر باندھ لیے اور بولی۔

"پتا ہے شاہ زمان اگر یہ تھپڑ تم میرے منہ پر نہ مارتے تو میں تمہیں مار دیتی اور پھر مستقبل میں تمہارے ساتھ بہت برا ہوتا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے بگڑتے ہوئے تیور کے ساتھ کہا۔ "دعوت بھی خود ہی دیتی ہو اور پھر مستقبل بھی میرا خراب...... بہت خوب۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہہ کر داد دینے کے لیے تالی بجائی۔

"آؤ آرام سے بیٹھو میں تمہیں ساری بات بتاتی ہوں۔" اس نے رسان بھرے لہجے میں کہا تو میں اس کے پل پل روپے پر حیران ہوتا ہوا بیٹھ گیا اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"ابھی تم جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ میں محض تمہارا امتحان لے رہی تھی اب تم یہ کہو گے کہ مجھے کیا ضرورت پڑی کہ میں تمہارا امتحان لے رہی تھی۔ بات دراصل یہ ہے شاہ زمان کہ جب سے میری اور تمہاری ملاقات ہوئی ہے اور پھر دوستی میرے دل میں تمہاری عزت قدر اور محبت پیدا ہوگئی ہے۔ تم نے بالکل درست کہا تھا کہ میرا حقیقت میں اچھے لوگوں سے واسطہ پڑا ہی نہیں ہے۔ شاید اسی لیے میں اس بات پر یقین نہیں کرسکتی کہ مرد ذات میں سوائے ہوس پرستی کے حقیقی شرافت بھی ہوسکتی ہے۔ ولی اللہ اور اللہ کے علاوہ اور پھر تم بھی تو ہماری ہی لائن کے ہو۔

بس اسی لیے جب تمہارے بارے میں ایک اہم اطلاع میرے پاس آئی تو میں نے سوچا کہ تمہیں اس کی حقیقت سے آگاہ کردوں اور آنے والی تباہی سے تمہیں بچالوں۔ لیکن پھر پتا نہیں کیوں ابھی بھی اور وہ بھی تمہاری شرافت کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ تمہاری

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک آخری آزمائش اور کرلی جائے ہوسکتا ہے تم میرے اوپر اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے یہ پارسائی کا ڈھونگ رچا رہے ہو کیونکہ اپنے بارے میں اور اپنے ماضی کے بارے میں تو میں ایک ایک بات تمہیں بتا ہی چکی تھی۔

میں نے یہ سوچا تھا کہ اگر تم میری آزمائش میں پورے اترے تو تمہارے جیسے دوست اور تمہاری دوستی کے لیے میں اپنے خون کا آخری قطرے تک بہادوں گی اور اگر تم بھی ایک عام مرد کی طرح کمزور اور اپنے نفس کے غلام نکلے تو تمہیں اس اندھیرے گڑھے میں گرنے دوں گی سو مجھے تمہارے جیسے دوست اور تمہاری دوستی پر فخر ہے۔ اس لیے میں تم سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی سب کچھ بتادوں گی۔" اتنا کہہ کر وہ ذرا سانس لینے کو رکی تو میں نے شک آلود نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا۔

"تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"اپنی جان کی قسم' بالکل سچ' میرا ارادہ صرف تمہارا امتحان لینے کا تھا اور کچھ نہیں۔" اس نے گلے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"چلو یقین کرلیا لیکن اللہ کے واسطے آئندہ دوبارہ کبھی اتنے کڑے امتحان میں مت ڈالنا یار میں بھی تو انسان ہی ہوں انسان خطا کا پتلا ہے کبھی قدم بہک بھی سکتے ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"چلو وعدہ رہا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ میرے آگے پھیلا دیا۔ جسے میں نے فوراً تھام لیا اور پر جوش طریقے سے دبا کے چھوڑ دیا وہ پھر بولی۔

"اصل میں بات یہ ہے تمہیں میرے باس نواب جمشید لودھی نے ملاقات کے لیے بلوایا ہے اور اس نے یہ کام میرے سپرد کیا ہے کہ میں تمہیں اس کا یہ پیغام تمہیں پہنچادوں۔"

"ہاں تو پھر...... اس میں کیا ہے تم مجھے فون پر ہی بتا دیتیں میں آجاتا۔" میں نے کہا۔

"بات صرف اتنی نہیں ہے جتنی تم سمجھ رہے ہو۔" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں مجھ سے ملنا چاہ رہا ہے؟" میں نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"نواب جمشید کو تمہارے بارے میں ہر بات کا علم ہے اسے یہ بھی معلوم ہے کہ نواب سطوت تمہارا مجرم ہے اور تم اس سے انتقام لینے کے لیے اس کے نزدیک آئے ہو بس یوں سمجھ لو کہ وہ تمہاری دکھتی رگ سے واقف ہے۔

اس لیے جب وہ تم سے ملاقات کرے گا تو تمہاری عقل و ذہانت اور بہادری کی بہت بہت تعریف کرنے کے بعد تم سے اس بات پر اصرار کرے گا کہ تم جلد از جلد نواب سطوت کو موت کے گھاٹ اتار دو۔ وہ تمہیں ہر طرح کی مدد کی پیش کش کرے گا لیکن پلیز تم اس کے کہنے پر ابھی ایسا بالکل بھی مت کرنا۔" روزی نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"لیکن کیوں؟ جبکہ میں تو خود ایسا کرنا چاہتا ہوں اچھا ہے اگر نواب جمشید میری مدد کرے تو مجھے اپنا کام کرنے میں آسانی ہوگی۔" میں نے حیرانی سے روزی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ اس لیے مائی ڈیئر فرینڈ کہ بظاہر آپس میں فرسٹ کزن ایک دادا کی اولاد اور در پردہ ایک دوسرے کے کٹر دشمن نواب جمشید نواب سطوت کے قتل پر آنسو بہانے اور واویلا کرنے پہنچ جائے گا بعد میں وہ ایسے بہت سے گواہ کھڑے کردے گا جو اس بات کی گواہی دیں گے کہ نواب سطوت کو قتل کرنے والا کوئی اور نہیں اس کا اپنا بندہ شمروز ہے اور پھر تمہیں اس کے قتل کے الزام میں پکڑوا کر پھانسی کے تختے پر پہنچادے گا۔" روزی نے کہا۔

"لیکن نواب جمشید کی میری ساتھ تو کوئی دشمنی نہیں ہے پھر وہ میرے ساتھ ایسا کیوں کرے گا۔" میں نے کہا۔

"تم ایک بات بھول رہے ہو شاہ زمان کہ نواب جمشید کے لیے نواب سطوت کو مارنا کوئی بہت زیادہ مشکل کام نہیں ہے وہ اس کو مروا سکتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کرے گا وہ نواب سطوت کے کسی بہت ہی قریبی ساتھی سے یہ کام کروانا چاہتا ہے۔"

"میں ابھی بھی ساری بات سمجھ نہیں رہا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔" میں بری طرح الجھ کر رہ گیا۔

"یہ بات کسی سے چھپی نہیں ہے اور نواب سطوت کے قتل کے بعد بھی چھپی نہیں رہے گی کہ ان دونوں کزنز کی اس بات پر دشمنی تو ہے کہ نواب سطوت کی اولادوں میں صرف بیٹیاں تھیں جبکہ نواب جمشید کے بیٹے ہیں اسوا تو نواب سطوت کے مرنے کے بعد اس کی گدی اس کی بیٹی کو نہیں بلکہ نواب سطوت کے چچا زاد بھائی نواب جمشید کی اولاد کو ملے گی لیکن نواب سطوت آج بھی جوان دکھائی دیتا ہے اور صحت مند بھی ہے فی الحال تو اس کا مرنے کا دور دور تک کوئی ارادہ نہیں ہے آخر وہ اس گدی پر قبضے کے لیے کب تک انتظار کرے گا اچھا ہی ہوگا جو کوئی قاتل یہ کام آسان کردے۔

اور اگر نواب سطوت کا قتل ہوگا تو پولیس کا سب سے پہلا شبہ نواب جمشید پر ہی جائے گا کہ اس نے گدی حاصل کرنے کے لیے نواب سطوت کا قتل کروایا ہے۔

تمہارے ذریعے قتل کروا کر وہ سارے ثبوت پولیس کو فراہم کردے گا اور پولیس تمہیں گرفتار کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائے گی۔

حالانکہ میں تو خود دل سے یہ چاہتی ہوں کہ اللہ کی اس دھرتی سے جلد از جلد نواب سطوت کا ناپاک وجود مٹ جائے لیکن اس سازش کے علم میں آجانے کے بعد میں تم سے یہی کہوں گی کہ پلیز فی الحال تم اس کو مارنے کا پروگرام ملتوی کردو بلکہ اس کی جان کی حفاظت کرواسے جب میرے بارے میں یہ پتا چلا تھا کہ میں نواب سطوت کو مارنے کی کوشش کی ہے تو وہ مجھ پر بہت ناراض ہوا تھا کہ میں نے اس کی اجازت کے بغیر ایسی کوشش بھی کیوں کی۔

اس کے بعد اتفاق سے گولی نے تمہیں دیکھ لیا اور اس کی زبانی مجھے تمہاری ساری کہانی کا علم ہوگیا پھر تمہارے پیچھے جب میں نے اپنے بندے جاسوسی کے لیے لگوائے تو یہ پتا چلا کہ تم نواب سطوت کے لیے کام کرتے ہو پھر میں نے تم سے رابطہ کیا۔

تمہارے بارے میں جاننے کے بعد ہی مجھے تم سے ہمدردی ہوگئی تھی کیونکہ میری اور تمہاری کہانی میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ ہم دونوں ایک ہی شخص کے ہاتھوں ستائے گئے ہیں ہمارا مجرم ایک ہی ہے۔

میں تمہارے کردار سے متاثر بھی ہوئی تھی اور شاہ زمان انجانے میں...... تم سے...... محبت کر بیٹھی۔ تم بھی کہو گے کہ میں تو رضوان سے محبت کرتی تھی۔

وہ ماضی کی بات تھی بلکہ آج جب میں سنجیدگی سے اس بارے میں سوچتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ میری محبت نہیں تھا۔ وہ تو صرف میری پناہ گاہ تھا۔ اس کی رسائی بھی تو بغیر نکاح کے میرے جسم تک تھی۔ اس نے بھی رات کی تاریکیوں میں اپنے پیار سے جسم کی پکار پر لبیک کہا اور یہ سوچ کر مجھے بار بار لوٹا کہ میرے پاس اب وہ شے باقی ہی کہاں رہی ہے جیسے عزت کہتے ہیں۔

لیکن تم شاہ زمان...... تم...... سب سے مختلف نکلے۔ ان تمام مردوں سے مختلف جن سے آج تک میرا واسطہ پڑا ہے تمہارے جیسے مضبوط کردار کے مرد ہی اس قابل ہوتے ہیں کہ جنہیں چاہا جائے۔ اپنی جان سے بھی زیادہ۔

میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارا دل تمہارے پاس نہیں ہے وہ تو تم کسی اور کو دے چکے ہو تمہارے کردار کی ایک اور مضبوط گرہ تمہاری وفا بھی ہے وہ جو بھی ہے بہت خوش نصیب ہے جسے تمہارے جیسے مرد کی چاہت نصیب ہوئی ہے اور میں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں تم سے سوائے تمہاری دوستی کے اور کسی چیز کی طلب گار نہیں ہوں۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ محبت سے اپنی دوستی جیسی قیمتی چیز کبھی نہیں چھینو گے۔" بات کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی۔

میں جو بہت دیر سے خاموش بیٹھا اس کی ساری گفتگو سن رہا تھا اس کے اتنے جذباتی ہونے سے کھسک کر اس کے نزدیک آ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد تم مجھے ہمیشہ اپنا مخلص دوست پاؤ گی۔"

وہ مسکرائی تو آنکھ میں ڈبڈبانے والا آنسو لڑھکتا ہوا باہر نکل آیا جسے میں نے اپنی انگلی کی پور سے سنبھال کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور مٹھی بند کرتے ہوئے کہا۔

"آج سے تمہارے آنسو میری مٹھی کی قید میں ہیں اب کبھی باہر نہیں نکلیں گے۔" وہ ایک بار پھر مسکرائی اور دھیرے سے ہنس پڑی تو میں بھی ہنس دیا اور کہا۔

"یار عورت ذات کے پاس یہ ہتھیار بہت ہی مضبوط ہے سخت سے سخت مرد کو بھی منٹوں میں زیر کر لیتی ہے اپنے اس ہتھیار کے ذریعے۔"

"کون سا ہتھیار؟" اس نے کہا۔

"یہی موٹے موٹے آنسو۔" میں نے مضحکہ خیز انداز میں ہاتھوں سے موٹے کا اشارہ کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کو میں نے کھل کر ہنسنے دیا وہ خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ نواب جمشید کے پاس کب چلنا ہے اور وہ جب اپنے کام کے لیے کہے گا تو اسے کیا جواب دے کر مطمئن کرنا ہے۔"

"میرا خیال ہے میرا تمہارے ساتھ جانا مناسب نہیں ہوگا تم تنہا ہی جانا اور چاہو تو آج رات فون کر کے ملاقات کا ٹائم لے لو اور جب وہ تم سے اپنے کام کے لیے کہے تو تم ہامی بھر لینا اور کہہ دینا کہ تمہیں اس کی مدد کی ضرورت نہیں ہے تم خود موقع کی تلاش میں ہو اور جلد از جلد یہ کام کرنا چاہتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے روزی کی بات سننے کے بعد کہا۔ اس نے بہت مناسب مشورہ دیا تھا۔

پھر تھوڑی دیر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے گولی استاد کے بارے میں اس سے معلوم کیا کہ وہ آج کل کہاں ہے۔ مجھ سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی میں نے روزی کو یہ بھی بتا دیا کہ میں فی الحال گلشن اقبال والے اس فلیٹ میں ٹھہرا ہوا ہوں جہاں وہ پہلی مرتبہ مجھ سے ملنے کے لیے آئی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے اسے حشام اور سرمئی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میری عادت تھی کہ میں ہر شخص سے صرف اتنی ہی باتیں کرتا تھا جو اس کے مطلب کی اور اس کی ذات سے مطابق ہوتی تھیں۔

میں وہاں سے اٹھنے لگا تو روزی نے کہا کہ اگر تھوڑی دیر اور رک جاؤ تو گولی استاد سے بھی ملاقات ہو جائے گی وہ ابھی تھوڑی دیر میں آنے والا ہے۔

میں گھر جانا چاہتا تھا پہلی مرتبہ دلارے ایک اجنبی کو گھر میں چھوڑ کر آیا تھا اور ابھی تو میں اس کی جانب سے مطمئن بھی نہیں ہوا تھا لیکن روزی کی کال پر مجبوراً آنا پڑ گیا۔

پھر دس منٹ بعد گولی استاد کا روزی کے پاس فون آ گیا کہ جس کام کے لیے روزی نے اسے بھیجا تھا اس میں مزید ٹائم لگ جائے گا اس لیے وہ دیر سے آئے گا۔

تب روزی نے اسے میرے بارے میں بتایا کہ میں روزی کے فلیٹ پر اس کا انتظار کر رہا ہوں تو اس نے جواب دیا کہ اگر شاہ زمان میرا انتظار کر سکتا ہے تو کرے ورنہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے خود ہی میرے پاس آ جائے گا۔

میں نے روزی سے فون لے کر گولی استاد سے بات کی اور اسے بتایا کہ میں جا رہا ہوں بہتر یہی ہے کہ تم مجھ

سے ملنے کے لیے آ جانا ملنے کا مقصد محض ملاقات کرنا ہے کوئی خاص کام نہیں ہے پھر میں نے اسے گلشن اقبال والے فلیٹ کا پتا بتا دیا۔

گولی استاد سے بات کرنے کے بعد میں نے روزی سے نواب جمشید سے بات کرنے کے لیے اس کا کنٹریکٹ نمبر مانگا جو روزی نے مجھے دے دیا۔ میں نے روزی کو بتایا کہ میں آج رات ہی اسے فون کر کے اس سے ملاقات کا ٹائم لے لوں گا۔ پھر میں نے اسے گڈ بائے کہا اور نکل آیا۔

میں جب اپنے فلیٹ پر پہنچا تو دن کے ساڑھے تین بج رہے تھے بیل دینے پر دلارے نے دروازہ کھولا اس کی آنکھیں سوئی سوئی سی لگ رہی تھیں مجھے دیکھ کر بڑا سا منہ کھول کر جمائی لیتے ہوئے بولا۔

"بھائی آپ کہاں چلے گئے تھے میں نے کھانا کب کا تیار کر لیا آپ کا انتظار کرتے کرتے نیند آ گئی تھی۔"

"ہاں یار بس دیر ہو گئی کھانا لگاؤ ذرا آج تمہارے ہاتھوں کا بھی ذائقہ چیک کر دیکھیں۔"

وہ میری بات سن کر کچن کی جانب مڑ گیا اور میں اپنے روم کی جانب جاتے ہوئے دانستہ اپنے کمرے کا دروازہ لاک کر کے گیا تھا حالانکہ کمرے میں کوئی بھی خاص چیز نہیں تھی میں نے جیب سے چابی نکال لی اور لاک کھول کر اندر داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر دیا۔

میں اپنی ان نشانیوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا جو میں الماری اور دروازوں کے قریب لگا کر گیا تھا کمرے کے دروازے کے لاک پر مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ اسے کھولا گیا ہے یا نہیں۔ لیکن جیسے ہی میں الماری کی جانب بڑھا ایک دم ٹھٹک گیا یعنی الماری کے لاک کو چھیڑا گیا تھا۔

چند لمحوں کے لیے میں سوچ میں پڑ گیا پھر میرے ذہن میں آیا کہ دروازے کا لاک یقیناً ماسٹر کی کے ذریعے کھولا گیا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے پاس ماسٹر کی کہاں سے آئی۔ کیونکہ ساحل پر بے ہوشی کی حالت میں میں نے اس کی اچھی طرح سے تلاشی لی تھی اور اس کی جیبوں میں سوائے چند روپے کے اور کچھ برآمد نہیں ہوا تھا حد یہ کہ اس کے پاس موبائل فون بھی نہیں تھا اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میری غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یا تو یہ باہر گیا تھا یا پھر باہر سے کوئی اندر آیا تھا۔

میں ایک بات سے پوری طرح مطمئن تھا کہ پوری طرح سے تلاشی لینے کے بعد بھی اس کو یہاں سے کچھ بھی نہیں ملا ہوگا یہ الماری پوری طرح خالی تھی حد یہ کہ اس میں میرے پہننے کے کپڑے بھی نہیں تھے۔

اب مجھے پوری طرح سے یقین ہو چلا تھا کہ دلارے کی اصل شخصیت کچھ اور ہے اس نے یقیناً اپنا نام بھی مجھے غلط بتایا ہے لیکن ایک اہم سوال ابھی بھی دماغ میں گردش کر رہا تھا کہ آخر یہ کون ہے؟ یہ کس لیے میرے گھر تک آ گیا ہے اور اس کو کس نے میرے پیچھے لگایا ہے؟

ان تینوں سوالوں کے جوابات مجھے دلارے ہی دے سکتا تھا اور مجھے اس سے ہی ان کے جوابات حاصل کرنا تھے لیکن ابھی نہیں۔ میں تھوڑا اور انتظار کرنا چاہتا تھا اس کی حرکات و سکنات کو واچ کرنا چاہتا تھا پھر مجھے بھرپور طریقے سے اس پر ہاتھ توڑ ڈالنا تھا۔

یہ سب باتیں سوچتے ہوئے میں اچھی طرح ہاتھ منہ دھو چکا تھا۔ میں باہر آیا تو وہ کھانا ٹیبل پر لگا چکا تھا اور خود ایک کرسی پر بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔

میں سیدھا ٹیبل پر آ گیا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پالک گوشت بنایا ہوا تھا میں نے ڈش کا ڈھکن اٹھایا تو بہت اچھی خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔

"تم نے کھانا کھا لیا دلارے؟" میں نے پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے پوچھا تو وہ چونک پڑا۔

"آں..... ہاں..... کیا کہہ رہے ہیں بھائی؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ارے کیا اب بھی سو رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں رات کو نیند پوری نہیں ہوئی اس لیے شاید نیند آ رہی ہے ویسے مجھے دن میں سونے کی عادت نہیں ہے۔" اس نے پھر منہ کھول کر ایک بڑی سی جمائی لی۔

"اُفوہ بھئی کیا کرتے ہو منہ پر ہاتھ تو رکھو یہ کیا بدتہذیبی ہے۔" میں نے ناگوار لہجے میں کہا۔

"معاف کر دیں بھائی۔" اس نے مسکین سی شکل بنا کے کہا۔

"میں نے پوچھا تھا کہ تم نے کھانا کھا لیا؟"

"نہیں ابھی نہیں۔" اس نے نفی میں زور سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آؤ تم بھی کھا لو میرے ساتھ۔" میں نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے اس کے بنائے ہوئے کھانے کی تعریف کی تو وہ شرما گیا اور بولا۔

"نہیں بھائی پہلے آپ کھا لو میں بعد میں کھا لوں گا اماں کہتی تھیں کہ پہلے مالک لوگ کھا لیں ملازموں کو پھر بعد میں کھانا چاہیے۔"

"ارے یہاں کوئی ملازم اور کوئی مالک نہیں ہے اللہ کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔" میں نے کہا لیکن وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا تب میں نے دوبارہ پوچھا۔

"ابھی تم نے بتایا کہ اماں کہا کرتی تھیں تو کہاں ہیں تمہاری اماں؟ انہیں بھی یہاں لے کر آ جاؤ' اچھا ہے گھر میں ایک بزرگ خاتون آ جائیں گی۔"

"دو سال ہو گئے جی' انہیں اللہ نے اپنے پاس بلا لیا۔ بس دو سال سے تنہا ہوں۔ میرے بابا تو میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔" اس نے اداس لہجے میں کہا۔

میں غور سے اس کی شکل دیکھنے لگا وہ کتنی صفائی سے جھوٹ بول رہا تھا اگر مجھے اس پر شک نہ ہوتا اور میں اسے آزماتا نہیں تو میں بھی اس کی معصومیت پر یقین کر لیتا۔

"اچانک وہ اپنی کلائی پر بندھی پلاسٹک کی گھڑی کی جانب دیکھنے لگا پھر اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور یہ کہتا ہوا کچن میں چلا گیا کہ "میں کچن میں ہی کھا لیتا ہوں۔"

میں کھانا کھا ہی رہا تھا کہ میرے سیل فون پر نواب سطوت کی کال آ گئی۔ میں نے کچن کی جانب دیکھا تو دلارے مجھے قریب دکھائی نہیں دیا۔ پھر بھی احتیاطاً میں ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور دروازہ بند کر کے نواب سطوت کی کال ریسیو کی۔

"السلام علیکم سر۔" میں نے خوش دلی سے مودب لہجے میں کہا۔

"کیا حال ہیں؟ کہاں ہو؟" اس نے حسب عادت میرے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں گلشن اقبال اپنے فلیٹ پر آیا ہوا تھا۔" میں نے سچ بولا۔

"وہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے قدرے جھنجلا کر پوچھا۔

"وہ سر...... وہ بتایا تو تھا آپ کو یوں ہی دل پشوری کے لیے یہ فلیٹ لے رکھا ہے بس اس لیے آیا تھا بس اب کوٹھی پر جانے ہی والا تھا۔" میں نے ذرا شرمانے ذرا جھینپنے کی اداکاری کی۔

"اوہ اچھا اچھا ٹھیک ہے تم رات آٹھ بجے تک ضرور پہنچ جانا مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"سر آپ دبئی سے واپس آ گئے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"دبئی؟" اس نے تعجب آمیز لہجے میں کہا پھر بولا۔ "ہاں دبئی سے آج ہی آیا ہوں لیکن اس وقت کوٹھی پر نہیں ہوں بس تم آٹھ بجے تک ضرور پہنچ جانا مجھے بہت ضروری کام ہے۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

اس نے جس طرح حیرت سے دبئی کہا تھا اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دبئی گیا ہی نہیں تھا۔ وہ یہیں پاکستان میں سرجانی ٹاؤن میں موجود تھا۔ لیکن اس نے مجھ سے یہ جھوٹ کیوں بولا کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے ایک دم دروازہ کھول دیا تو میں نے تیزی سے دلارے کو کچن میں جاتے ہوئے دیکھا حالانکہ اس نے بہت جلدی کی تھی لیکن پھر بھی میں نے اس کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ لی تھی یعنی وہ آنے والے فون پر میری باتیں کان لگا کر سن رہا تھا۔ ابے تو کون ہے؟ میرا دل چاہا میں اس سے پوچھوں لیکن میں اپنی اس خواہش کا گلا گھونٹ کر رہ گیا۔

کھانا ایک بار چھوڑ کر اٹھ جاؤ تو دوبارہ کھایا نہیں جاتا۔ اس لیے میں کچن میں چلا آیا میں اسے چائے بنانے کا کہنے ہی والا تھا تب میں نے اسے دیکھا وہ ایک بار پھر اپنی پلاسٹک کی گھڑی کے ساتھ کھیل رہا تھا مجھے دیکھا تو اس پر ہاتھ پھیر کر سیدھا ہو گیا۔

"دلارے کھانا تو تم نے بہت اچھا کھلایا ہے اب ذرا اچھی سی چائے پلا دو۔"

"جی بھائی آپ بیٹھیں بس میں ابھی بنا کر لایا۔ صرف پانچ منٹ میں۔" اس نے سعادت مندی سے کہا۔

"یار تمہاری یہ گھڑی بڑی عجیب سی ہے تمہیں گھڑی کا شوق ہے میں تمہیں لا دوں گا اچھی سی گھڑی' پلاسٹک کی بالکل بچوں کے کھلونے جیسی؟" میں نے واپس پلٹتے پلٹتے دوبارہ مڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں بھائی میں اس گھڑی کو نہیں پھینک سکتا یہ بہت قیمتی ہے۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"قیمتی ہے۔" میں نے تعجب سے کہا۔ "ایسا کیا ہے اس گھڑی میں ذرا دکھانا تو۔"

"قیمتی ان معنوں میں ہے بھائی کہ یہ مجھے کسی نے بڑے پیار سے تحفے میں دی تھی اور اشاروں میں کہا تھا کہ کبھی میرے اس تحفے کو خود سے جدا مت کرنا۔" اس نے ایک بار پھر پیار سے اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اشاروں میں کہا تھا' کیا مطلب' میں سمجھا نہیں۔" میں نے پوچھا۔

"میری زندگی کی یہ بڑی دردناک کہانی ہے۔" اس نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیسی کہانی؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"وہ بڑی ہی خوب صورت تھی بڑی بڑی جھیل جیسی آنکھیں' کالی گھٹاؤں جیسے بال' گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ' وہ میری اماں کے پاس آئی تھی اور چپ چاپ بیٹھ کر اماں کی رام کہانی سنتی رہتی تھی۔ میں نے کبھی اسے بولتے نہیں سنا۔ میں دل ہی دل میں سوچتا کہ اس کی آواز بھی بڑی سریلی ہوگی پھر کئی مرتبہ جب اماں کچن میں چلی جاتیں تو میں لپک کر اس کے پاس جا کر بیٹھ جاتا اور اس کے حسن کی تعریف کرتا وہ میری باتیں سنتی رہتی اور مسکراتی رہتی۔

پھر میں اپنے پیار کا اظہار کرتا تو وہ بجائے شرمانے کے مسکرانے لگتی اور پھر ایک دن بہت روح فرسا خبر ملی۔ میں تھک گیا اپنے پیار کا اظہار کرتے کرتے۔ تب پتا چلا میری محبوبہ تو گونگی اور بہری ہے۔

"اماں نے یہ بات مجھے بہت دکھ سے بتائی' پھر میں نے بھی اپنے کانوں کو ہاتھ لگا لیے اور اس کے عشق سے توبہ کر لی لیکن پھر وہ میرے پیچھے پڑ گئی اب وہ میرے پاس آ کر غوں غاں کرنے لگی۔ ایک دن یہ پلاسٹک کی گھڑی لے آئی اور بڑے پریم سے میری کلائی پر باندھ دی۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے اشاروں میں غوں غاں کرتے کرتے اس نے مجھے سمجھایا کہ یہ اس کے پیار کی نشانی ہے اسے کبھی خود سے جدا مت کرنا۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔ مرنے کا اشارہ اس نے بہت خطرناک کیا تھا۔ یعنی گلے میں دوپٹا باندھ کر پنکھے سے لٹک جاؤں گی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

بس بھائی وہ دن ہے اور آج کا دن ہے یہ گھڑی میری کلائی پر ہر وقت موجود رہتی ہے اماں کے انتقال کے بعد میں نے وہ گھر اور علاقہ ہی چھوڑ دیا۔ اب جب اپنی اس گونگی بہری محبوبہ کی یاد آتی ہے تو اس کے اس تحفے کو دیکھ کر یاد کر لیتا ہوں۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بات ختم کی۔

"تو تمہارے وہاں سے جانے کے بعد اس نے خودکشی نہیں کی۔" میں نے پوچھا اور یہ سب باتیں میں اس لیے کر رہا تھا کہ اسے اس بات کا اطمینان رہے کہ میں اس کی اس جھوٹی بکواس پر پوری طرح یقین کر رہا ہوں۔

"پتا نہیں بھائی میں دوبارہ وہاں کبھی گیا ہی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ مڑ کر چائے کی کیتلی چولہے پر رکھنے لگا اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ تب ہی میرے موبائل فون پر گولی استاد کا فون آیا کہ اس کا روزی میڈم والا کام کمپلیٹ ہو گیا ہے اگر میں اجازت دوں تو وہ مجھ سے ملنے کے لیے آ جائے۔" میں نے چند لمحے سوچا پھر کہا۔

"آ جاؤ۔" اور فون بند کر دیا۔

میں نے دلارے کو آواز دے کر بلایا اور کہا کہ میرے ایک دوست آنے والے ہیں تم چائے ابھی مت لاؤ میں ان ہی کے ساتھ چائے پیوں گا۔"

"ٹھیک ہے بھائی۔" اس نے جواب دیا اور کچن میں چلا گیا۔

اس کے جانے کے چند لمحے کے بعد میں ننگے پاؤں چلتا ہوا خاموشی سے کچن کی جانب گیا اور بہت احتیاط کے ساتھ اندر جھانک کر دیکھا اور تیزی سے واپس پلٹ آیا۔ کیونکہ مجھے جو دیکھنا تھا وہ میں دیکھ چکا تھا۔

"دلارے بیٹے تو تو گیا کام سے، تجھے تو دلہا اب میں اور گولی استاد بنائیں گے۔"

میں نے اپنے دانتوں کو پیستے ہوئے کہا اور گولی استاد کا انتظار کرنے لگا۔ تب ہی قدموں کی آہٹ ابھری میں نے دیکھا دلارے اندر آ رہا تھا نجانے کیوں اس وقت اسے اپنے سامنے دیکھ کر میرے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے اور اتنے واضح کہ دلارے بھی انہیں محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔

"کیا بات ہے کیوں آئے ہو؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہے بھائی؟" اس نے مسکین سی شکل بناتے ہوئے کہا۔

"یہ سوال تم نے کیوں پوچھا؟" میں نے کہا۔

"میرے آنے سے آپ کو غصہ جو آ گیا۔" اس نے اسی معصومیت سے کہا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے تم بتاؤ کیا کہنے کے لیے آئے تھے۔" میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو نارمل کر لیا۔

"میں تو یہ پوچھنے کے لیے آیا تھا کہ شام کے کھانے کے لیے کیا بناؤں اور وہ جو آپ کے دوست آ رہے ہیں تو کیا وہ بھی کھانا کھائیں گے چاول تو پڑے ہیں گوشت میں لے آیا تھا آپ پسند کرو تو میں بریانی بنا دوں۔" اس نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

"نہیں وہ کھانا نہیں کھائے گا بس تم چائے بنا لینا۔"

"اچھا تو پھر آپ مجھے پیسے دے دیں میں بازار جا کر کچھ بسکٹ اور سموسے وغیرہ لے آتا ہوں خالی چائے دیتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔"

"وہ میرا دوست ہے یا تمہارا اور کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"تکلف کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے آپ کے گھر آنے والا ہر شخص مہمان کا درجہ رکھتا ہے اور اماں کہتی تھیں کہ مہمان نوازی اللہ کو بہت پسند ہے آپ پیسے دیں میں بس ابھی فٹافٹ لے کر آتا ہوں نا۔" اس نے بات بالکل ٹھیک کہی تھی لیکن میں جھنجلا پڑا۔

"کیا بات ہے تم باہر جانا چاہتے ہو تو صاف صاف کہو خواہ مخواہ کی باتوں پر کیوں وقت ضائع کر رہے ہو۔" میں نے تیز نگاہوں سے اسے گھورا۔

"یہ بات نہیں ہے، میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا آپ تو ناراض ہو گئے ویسے مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کچھ پریشان ہیں کیا واقعی کوئی پریشانی کی بات ہے کہیں آپ کے دوست تو کوئی پریشان کر دینے والی خبر لے کر نہیں آ رہے۔" اس نے کہا۔

"دلارے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "اپنی حد میں رہو اور فضول میں میرے معاملات میں دخل اندازی کی کوشش نہ کرو ورنہ ابھی گھر سے باہر نکال دوں گا مجھے ضرورت نہیں ہے تمہاری۔"

مجھے حقیقت میں اس پر بے حد غصہ آیا تھا۔

"میرا بولنا اگر آپ کو برا لگتا ہے تو میں آئندہ خاموش رہوں گا لیکن اللہ کے واسطے آپ مجھے یہاں سے مت نکالیں میرے پاس تو کوئی دوسرا ٹھکانہ بھی نہیں ہے۔" اس نے بھاگ کر میرے قریب آ کر میرے پاؤں پکڑ لیے اور رونی صورت بنالی۔

اور اسی وقت ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ تو میں نے اپنے پاؤں کھینچ لیے اور اس سے کہا کہ وہ جا کر دروازہ کھولے۔ وہ اس طرح تیزی سے اٹھ کر گیا کہ اگر ایک لمحے کی بھی دیر ہو گئی تو قیامت آ جائے گی۔

اور جیسا کہ میں سمجھ رہا تھا ویسا ہی ہوا آنے والا گولی استاد ہی تھا۔ وہ دلارے کو دیکھ کر حیران ہوا اور سیدھا میرے پاس آ کر بولا۔

"یہ کون ہے؟"

"ملازم ہے، آؤ تم بیٹھو اس کے بعد تم سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"اس بات کو تم چھوڑو یہ بتاؤ کہ کیا واقعی یہ محض ایک ملازم ہے یا اپنا ہی بندہ ہے۔" گولی استاد نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔

"ملازم ہے یار۔" میں نے جواب دیا۔

"کچھ اتا پتا ہے اس کا کہ یہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے کیونکہ تم کو یہ بات سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم لوگ اس طرح کسی کو بھی ملازم کی حیثیت سے اپنے گھروں میں داخل بھی نہیں ہونے دے سکتے۔ کیا پتا کون، کس بھیس میں ہے۔" گولی استاد نے فکرمند لہجے میں کہا۔

"مجھے تو یہ سی سائیڈ پر بے ہوش پڑا ملا تھا میں اس کو ہوش میں لایا تو اس نے اپنی کہانی سنائی کہ کچھ لوگ اسے زخمی کر کے بھاگ گئے ہیں اور یہ بھی کہ اس کا کوئی گھر اور ٹھکانہ نہیں ہے میں اسے اپنے ساتھ رکھ لوں تو میں اسے اپنے ساتھ لے آیا۔" میں نے تفصیل سے بتایا۔

میں گولی استاد کو دلارے کے بارے میں اپنے تمام شکوک و شبہات اور میری نگاہوں میں اس کی مخصوص حرکات کے بارے میں بتانے ہی والا تھا کہ کچھ بھی کہنے سے پہلے اچانک ہی ایک خیال آیا اور میں نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ننگے پاؤں تیزی سے اٹھ کر کمرے سے باہر آیا مجھے یہ شک تھا کہ دلارے یقیناً کمرے کے باہر کان لگائے کھڑا ہماری باتیں سن رہا ہوگا لیکن وہ وہاں نہیں تھا لیکن پھر بھی میں اپنے اطمینان کی خاطر دبے پاؤں کچن کی جانب بڑھا اور بہت احتیاط سے کچن میں جھانکا اور اندر کا منظر دیکھ کر میں سناٹے میں آ گیا۔ دلارے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اس کے سامنے سبزی کی ٹرے چھری اور پلیٹ رکھی تھی اور وہ اپنی پلاسٹک کی گھڑی کو اپنے کان سے لگائے ہوئے بہت انہماک سے کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

چوڑی فروش

بھائی عمران احمد'
خلوص بھرا سلام قبول کریں۔
کہتے ہیں لکھاری وہی کچھ لکھتا ہے جو وہ محسوس کرتا ہے اور دیکھتا ہے لیکن اگر لکھنے والے کی حوصلہ افزائی نہ ہو تو قلم رکنے لگتا ہے مجھے یہ تحریر کرتے ہوئے فخر اور خوشی ہو رہی ہے کہ آپ کی اور قارئین کی طرف سے بھرپور حوصلہ افزائی ملی۔ جس کی وجہ سے مجھے ہر ماہ کچھ نہ کچھ لکھنے کی تحریک ملتی ہے۔ بہرحال ایک نئی تفتیشی کہانی حاضر ہے۔ پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

آپ کا اپنا
ریاض بٹ
حسن ابدال

میں نے اپنی سروس میں بڑی ہنگامہ خیز زندگی گزاری تھی' دن رات لاشوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا کچھ لاشوں کی حالت دیکھ کر کچھ دیر کے لیے جذباتی ہو جاتا تھا اور سوچتا تھا کیا انسان اتنی درندگی کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے۔

وہ بھی ایک ایسی ہی لاش تھی ایک جوان عورت کی لاش۔ چہرے پر تشدد کے نشان تھے' جو دانتوں سے کاٹنے کے نشان لگتے تھے۔ میری کہانیاں خواتین بھی پڑھتی ہیں' اس لیے میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا' بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ عورت کا جواب ایک لاش تھی' بہت بُرا حال کیا گیا تھا پاس ہی چوڑیوں کا ٹوکرا پڑا ہوا تھا' جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ یہ عورت چوڑیاں بیچنے والی تھی۔

آگے بڑھنے سے پہلے اتنا بتا دوں کہ لاش ایک راہ گیر نے دیکھی تھی جو یہاں سے گزر رہا تھا' اس نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے تھانے میں اطلاع دینا ضروری سمجھا۔ میں نے تھانے میں اس سے ایک چھوٹا سا انٹرویو کر لیا تھا' یہ صبح صبح کا وقت تھا' مجھے ہنگامی طور پر کوارٹر سے بلایا گیا تھا۔ اس وقت ہم وقوعہ پر موجود تھے' میرے ساتھ سپاہی دلاور اور کانسٹیبل شمشاد تھے۔

ضابطے کی کارروائی کرنے کے بعد ہم نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی' سپاہی دلاور کو لاش کے ساتھ بھجوا دیا۔ عورت کو گلہ گھونٹ کر قتل کیا گیا تھا' یہ جگہ شہر (جہاں ہمارا تھانہ تھا) اور ایک گاؤں کے درمیان تھی۔ ویرانہ تھا' ان دنوں آبادی نہیں تھی' جس طرح آج کل ہے کہ گاؤں اور دیہات آپس میں مل گئے ہیں۔ کچھ مکان اس ویرانے سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھے' وہاں سے ہم نے چارپائی اور چادر منگوائی تھی اور لاش کی حالت کے پیش نظر اس کے اوپر ڈال دی تھی' ظاہر ہے کچھ بندے بھی آ گئے تھے۔

کانسٹیبل شمشاد نے لاش اور کھروں کے فوٹو بنا لیے تھے' ہم نے قریبی آبادی میں تفتیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایک ریٹائرڈ فوجی' ہمیں اپنے گھر لے گیا' اس نے ہماری خاطر تواضع کے لیے تگ و دو کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے منع کر دیا یہ فوجی (ریٹائرڈ) ہمیں راستے میں مل گیا تھا' ہم نے اسے صورت حال بتائی تھی اور اسے کہا کہ ہمارے سامنے بیٹھے۔

بندہ ذہین اور اس عمر میں بھی پھرتیلا لگتا تھا' ہم اس کا نام قدیر فرض کر لیتے ہیں۔

"ہاں تو قدیر صاحب! آپ نے اس چوڑی فروش عورت کو بھی اپنی ڈھوک میں دیکھا تھا۔"

قارئین! جہاں ہم بیٹھے تھے' یہ ایک ڈھوک تھی' نام میں نہیں بتاؤں گا' آپ آگے کہانی سنیے۔

"تھانیدار صاحب! اس معاملے میں عورتیں زیادہ بہتر بتا سکتی ہیں کیونکہ..... خیر آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔" پھر وہ اٹھ کر چلا گیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ ایک دھان پان سی لڑکی کے ساتھ داخل ہوا' لڑکی کی عمر بیس' بائیس سال ہوگی' رنگ گندمی تھا' آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور ماتھا چوڑا تھا۔ اس نے اپنا سر اور جسم ایک دھاری دار کالی چادر سے ڈھانپا ہوا تھا۔ لڑکی ہمارے سامنے آ کر بیٹھ گئی' قدیر نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صاحب! یہ میری بیٹی فہمیدہ ہے' آپ اس سے ہی پوچھ لیں۔"

"ہاں بھئی فہمیدہ!" میں نے چوڑی فروش عورت کی لاش کی وہ تصویر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا جس میں صرف چہرہ کو فوکس کیا گیا تھا۔ "اس عورت کو تم نے کبھی دیکھا تھا؟"

"دیکھیں جی! اس چوڑی فروش عورت سے میں نے کل ہی چوڑیاں چڑھوائی تھیں' اس وقت ابو گھر میں نہیں تھے۔"

پھر اس نے اپنی دونوں بانہیں میرے سامنے کر دیں' ایک میں سبز اور دوسرے میں فیروزی رنگ کی چوڑیاں تھیں۔ یہ مینا چوڑیاں تھیں' باریک باریک مینا چوڑی کو خوب صورت سمجھا جاتا ہے۔

یہ لڑکی باتوں سے اپنی عمر سے زیادہ لگتی تھی بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شادی شدہ تھی اور ان دنوں باپ کے گھر آئی ہوئی تھی' اس کا بھائی فوج میں تھا اور ماں اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔

"یہ کس وقت کی بات ہے؟" میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کر دیا۔

"تقریباً تین بجے کی بات ہے۔" فہمیدہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"پہلے بھی تم نے کبھی اس کو یہاں دیکھا تھا؟"

"نہیں جی۔" اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

ہمارے لیے فی الحال اتنا ہی کافی تھا' ہم وہاں سے اٹھ کر تھانے آ گئے۔ راستے میں کانسٹیبل شمشاد نے مجھ سے کہا تھا۔

"سر! یہ واردات رات کے پہلے پہر یا شام کے بعد کی لگتی ہے۔"

ان دنوں سورج چھ بجے غروب ہو جاتا تھا۔ تھانے میں مجھے کچھ گہما گہمی نظر آئی۔ جب میں اپنے کمرے میں بیٹھ چکا تو مجھے بتایا گیا کہ کچھ لوگ ایک عورت کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانے آئے ہوئے ہیں' جب وہ میرے سامنے آئے تو میں نے دیکھا' وہ جھگیوں والے ہیں' دو مرد اور ایک عورت تھی۔

انہوں نے بتایا کہ ان کے ڈیرے کی ایک عورت کل سے لاپتا ہے' بعد میں یہ عورت وہی چوڑیاں بیچنے والی نکلی جس کی لاش اب اسپتال میں پڑی تھی۔

وہ دو میل دور سے آئے تھے انہوں نے بتایا کہ "انہیں کچھ پتا نہیں تھا' تھانے میں آ کر پتا چلا کہ ......" پھر وہ رونے لگ گئے تھے۔

ڈیرہ دو میل دور تھا' طاہرہ کے ماں باپ فوت

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو چکے تھے۔ ہم نے رپورٹ ایک گمشدگی کی نہیں قتل کی درج کرنی تھی۔ وہ ہم نے کرلی اور انہیں کہا کہ کل شام سے ذرا پہلے آ کر لاش لے جائیں۔

وہ روتے ہوئے چلے گئے' آج کل طاہرہ ان کی ہی جھگی میں رہتی تھی۔ ان کے نکلتے ہی اے ایس آئی رانا تنویر اندر داخل ہوا اور مجھے سلام کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔

''سر! مجھے پتا چلا ہے کہ ایک چوڑی فروش کی لاش ملی ہے۔'' اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

''تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' پھر میں نے اسے ساری تفصیل بتادی۔ اسے آج کچہری سے ہو کر آنا تھا' اس لیے لیٹ آیا تھا۔

''سر! کوئی حد نہیں ہے انسان کی درندگی کی' خیر ہم اس کو واپس تو نہیں لاسکتے' البتہ قاتل یا قاتلوں کو قرار واقعی سزا تو دلوا سکتے ہیں۔'' رانا نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا۔

''بالکل بھئی' یہ ہمارا فرض بھی ہے اور ڈیوٹی بھی ہے۔'' میں نے مضبوط اور اٹل لہجے میں کہا۔

ہم نے انہی باتوں کے دوران کھانا کھایا' چائے پی اور ایک لائحہ عمل تک پہنچ گئے۔

رانا اٹھ کر چلا گیا۔ یہاں یہ بات بتادوں کہ چوڑیوں کا ٹوکرا اس وقت تھانے میں پڑا ہوا تھا جو ابھی ہمارے پاس ہی رہنا تھا۔

ڈھوک میں ہم نے جان بوجھ کر زیادہ تفتیش یا پوچھ گچھ نہیں کی تھی تاکہ اگر قاتل یا قاتلوں کا تعلق اسی ڈھوک سے ہے تو وہ ہوشیار نہ ہوجائیں' ہم نے اب خفیہ طور پر سب کچھ کرنا تھا۔

رانا اسی سلسلے میں گیا تھا۔ شام سے ذرا پہلے رانا آ گیا۔ اس کی تفتیش یا پوچھ گچھ سے جو کہانی سامنے آئی' اس کا خلاصہ میں آپ کی خدمت میں پیش کردیتا ہوں۔ کل بدنصیب چوڑی فروش عورت نے ڈھوک کے چار گھروں میں چوڑیاں بیچی تھیں' آخری گھر سے وہ چار بجے کے قریب نکلی تھی اس کے بعد ڈھوک میں اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ یہ ساری باتیں ہماری مخبر عورت نے خفیہ طریقے سے ڈھوک میں چل پھر کر پتا کی تھیں۔ ان میں ایک کام کی بات معلوم ہوئی تھی' جس کا ذکر آگے آئے گا۔

اگلے دن تقریباً ایک بجے کے قریب لاش آ گئی۔ عورت کے لواحقین آئے بیٹھے تھے' وہ روتے ہوئے لاش لے کر چلے گئے اور میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے میرے بیشتر اندازوں کی تصدیق کردی' عورت کو تین چار بندوں نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا اور آخر میں گلا گھونٹ کر ہلاک کردیا تھا۔ کچھ باریک اور شرمناک باتیں بھی لکھی تھیں جن کا ذکر مناسب نہیں ہے۔ موت کا وقت آٹھ اور نو بجے کے درمیان لکھا تھا۔

جہاں سے لاش ملی تھی' وہاں سورج غروب ہونے کے بعد کوئی جاتا ہی نہیں تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شاذونادر ہی اس ویرانے کی طرف کوئی جاتا تھا۔ میں نے رپورٹ پڑھ کر رانا کی طرف بڑھادی۔

وہ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے اسے پڑھنے لگا' کچھ دیر کے بعد وہ بولا۔

''سر یہ بات تو ثابت ہو ہی گئی ہے کہ چوڑی فروش کے لیے دل میں قاتلوں نے بہت غصہ رکھا ہوا تھا اور یہ غصہ یا عداوت انتہا کی بلندیوں کو چھو رہی تھی لیکن......؟''

''لیکن کیا رانا صاحب؟'' میں نے میز پر رکھے کاغذات پر پیپر ویٹ رکھتے ہوئے کہا۔

''سر! اسے چار بجے کے بعد ڈھوک میں نہیں دیکھا گیا' وہ اس ویرانے کی طرف کیا لینے گئی تھی اور وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اس کے ساتھ ایسا بہیمانہ سلوک کیا اور آخر میں اسے قتل کرکے چلتے بنے۔''

''بھئی ابھی تو تفتیش کی گاڑی پٹڑی پر خراماں خراماں چڑھی ہے' آگے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ سر ہلا کر رہ گیا اور کچھ دیر کے بعد اٹھ کر چلا گیا۔

اگلا دن ہمارے لیے ایک اور لاش کا تحفہ لے کر آیا۔ میں قدیر صاحب کو کہہ آیا تھا کہ اگر کوئی بات ہو تو وہ فوری طور پر آ کر مجھے بتائے۔

اور اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا' اس نے مجھے پہلی ملاقات میں بتایا تھا کہ وہ کبھی کبھی اپنی شکاری بندوق لے کر اس ویرانے کی طرف نکل جاتا ہے۔ وہ پرندوں کا شکار کرتا تھا۔

اس نے بتایا کہ جہاں سے لاش ملی تھی وہاں سے تقریباً دو سو گز آگے گھنے درخت ہیں' وہ جگہ کھڈ نالوں والی ہے اور تقریباً بیس پچیس فٹ گہری ہے' درختوں پر اس نے گدھ دیکھے تھے اور ہمیں اطلاع دینے دوڑا آیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں اس کے ساتھ وہاں پہنچ گیا' ہمارے ساتھ دو سپاہی اور کانسٹیبل شمشاد بھی تھا۔

ہم اوپر ٹیلے پر کھڑے ہوگئے اور سپاہیوں کو صورت حال معلوم کرنے کے لیے نیچے بھیج دیا۔ قدیر صاحب نے ہوائی فائر کرکے فی الحال گدھوں کو اڑادیا تھا' لیکن وہ تھوڑی دور آسمان پر اڑ رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے لیے ایک سپاہی نے نیچے سے آواز دے کر کہا۔

''سر نیچے آجائیں' یہاں ایک جوان کی لاش پڑی ہے۔''

پھر میں' قدیر صاحب اور کانسٹیبل نیچے چلے گئے۔ وہاں ہمیں آدھی دبی ہوئی لاش نظر آئی' چھاتی تک لاش ننگی ہوگئی تھی۔ دونوں ہاتھ کہنی تک کھائے ہوئے تھے اور یہ کارنامہ کتوں یا گیدڑوں کا لگتا تھا۔ لاش یقیناً دبائی گئی تھی' جسے جانوروں نے آدھا ننگا کردیا تھا۔ لاش کی حالت دیکھ کر یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی گدھ اس تک پہنچے تھے ورنہ چہرہ سلامت نہ رہتا یہ ایک خوبرو جوان کی لاش تھی' بال گھنگھریالے تھے۔

میں نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ باقی لاش کو بھی مٹی سے نکالیں' جب ہم تھانے سے چلے تھے تو ہر قسم کا سامان ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ اس لیے لاش کو بالکل ننگا یعنی زمین سے نکالنے میں سپاہیوں کو کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ میں پاؤں کے زور پر نیچے بیٹھا اور لاش کا معائنہ کرنے لگا۔

لاش اکڑ گئی تھی اور دو دن پرانی یعنی اسی رات کی لگتی تھی' جس کی صبح طاہرہ (چوڑی فروش) کی لاش ملی تھی۔ قدیر بھی میرے ساتھ بیٹھ گیا' اس کی دلچسپی دیکھ کر میں خاموش تھا۔ لاش کی دائیں پسلی میں ایک گہرا زخم تھا' جو گردے کی سیدھ میں تھا۔ ایسا ہی زخم مجھے بائیں پسلی میں بھی نظر آیا۔ یہ زخم کسی تیز دھار خنجر یا چھری کے لگتے تھے۔

قدیر صاحب مجھ سے پہلے اٹھ کھڑے ہوئے اور جب میں کھڑا ہو کر ان کے سامنے ہوا تو وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”تھانیدار صاحب! کتنا ظلم ہوا ہے اس جوان کے ساتھ بھی......“

”واقعی‘ قدیر صاحب!“ میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

کانسٹیبل شمشاد اور سپاہی اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ جب وہ فارغ ہوئے تو قدیر صاحب بولے۔

”اگر آپ اجازت دیں تو میں سپاہیوں کو ساتھ لے جاؤں اور چارپائی کا بندوبست کردوں۔“

”قدیر صاحب نیکی اور پوچھ پوچھ......“ میں نے سپاہیوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ چلے گئے اور ہم اس ویرانے میں لاش کے پاس تنہا رہ گئے‘ میرے پاس سروس ریوالور موجود تھا۔ جب کہ کانسٹیبل کے پاس رائفل تھی‘ جو موقع آنے پر آگ اگل سکتی تھی۔

”سر! ذرا ادھر آئیں۔“ کانسٹیبل مجھے تقریباً بیس پچیس گز دور لے گیا۔

میں نے آس پاس غور سے دیکھا تو ساری صورت حال واضح ہوگئی‘ وہاں کافی مقدار میں خون تھا‘ زمین دھول والی تھی کھرے بتا رہے تھے کہ یہاں لڑائی ہوئی ہے اور یہ بھی پتا لگتا تھا کہ طاہرہ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا یہاں ہی ہوا تھا بعد میں گلا گھونٹ کر اس کی لاش کو اوپر رکھ دیا گیا تھا۔ وہاں جہاں ہمیں لاش ملی تھی اس سے قاتلوں کا کیا مقصد تھا؟ یہ ابھی اندھیرے میں ہی تھا۔

مقتول قدیر صاحب کے لیے اجنبی تھا لیکن انہوں نے کہا تھا میں جاسوسی کروں گا‘ میں قدیر صاحب کو سمجھ گیا تھا۔ قارئین! آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے تقریباً دو گھنٹے بعد ہم تھانے پہنچ سکے تھے‘ لاش سپاہی اسپتال لے گئے تھے‘ پوسٹ مارٹم کے لیے۔ اس سارے کھڑاگ میں دن کے دو بج گئے تھے۔

اے ایس آئی تھانے میں نہیں تھا۔ شام سے ذرا پہلے قدیر صاحب آگئے‘ ان کے ساتھ ایک معزز اور صاحب حیثیت بندہ بھی تھا‘ وہ پریشان اور اندر باہر سے ٹوٹا پھوٹا لگتا تھا‘ میں نے انہیں عزت سے بٹھایا۔ قدیر صاحب نے تعارف کا فریضہ نبھاتے ہوئے کہا۔

”تھانیدار صاحب! یہ ملک نثار ہیں‘ مقتول ان کا بیٹا ملک وقار ہے۔“

”اچھا۔“ میں نے غور سے ملک نثار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ویسے میں حیران تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں قدیر صاحب ذہین بندہ تھا‘ وہ میرے ماتھے پر سوچ کی لکیریں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے کھنکارا پھر گویا ہوا۔

”دراصل ملک نثار صاحب تھانے کی طرف آرہے تھے میں بھی چونکہ تھانے ہی کی طرف آرہا تھا اس لیے راستے میں یہ سارا معاملہ ہوگیا‘ میں نے مقتول کا حلیہ انہیں بتایا تو یہ فوراً بولے یہ تو اپنا وقار ہے۔“

”ملک صاحب مجھے افسوس ہے شاید آپ اپنے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانے آرہے تھے۔“ میں نے رسم دنیا نبھاتے ہوئے کہا۔

”تھانیدار صاحب! یہ کیا ہوگیا؟ وقار پرسوں یہ بتا کر گیا تھا کہ شام تک واپس آجائے گا لیکن......“ وہ خاموش ہوگیا۔

اس کے آنسو رواں ہوگئے۔ میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

”ملک صاحب حوصلہ کریں اور میرے چند سوالوں کا جواب دیں۔“

”جی فرمائیے۔“ اس نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

”آپ کا بیٹا کیا بتا کر گیا تھا کہ کہاں جا رہا ہے اور اس وقت کتنے بجے تھے؟“

”تقریباً تین سے اوپر ٹائم ہوگیا تھا۔ اس نے کہا تھا ذرا شہر جا رہا ہوں پھر اس نے اپنے گاؤں کا نام بتایا تھا۔ گاؤں ویرانے سے شمال کی طرف تھا جب کہ قدیر صاحب کی ڈھوک جنوب کی طرف۔“

”لگتا تھا طاہرہ اور وقار کا آپس میں کوئی چکر تھا اور انہوں نے ملنے کے لیے اس ویرانے کا انتخاب کیا تھا‘ حساب لگا کر میں نے اندازہ لگایا کہ تقریباً ساڑھے چار بجے وہ ویرانے میں پہنچ گئے ہوں گے۔

میں نے ملک کو تسلی دلاسہ دے کر رخصت کرتے ہوئے کہا تھا کہ کل لاش لے جانا۔ اس کے پاس میری بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں قدیر صاحب کی طرف متوجہ ہوگیا۔

”ہاں تو قدیر صاحب! آپ کس سلسلے میں تھانے آرہے تھے؟“

”تھانیدار صاحب! میں نے جاسوسی کی ہے تو پتا چلا ہے کہ دو بندوں نے چوڑی فروش عورت کو اس ویرانے کی طرف جاتے دیکھا ہے۔“

”اچھا۔“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”ان بندوں کو آپ ساتھ نہیں لائے؟“

”اوہ غلطی ہوگئی تھانیدار صاحب! خیر آپ کہتے ہیں تو ابھی لے کر آتا ہوں۔“ قدیر صاحب کھڑے ہوگئے۔

”نہیں‘ اب ہم سب کچھ سنبھال لیں گے‘ آپ جائیں اور اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں۔“

وہ سر ہلا کر اور مجھ سے مصافحہ کر کے چلے گئے۔

دہرے قتل کی یہ واردات پُراسرار سے پُراسرار ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں یہ بات بھی بتا دیتا ہوں کہ رانا کو مخبر عورت نے جو باتیں بتائی تھیں ان میں یہ بات بھی تھی کہ طاہرہ کو ویرانے کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔

اگلے دن حسب توقع لاش اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا ذکر آگے آئے گا‘ لاش لواحقین لے کر چلے گئے۔ اس دوران رانا اور ہمارے مخبر اپنا کام کر رہے تھے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں اور سپاہی دلاور جھگیوں والے ڈیرے کی طرف چل پڑے۔ ہم باقاعدہ وردی میں تھے‘ وہاں سراسیمگی پھیل گئی۔ یہ ڈیرہ تقریباً تیس بتیس جھگیوں پر مشتمل تھا۔

ہمیں مکھیا یا سردار کی جھگی میں بٹھایا گیا‘ سردار ایک ہٹا کٹا بندہ تھا۔ عمر پچاس سے تجاوز کر گئی تھی‘ آنکھیں ایسی تھیں جیسے سانپ کے زہر کو بطور نشہ استعمال کرنے والوں کی ہوتی ہیں۔ نام مجھے یاد نہیں رہا‘ اس لیے میں اسے سردار لکھوں گا۔

”ہاں سردار جی! کیا آپ طاہرہ کے قتل پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوہ جی! میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“ جب وہ بولا تو یوں محسوس ہوا جیسے کوئلے سے چلنے والے انجن سے آواز نکلی ہو۔

”آپ کا بیٹا اس کا منگیتر تھا اور شاید آپ تک بھی یہ بات پہنچی ہو کہ طاہرہ کی ساتھ ایک جوان

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی قتل ہوا ہے۔"
"مجھے پتا چل چکا ہے جی! ایسی حرافہ کا یہی انجام ہونا تھا۔"
"کیا مطلب؟" میں نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"آپ کا خیال ہے وہ جوان اور طاہرہ اس ویرانے میں ویسے ہی چلے گئے تھے۔" اس نے ذرا خشک لہجے میں کہا۔
مجھے بھی تاؤ آ گیا' میں نے تپے ہوئے لہجے میں اسے گھورتے ہوئے کہا۔
"آپ کا بیٹا بھی قاتل ہوسکتا ہے' آپ یہ بتائیں آپ کا بیٹا کدھر ہے؟"
"وہ تو جی......! میں نے دیکھا کہ اس کی اکڑ ختم ہوچکی ہے اور وہ بھیگی بلی بن گیا ہے۔
"بولو...... بولو...... جلدی بتاؤ۔"
"جناب جی...... وہ تو حیدر آباد گیا ہوا ہے۔ چوڑیاں لینے کے لیے۔" سردار نے جواب دیا۔
اس کے بعد میں نے کافی دیر اس کے ساتھ مغز ماری کی لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہوسکی۔
آتے آتے میں اسے کہہ آیا تھا کہ جونہی اس کا بیٹا واپس آئے اسے تھانے بھیج دے۔
سردار کے علاوہ طاہرہ کی سہیلی سے بھی ہم نے اکیلے میں باتیں کی تھیں۔ جن میں ہمیں اس دہرے قتل کی واردات کو حل کرنے کے سلسلے میں روشنی کی لکیر نظر آئی تھی۔
اس کا ذکر آگے آئے گا۔ یہاں اس بات کی وضاحت کردوں کہ ڈیرے پر جانے سے پہلے ہم نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان سے یہ پتا چلا تھا کہ طاہرہ سردار کے بیٹے کی منگیتر تھی۔
تھانے میں آ کر پتا چلا کہ قدیر صاحب میرے منتظر ہیں۔ میں نے اپنے کمرے میں بیٹھتے ہی انہیں بلالیا اور ساتھ ہی سپاہی سے یہ بھی کہہ دیا کہ چائے اور سموسے بھی بھیج دے۔ جب وہ مجھ سے مصافحہ کرکے بیٹھ گئے تو میں نے بغور ان کے چہرے کا جائزہ لیا' وہاں مجھے دبا دبا جوش نظر آیا۔
"ہاں تو قدیر صاحب کیا خبریں ہیں؟"
"جناب خبریں ملک نثار کے متعلق ہیں۔" قدیر صاحب نے دبے دبے جوش بھرے لہجے میں کہا۔
"کیا مطلب؟" میں پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوگیا۔
"وقار...... ان کا سوتیلا بیٹا ہے' ان کی بیگم جہیز میں لائی تھیں۔"
مختصراً پتا یہ چلا کہ ملک نثار کی پہلی بیوی فوت ہوچکی تھی۔ وقار کی ماں عشرت بیگم نے اپنے خاوند سے طلاق لے کر ملک وقار سے شادی کی تھی اور بیٹے کو بھی ساتھ لے آئی تھی۔ بیٹا بالغ و عاقل تھا وہ ماں کے ساتھ رہنا چاہتا تھا' ملک نثار اور عشرت بیگم کا کوئی چکر چلا تھا' ملک نثار کو یہ پتا چل چکا تھا کہ کسی چوڑی فروش کی لاش بھی ویرانے سے ملی ہے۔ اب مقتول (وقار) کے پوسٹ مارٹم کے متعلق بات ہوجائے۔
پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر نے واضح طور پر لکھا تھا کہ دو مختلف ہاتھوں سے خنجر یا چھری کے وار کیے گئے تھے۔ وار...... تلے ہاتھوں سے کیے گئے تھے' دونوں گردے چر گئے تھے۔ دونوں زخموں کو دیکھ کر میں نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا۔
اگلے دن طاہرہ (مقتولہ) کا منگیتر آ گیا' وہ اپنے باپ کی بالکل کاپی تھا۔ وہ چہرے سے ذرا پریشان نہیں لگتا تھا' نام اس کا اکبر تھا' اس نے میرا شک رفع کردیا' اس نے حیدر آباد میں ان دنوں کے مجھے ثبوت بھی دیئے جن دنوں یہاں قتل کی وارداتیں ہوئی تھیں۔ چوڑیاں خریدنے کی رسیدیں بھی دکھائیں۔ ریلوے کے ٹکٹ بھی دکھائے' میں نے اسے فارغ کردیا لیکن ساتھ یہ بھی تاکید کردی کہ وہ تھانے میں اطلاع دیئے بغیر کہیں نہ جائے۔ اب ان باتوں کا ذکر ہوجائے جو مقتولہ کی قریبی سہیلی رشیدہ سے ہوئی تھیں۔
قارئین آج کافی عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مجھے یوں محسوس ہورہا ہے' جیسے رشیدہ میرے سامنے بیٹھی ہو اور یہ سب باتیں مجھے سنا رہی ہو۔
"تھانیدار صاحب! طاہرہ میری گہری سہیلی تھی' وہ ڈیرے والوں سے بہت مختلف اور زیادہ حساس تھی۔ کردار کی مضبوط تھی' میری طرح نہیں تھی میں بھی چوڑیاں بیچنے جاتی ہوں' میرا خاوند ہے جو سارا دن چارپائی پر پڑا چرس بھرے سگریٹ پیتا رہتا ہے اور کبھی کبھی مجھے مارنے کے علاوہ وہ کچھ نہیں کرتا۔ یہ پیٹ اور میرا خاوند بڑا پاپی ہے' چوڑیاں بیچنے سے اتنا پیسہ حاصل نہیں ہوتا جس سے دو پیٹوں کی آگ بجھنے کے علاوہ خاوند کا نشہ بھی پورا ہوسکے' ساتھ ہی اسے نت نئے کھانوں کا بھی شوق ہے اس لیے تھانیدار صاحب! میں اپنی عزت بھی بیچتی ہوں' ہم تو مٹی کے پتلے ہیں' تھانیدار صاحب! لیکن طاہرہ نے اپنی منزل چن لی تھی۔ وقار سے وہ محبت کرتی تھی اور اس ویرانے میں وہ ملتے تھے۔ وقار نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے شہر لے جائے گا اور وہ وہاں کچہری جا کر شادی کرلیں گے۔ طاہرہ کو اکبر ذرا بھی پسند نہیں تھا وہ بھی میرے خاوند کی طرح ہے اور ایک بات میں آپ کو بتادوں کہ اکبر اتنا ہی دار اور غیرت والا نہیں ہے جو غیرت میں آ کر قتل کردے۔ آپ تھانیدار صاحب! قاتل اپنی دنیا میں ہی ڈھونڈیئے لیکن ایک بات کا مجھے جواب دے دیں اگر آپ نے قاتل پکڑ بھی لیے تو کیا اس سے طاہرہ اور اس کے خواب واپس آسکتے ہیں' کیا اس نے اپنے لیے عزت والا راستہ چن کر غلطی کی تھی۔"
میں اسے کیا جواب دیتا' کوئی جواب دے ہی نہیں سکتا تھا لیکن ہم نے قاتل پکڑنے تو تھے انہیں آزاد تو نہیں چھوڑ سکتے تھے سو اس کے لیے ہم تفتیش کے گھوڑے دوڑاتے رہے۔
جن دو بندوں نے طاہرہ کو ویرانے کی طرف جاتے دیکھا تھا' ان کو ہم نے بلالیا۔ وہ میرے کمرے میں آئے تو اس وقت اے ایس آئی رانا تنویر میرے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان کی عمریں تیس اور پینتیس سال کے درمیان تھیں۔ ایک کا رنگ گورا جب کہ دوسرا سانولے رنگ کا تھا۔ میں نے اور رانا تنویر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے اور ہم نے ایک کو باہر بھیج دیا۔
جو ہمارے پاس رہ گیا اس کا نام طارق تھا جب کہ دوسرا اکرم تھا۔
"طارق بھائی! تم نے اس دن کس وقت چوڑی بیچنے والی کو ویرانے کی طرف جاتے دیکھا تھا؟"
"جناب! اس وقت تقریباً چار بج چکے تھے۔"
"کیا تمہارے پاس گھڑی تھی؟" میں نے دیکھا کہ اس کی کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی ہے۔
"جی ہاں تھانیدار صاحب!" اس نے مجھے اپنی گھڑی دکھائی۔
"لیکن طارق صاحب! آپ کو اس وقت

WWW.PAKSOCIETY.COM

گھڑی دیکھنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی تھی۔" اچانک رانا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا کہ اس سوال پر وہ سراسیمہ نظر آیا تھا۔

میں نے بھی اسے گھورنا شروع کردیا۔

"وہ جناب! ویسے ہی میں نے گھڑی دیکھ لی تھی۔" اس نے جواب دیا تو مجھے دال میں کچھ کالا نظر آیا۔

"چلو تم نے ویسے ہی گھڑی دیکھ لی تھی لیکن کیا تم چوڑی فروش عورت کا تعاقب کررہے تھے۔" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ میرے لہجے سے وہ کانپ گیا' بولا کچھ نہیں۔

میں نے گھنٹی بجائی' چپراسی اندر داخل ہوا تو میں نے اس سے کہا۔ شمشاد کو بھیج دو۔ اس کے آنے پر میں نے طارق کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"اسے اپنی بیرک میں بٹھاؤ اور اکرم کو اندر بھیج دو۔"

وہ اندر آیا تو میں نے اسے کھڑا رہنے کے لیے کہا اور جارحانہ لہجے میں پوچھا۔

"اکرم میاں! تمہارا دوست تو سچ بول کر چلا گیا ہے' اب تمہاری باری ہے۔"

"جناب! میں بھی سچ ہی بولوں گا۔" اس نے دلیر بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم چوڑی فروش عورت کا تعاقب کیوں کررہے تھے۔ تم دونوں کو ایک تیسرے شخص نے اس کے تعاقب میں ویرانے کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔"

میں نے اس سوال میں تھوڑا سا جھوٹ شامل کیا تھا حالانکہ کسی تیسرے شخص کا وجود فی الحال اس کہانی میں نہیں تھا۔

لیکن یہ تیر ٹھیک نشانے پر جالگا تھا۔

"اس کا مطلب ہے وقاص نے سب کچھ بتادیا ہے۔" میں ہنس پڑا اور شگفتہ لہجے میں بولا۔

"ہاں یار! وقاص تو بڑا بودا ثابت ہوا ہے۔"

یہ وقاص نیا کردار تھا' جب دل میں چور ہو تو اسی قسم کی باتیں زبان سے نکل جاتی ہیں۔ ہم نے طارق کو بھی بلالیا پھر ہم نے سب کچھ اگلوالیا۔ تینوں نے مل کر یہ واردات کی تھی۔

لیکن یہ سب کچھ ملک نثار نے کروایا تھا' وہ بہت بڑا اداکار تھا۔ جس نے تھانے میں آکر اداکاری کی تھی۔ جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ وقار عشرت بیگم کا بیٹا تھا۔ بقول قدیر کو وہ جہیز میں ساتھ لائی تھی' بعد کی تفتیش سے یہ بات ثابت ہوئی تھی کہ عشرت بیگم اتنے بڑے بیٹے کی ماں ہونے کے باوجود ملک نثار پر مرمٹی تھی اور اپنے اچھے بھلے خاوند سے طلاق لے کر ملک نثار کی بیوی بن گئی تھی ادھر ملک نثار نے وقار کو دل سے قبول نہیں کیا تھا پھر اسے اچانک پتا چلا کہ وقار ایک چوڑی فروش عورت سے محبت کرتا ہے' اس نے سوچا یہ تو بے عزتی والی بات ہے چاہے وقار سوتیلا ہی سہی اس کے خاندان میں شامل تو ہوگیا ہے ایک ملک خاندان کا لڑکا جھگیوں والی چوڑی فروش عورت سے عشق کرے' یہ اس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ وہ ویسے بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ دو تین دفعہ وقار نے اس کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ ایک دفعہ تو دوستوں کے سامنے کی تھی' اس نے ایک بھیانک منصوبہ بنایا۔ اکرم' وقاص اور طارق غنڈے بدمعاش تھے' وقاص تو بعد میں سامنے آیا تھا' ہم نے اکرم اور طارق کو تھانے بلانے سے پہلے ان کے متعلق معلومات حاصل کرلی تھیں' ملک نثار نے انہیں سمجھایا تھا کہ قتل اس طرح کرنا ہے کہ شک اس کے منگیتر پر جائے' وقار کی لاش کو دبانے کا مشورہ بھی اس نے دیا تھا تاکہ بیٹے کی گمشدگی کی اطلاع لے کر میرے پاس آئے اور ساری رام کہانی مجھے سنادے لیکن بُرا ہو کتوں کا' گیدڑوں کا اور سب سے بڑھ کر گدھوں کا' جنہوں نے سارے منصوبے کا ستیا بلکہ سوا ستیاناس ماردیا۔ شاید اس طرف تو کسی کا خیال بھی نہیں گیا تھا۔ قدرت تو ہر جگہ اپنا کرشمہ دکھاتی ہے اور خون رنگ بھی لاتا ہے۔

لیجیے قارئین! یہ خون جس طرح کیے گئے ان کے متعلق بھی بتادوں ملک نثار کو یہ پتا چل چکا تھا کہ وقار اور طاہرہ کی ملاقاتیں کہاں ہوتی ہیں' اسے یہ جگہ بہت مناسب معلوم ہوئی۔

اس دن طارق اور اکرم اس کے تعاقب میں تھے یعنی طاہرہ کے وقار دوسری طرف سے ویرانے کی طرف جاتا تھا۔ جہاں وقاص پہلے ہی چھپا بیٹھا تھا' جب طاہرہ اور وقار ملاقات کی مخصوص جگہ پر پہنچ گئے تو وقاص اپنی جگہ سے نکل کر اس راستے پر آگیا جہاں طارق اور اکرم کو آنا تھا' جب تینوں کا ملاپ ہوگیا تو وہ اس جگہ کی طرف بڑھنے لگے جہاں پیار کے دو متوالے ایک دوسرے میں گم بیٹھے تھے۔

تینوں کے پاس خنجر تھے' وہ اب ان کے ہاتھوں میں تھے۔ طاہرہ اور وقار تینوں خنجر برداروں کو اچانک اپنے سر پر دیکھ کر بوکھلا کر کھڑے ہوگئے۔ طارق نے طاہرہ کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف گھسیٹ لیا۔ وقار نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن وقاص اور اکرم نے اس کے پہلوؤں میں خنجر گھونپ دیئے پھر خنجر جھٹکا دے کر نکال لیے اور وقار گر کر تڑپنے لگا۔

وقار خالی ہاتھ تو تھا اس دن اسے موت گھیر کر ویرانے کی طرف لے گئی تھی۔ جب وقار ٹھنڈا ہوگیا تو تینوں نے زبردستی بڑے بہیمانہ طریقے سے طاہرہ سے زیادتی کی' وہ پہلے ہی وقار کی حالت دیکھ کر نیم جاں ہوگئی تھی وہ اسے بھنبھوڑتے رہے' درندوں کی طرح پھر اپنی اسکیم کے مطابق انہوں نے طاہرہ کا گلا گھونٹ دیا۔

وقار کو نیچے زمین کھود کر دفن کردیا' زمین نرم اور شورہ زدہ تھی۔ اپنی اسکیم کے آخری حصے پر عمل کرتے ہوئے طاہرہ کی لاش کو اوپر لے آئے اور ساتھ ہی چوڑیوں کا ٹوکرا بھی' وہ سمجھ رہے تھے وہ کبھی بھی پکڑے نہیں جائیں گے لیکن......؟ جب عشرت بیگم کو سارے حالات کا پتا چلا تو اس نے کہا تھا میں نے اپنے شریف اور محبت کرنے والے خاوند کو ٹھکرادیا تھا اسی کی مجھے سزا ملی ہے۔

قارئین! کیا واقعی یہ اسی کی سزا تھی؟ اس سوال کا جواب میں آپ پر چھوڑتے ہوئے بتادیتا ہوں کہ ہم نے ملک نثار' طارق' اکرم اور وقاص کو حوالۂ عدالت کردیا تھا۔ ساتھ یہ بھی واضح کردوں کہ طارق اور اکرم مقتولہ کو پھانسنے کی کوشش کرتے رہتے تھے اور اسے نوٹ دکھاتے رہتے تھے لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آئی' اسی لیے جب ان کو موقع ملا تو انہوں نے اسے بہیمانہ طریقے سے اپنی درندگی کا نشانہ بنایا۔

☐

WWW.PAKSOCIETY.COM

گرنڈ

محترم عمران احمد قریشی
السّلام علیکم
آپ کے حکم کے مطابق اس ماہ ایک مختصر سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں' آج کے دور میں محبت جیسا پاکیزہ جذبہ ایک کھیل بن کر رہ گیا ہے' خواہ خواتین ہوں یا مرد دونوں ہی اسے کھیل سمجھ کر "انجوائے" کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب انہیں ہوش آتا ہے اور وہ واپسی کا ارادہ کرتے ہیں تو ہر راستہ بند گلی کی جانب جاتا نظر آتا ہے' امید ہے یہ کہانی بہت سوں کی آنکھیں کھولنے کا سبب بنے گی۔

والسّلام
خورشید پیرزادہ
کراچی' سندھ

میرے والد کا ایک چھوٹا سا بزنس تھا، جسے میں سنبھالتا تھا۔ میں کچا مال آس پاس کے محلوں کے گھروں میں سپلائی کرواتا تھا۔ انہی میں ایک ثوبیہ نام کی لڑکی بھی تھی، جس کے گھر والے میرے گھر میں بنے گودام سے کچا مال لے جایا کرتے تھے۔ جیسے جیسے کام بڑھ رہا تھا ویسے ویسے کھپت پوری کرنے کے لیے میں کام پورا کروانے کے لیے گھروں کی تعداد بھی بڑھاتا جا رہا تھا۔ مال لینے کے لیے کبھی کبھی ثوبیہ خود بھی اپنی ماں، بہن کے ساتھ آ جایا کرتی تھی۔ وہ دل ہی دل میں مجھے پیار کرنے لگی تھی۔ یہ بات مجھے بعد میں اسی کی زبانی پتا چلی تھی۔

لیکن میں...... میں تو ردا سے پیار کرتا تھا اور اسی کا دیوانہ تھا۔ اس وقت میں نہ اس کا نام جانتا تھا اور نہ ہی یہ کہ وہ رہتی کہاں ہے۔ بس ایک ہی بار راستے میں اسے دیکھا تھا اور جسے پہلی نظر کی محبت کہتے ہیں میں اس کا شکار بن چکا تھا۔ میں نے اسے تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا کوئی پتا نہ چل سکا۔ یوں ملن سے پہلے ہی جدائی کا زخم اپنے دل پر لیے مغموم رہنے لگا، لیکن ایک دن جب ایک لڑکے کے ساتھ میرے ہاں سے مال اٹھانے آئی تو میں گنگ سا رہ گیا۔ میں اس کا گھر ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو گیا تھا اور وہ خود چل کر میرے ہی گھر آ گئی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور جب تک وہ موجود رہی میں آنکھوں کے راستے اسے اپنے دل میں اُتارتا رہا۔

میں ابو کا کام سنبھالنے کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کورس بھی کر رہا تھا۔ ایک دن میں بس اسٹاپ پر کھڑا تھا کہ اچانک میری نظر ردا پر پڑی اور میں چونک پڑا۔

ارے یہ میرے ہی محلے میں رہتی ہے اور میں اسے کہاں کہاں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ میں نے دل میں سوچا کہ شاید قدرت مجھ پر مہربان ہو رہی ہے اس لیے آج ردا خود میرے سامنے آ گئی ہے۔ آج سے پہلے وہ مجھے بس اسٹاپ پر اس لیے نہیں ملی تھی کہ اس کا اسکول سات بجے شروع ہوتا تھا لیکن اب موسم سرما کی وجہ سے اسکول کی ابتداء ساڑھے سات بجے کر دی گئی تھی یوں میرے دیدار کا وسیلہ خود بخود بن چکا تھا اور کبھی کبھی تو صرف اس کے دیدار کی خاطر میں انسٹیٹیوٹ دیر سے پہنچنے میں بھی حرج نہیں سمجھتا تھا۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ اس سے پہلے اسٹاپ پر پہنچ جاؤں۔ روزانہ وہ مجھے دیکھتی اور میں اسے۔ وہ ایک مسکراہٹ میری طرف اچھال دیتی جسے میں اپنی روح کے نہاں خانے میں بسا لیتا۔ اسے پتا تھا کہ میں کون ہوں۔ شاید اسی لیے وہ میری وہاں موجودگی سے بے چین نہیں ہوتی تھی۔

یہاں ثوبیہ کے دل میں میری چاہت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ جیسے ردا میرا پہلا پیار تھی ویسے ہی میں ثوبیہ کا پہلا پیار، وہ یہ سوچ کر مجھ سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کر پائی تھی کہ کہیں میں انکار نہ کر دوں' میں تو ردا کا دیوانہ تھا۔ اگر ثوبیہ ایسا کوئی اظہار کرتی تب بھی میں اسے منع ہی کر دیتا کیونکہ ردا کے سوا کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی میرے لیے محال تھا۔

2001ء کی نیو ایئر کے موقع پر میں نے ردا کے لیے نیو ائیر کارڈ لے رکھا تھا اسے دینے کے لیے' میں اس صبح جلدی بس اسٹاپ پر آ کر بیٹھ گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ حالانکہ اسے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی لیکن مجھے یہ عرصہ صدیوں کی مسافت سے کم محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ آئی تو میں نے اسے "نیا سال مبارک" کہا۔ اس نے بھی جواب میں "سیم ٹو یو" کہا۔ میں نے اس کے لیے لایا ہوا کارڈ آگے کرتے ہوئے کہا یہ نیو ایئر کارڈ آپ کے لیے۔ اس نے شکریہ کہہ کر ہنستے ہوئے کارڈ رکھ لیا۔ مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ شاید وہ بھی مجھ سے پیار کرنے لگی ہے۔

اس کے بعد وہی شب و روز کے معمول وہی کام وہی کمپیوٹر کورس وہی بس اسٹاپ پر ردا کا دیدار کرنا۔ چودہ فروری آئی تو میں نے پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا کہ "ویلنٹائن ڈے" کے موقع کی مناسبت سے ردا کے سامنے اپنی محبت کا اظہار ضرور کروں گا۔ مگر اسے سامنے پاتے ہی میرے دل میں ہچکچاہٹ سی ہونے لگتی تھی ایک عجیب سا وسوسہ دل میں جنم لینے لگتا تھا کہ اگر اس نے انکار کر دیا تو......؟ مگر اسے اپنے دل سے نکال باہر کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ اس وقت میری عمر انیس سال کی تھی اور وہ نویں کی طالبہ تھی۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ نئے نئے جذبے دل میں ابھرتے رہتے ہیں جن کی تسکین کے لیے بعض نوجوان تو حد سے ہی گزر جاتے ہیں لیکن میں ایک روایت پرست گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس لیے کسی ایسی ویسی حرکت کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ بہرحال مجھے اپنے ماں باپ کی عزت کا بھی لحاظ تھا۔

ادھر یہی کچھ حال ثوبیہ کا بھی تھا۔ وہ بھی مجھ سے اظہار محبت کرتے ہوئے ڈرتی تھی۔ مگر جیسے میں دیدارِ یار کے لیے بس اسٹاپ پہنچ جاتا تھا ویسے ہی وہ مجھے دیکھنے کام لینے کے بہانے میرے گھر آ جایا کرتی تھی۔

اگلے آٹھ مہینوں کے اندر میں اپنا کمپیوٹر کورس مکمل کر چکا تھا۔ لیکن میں اب بھی اسی بس میں سفر ضرور کرتا تھا جس میں ردا اسکول جاتی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کا پیار میرے دل میں بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

کبھی کبھی دل میں یہ روح فرسا خیال بھی ابھرتا کہ کہیں وہ کسی اور لڑکے سے تو پیار نہیں کرتی اور ایسا سوچنا ہی میرے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ لیکن اپنی تمامتر کم ہمتی کے باوجود میں نے اپنے پیار کا یہ سفر جاری رکھا۔

اگرچہ روزانہ ہم ایک ہی بس سے جاتے تھے لیکن اسٹاپ پر بات کبھی کبھار ہی ہو پاتی تھی وہ بھی رسمی سی۔ پھر وہی چودہ فروری اور پھر وہی ویلنٹائن ڈے اور اس بار میں پورا عزم کر چکا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے ردا سے اظہار محبت ضرور کروں گا۔ میں نے اپنے ایک دوست کے مشورے پر ردا کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

گفٹ اور پھول خریدے۔ اسے لے کر میں اسکول کے پاس والے اسٹاپ پر پہنچ گیا۔ لیکن آج ردا کی بجائے اس کی بہن نظر آئی شاید ردا آج چھٹی کرنے کی وجہ سے اسکول نہیں جا رہی تھی۔

میں ہمت کر کے اس کی بہن کے پاس گیا اور میں نے اس سے "ہیپی ویلنٹائن ڈے" کہا، چونکہ وہ مجھے پہچانتی تھی اس لیے اس نے بھی مسکراتے ہوئے "سیم ٹو یو" کہا۔

میں نے ہمت کر کے وہ گفٹ اور پھول ردا کی بہن کو دیتے ہوئے کہا کہ "میری طرف سے یہ ردا کو دے دینا پلیز۔"

اس نے مجھ سے پوچھا "تم یہ اسے کیوں دے رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "بس ایسے ہی۔"

وہ سمجھ گئی کہ آج ویلنٹائن ڈے ہے اور یہ شاید ردا سے اظہار محبت کا ایک طریقہ ہے۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا "ٹھیک ہے، یہ میں اسے دے دوں گی۔"

پھر دس منٹ بعد ہی ردا بھی آتی دکھائی دی۔ وہ سیدھی اپنی بہن کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کافی دور کھڑی تھیں اس لیے ان کے بیچ کیا باتیں ہوئیں یہ سننا مشکل تھا۔ وہ ردا کو میرے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کے رویئے سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ گفٹ لینے سے منع کر رہی ہے۔ اور یہ دیکھ دیکھ کے مجھ پر اداسی چھا رہی تھی۔ ردا کی بہن نے اشارے سے مجھے قریب بلایا لیکن میری ہمت نہ ہوئی تو وہ خود ہی میرے پاس آ گئی۔

"سوری..... وہ یہ نہیں لے رہی ہے۔"

بس اتنا سنتے ہی میری شکل رونے جیسی ہو گئی تھی۔ لیکن میں نے دل پہ جبر کر کے پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں۔"

میرے دوست کو پتا تھا کہ اب میں رو پڑوں گا اس لیے وہ مجھے گھر لے آیا۔ گھر پر بھی میں سارا دن تنہائی میں منہ چھپا کر روتا رہا اور دعا کرتا رہا کہ خدا اسے میرے پاس بھیج دے اور ہر لمحہ یہی لگ رہا تھا کہ جیسے ابھی وہ آ جائے گی اور گفٹ نہ لینے پر معذرت کا اظہار کرے گی۔ لیکن وہ نہیں آئی۔ میں اس دن اتنا رویا کہ آنکھوں کے سوتے خشک ہو گئے تھے۔

دس پندرہ دن کے بعد ایک لڑکی مجھے ملی اور کہا کہ "ثوبیہ آپ سے بہت پیار کرتی ہے۔"

تب میں نے جانا کہ ثوبیہ مجھ سے پیار کرتی ہے لیکن میں تو ردا کا دیوانہ تھا اس کا مثبت جواب کیسے دے سکتا تھا۔

لیکن ثوبیہ بھی شاید ارادہ باندھ ہی چکی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے ایک دوسری لڑکی کے ہاتھوں میرا موبائل نمبر منگوایا اور مجھے کال کی۔ "ہیلو..... تم نے کیا سوچا۔"

میں نے کہا "کس بارے میں؟"

وہ بولی "آئی لو یو۔"

مجھے یہ الفاظ آج سے پہلے کسی لڑکی نے نہیں کہے تھے۔ شاید یہ ان الفاظ کی حدت تھی کہ میرے دل پر چھائی ہوئی ردا کی محبت کی برف پگھلنے لگی اور جواباً میں نے بھی آئی لو یو کہہ دیا۔

اب تو تقریباً روزانہ ہی بات ہونے لگی اور بعض اوقات تو وہ اسکول کا پیریڈ مس کر کے پورا گھنٹہ مجھ سے بات کرنے میں گزار دیتی اور اس مقصد کے لیے ہم دونوں نے موبائل پیکیج کروا لیا تھا ورنہ جتنی دیر ہم بات کرتے تھے اس کا خرچہ پورا کرنے کے لیے تو شاید مجھے چوری کرنا پڑتی۔ اب تک سب ٹھیک چل رہا تھا۔ ثوبیہ کی میٹھی میٹھی باتوں نے میرے دل سے

ردا کا زخم مندمل کرنا شروع کر دیا تھا۔

مجھے اس کی ایک بات بہت بری لگتی تھی کہ وہ میرے اور اپنے پیار کے بارے میں سب سہیلیوں کو بتاتی رہتی تھی اور مجھے منع کرتی تھی کہ کسی کو کچھ مت بتانا۔

میں نے اسے کئی بار سمجھایا کہ وہ میرے بارے میں ہر کسی کو نہ بتایا کرے لیکن وہ نہیں مانتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اسکول اور محلے کی ہر سہیلی کو ہم دونوں کی محبت کی داستان مرچ مسالا لگا کر سنا چکی تھی۔

اب اگر کوئی اتنا اپنے پیار کا ڈھول پیٹنا شروع کر دے تو نظر تو لگنی ہی تھی اور ایک دن کسی کی نظر بد لگ ہی گئی۔

رفتہ رفتہ محلے کی سہیلیوں سے یہ بات کوٹھوں چڑھتی ان کے گھر والوں اور آس پڑوس والوں تک پہنچ گئی اور اس کی ماں کو بھی اس کا پتا چل گیا کیونکہ وہ اکثر اپنی ماں سے کسی سہیلی کا بہانہ کر کے مجھ سے ملنے آ جایا کرتی تھی۔ ایک دو بار اس کی ماں نے ہمیں پکڑ بھی لیا پھر کیا تھا پورے محلے میں ہمارا نام روشن ہونے لگا۔

گھر تک بات پہنچی تو ثوبیہ کے والد کو بھی اس سلسلے کا پتا چل گیا اور سب سے بڑھ کر اس کے کائیاں ماموں کو۔ اس نے میری ماں کو پیغام پہنچایا کہ شکیل کو سمجھا دینا کہ ثوبیہ سے دور رہے۔ لیکن ہم پھر بھی باز نہ آئے تو اس نے تین چار لڑکوں کے ساتھ مل کر مجھے اچھا خاصا سبق سکھا ڈالا اور میرے سینے پر پاؤں رکھ کر مجھے ایک بار پھر ثوبیہ سے ملنے سے منع کیا۔ میں اتنی مار کھا کر ڈر گیا تھا اس لیے نہ ملنے کی ہامی بھر لی۔

میں نے اپنے گھر والوں سے اپنی اس پٹائی کا حال چھپا لیا۔

کچھ دنوں بعد پھر ثوبیہ کا فون آیا۔ میں نے اس

تم روٹھ گئے ہم سے

تم روٹھ گئے ہم سے احساس ہوا ہم کو
دنیا کو بتانے کو کوئی بات نہیں ملتی
جس شب کے ستاروں میں تیرا عکس بنایا تھا
اک عمر سیاہی کی وہ رات نہیں ملتی
یہ شہر ہے اندھوں کا بینائی رہن رکھ دو
یہاں عشق کے مفلس کو خیرات نہیں ملتی
اس شہر کے لوگوں میں اک وقت گزارا ہے
تجھ جیسی انا والی کہیں ذات نہیں ملتی
مانا کہ یہ دنیا ہے دنیا کا ہے کیا کہنا
پر کیوں ہم سے تیری عادت نہیں ملتی
ہم عشق کے رسوائی، تم پیار کے سودائی
اک بھی تو سحر اپنی کوئی بات نہیں ملتی
اس دل کے سمندر کو دنیا سے جدا رکھا
آنکھوں کی بدلی میں برسات نہیں ملتی
غم چیز بری ہے جان، تم سے ملا ہے
ہر عشق کے سادھو کو یہ سوغات نہیں ملتی
تم لوٹ بھی آؤ تو غم ساتھ ہی لے آنا
کہ کوئی بھی خوشی ہم کو تا حیات نہیں ملتی

(سدرہ سحر عمران، کراچی)

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے ماموں کی ساری کارستانی بتادی۔ اس نے کہا میں سنبھال لوں گی۔ بس تم مجھ سے بات کرنا مت چھوڑو اور ڈرو مت میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔

محبوبہ کی طرف سے اتنی ہمت بڑھانے پر میرا جذبۂ عشق دوبارہ انگڑائیاں لینے لگا۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے جانو' جیسا تم کہو مگر اب کچھ ہونا نہیں چاہیے۔"

اس کے بعد اس نے اپنی ممانی سے کہا کہ "مامی ماموں سے کہنا کہ میں شکیل سے پیار کرتی ہوں۔ اب وہ شکیل کو کچھ نہ کہیں۔"

مامی نے یہ پیغام ماموں تک پہنچادیا۔

لیکن وہ شاید ہیر کے کیدو ماما کی نسل کا ہی تھا۔ کسی نہ کسی طرح مجھے تنگ کرتا ہی رہتا تھا۔ اس بات کو لے کر میرے اور ثوبیہ کے درمیان تکرار ہونے لگی۔ ہم بات بات پر ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔

میں نے اس سے کہا "دیکھو میں نے تمہیں پہلے ہی منع کیا تھا کہ کسی کو میرے بارے میں مت بتایا کرو لیکن تم تو پورے محلے میں ڈھول پیٹتی رہیں اور اب مجھے تمہارے ماموں کے چیلے چانٹوں سے پٹنا پڑ رہا ہے۔"

وہ بولی "تو میں کیا کرتی سب سہیلیاں کرید کرید کر تمہارے بارے میں پوچھا کرتی تھیں اور تمہارا نام لے لے کر مجھے چھیڑا کرتی تھیں۔"

ثوبیہ کی ایک سہیلی نورین تھی جس کا چال چلن مجھے مشکوک لگتا تھا اور اس کے بات کرنے اور رکھ رکھاؤ کا انداز بھی بازاری لڑکیوں جیسا تھا۔ میری نظر میں وہ ایک انتہائی گری ہوئی لڑکی تھی اور اس کا گھومنا پھرنا بھی غلط قسم کی لڑکیوں کے ساتھ تھا۔

میں نے ثوبیہ کو کئی بار روکا کہ وہ نورین کے ساتھ اپنی دوستی ختم کردے لیکن وہ نہیں مانتی تھی۔ اسے نورین میں کوئی برائی نظر نہیں آتی تھی۔

نورین نے آہستہ آہستہ اسے بگاڑنا شروع کر دیا۔

اب ثوبیہ اور میرے درمیان پیار سے بات تو ہوتی ہی نہیں تھی۔ جو کچھ وہ میرے پیار کے بارے میں نورین کو بتاتی وہ اسے غلط ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دیتی۔ شاید نورین میری نفرت کا انتقام میری محبت سے لے رہی تھی۔ میں ثوبیہ سے شادی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میرے والد نے میری شادی پہلے ہی سے گاؤں میں اپنے ایک دوست کی بیٹی سے طے کر رکھی تھی اور یہ حقیقت میں ثوبیہ کو پہلے بتا چکا تھا۔ پہلے تو یہ بات سننے کے بعد اس نے ایک ہفتے تک مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا لیکن پھر اس نے دوبارہ اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ محبت اور شادی دو الگ الگ موضوع ہیں۔ میں تم سے پیار کرتی ہوں اور ضروری تو نہیں کہ میری شادی تم سے ہی ہو۔ میرے لیے تو تمہاری محبت ہی کافی ہے۔ میں اس کے پیار کے جذبے سے اور زیادہ متاثر ہوا اور ردا نے میرے دل پر جو داغ لگایا تھا وہ ثوبیہ کی باتوں سے مکمل طور سے دھل چکا تھا۔

اس بات کو لے کر کہ میں ثوبیہ سے شادی نہیں کر سکتا۔ نورین وقت بے وقت ثوبیہ کو میرے خلاف بھڑکاتی رہتی تھی کہ شکیل تمہیں محبت کا جھانسا دے کر بے وقوف بنا رہا ہے۔ یا وہ اتنا کم ہمت ہے کہ اپنے ماں باپ کے سامنے تم سے محبت اور شادی کا اظہار نہیں کر سکتا۔ لیکن اکثر ثوبیہ اس کی ان باتوں کو ٹال جایا کرتی تھی۔

یہاں تک تو بات ٹھیک تھی۔ لیکن اب نورین حد سے آگے گزرنے لگی تھی۔ اس نے اپنے بچھائے ہوئے جال میں آہستہ آہستہ ثوبیہ کو پھانسنا شروع کر دیا۔

اس کا ایک بوائے فرینڈ تھا' اس نے نورین سے کہا کہ "یار میرا ایک دوست ہے' اس کی کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے' تم اس کے لیے کچھ کرو اور اس کی کسی لڑکی سے سیٹنگ کروادو۔"

اور نورین تو شروع سے تھی ہی غلط کردار کی لڑکی' اس کی سوچ بھی اس کے کردار کی طرح میلی تھی اور اس نے اپنے اس میلے پن کا ثبوت دیتے ہوئے ثوبیہ سے کہا کہ "یار تجھے ایک لڑکا بہت پسند کرتا ہے۔"

ثوبیہ نے کہا "تو میں کیا کروں۔ میں تو شکیل سے پیار کرتی ہوں اور اس کے علاوہ کسی اور سے پیار نہیں کر سکتی۔"

نورین نے اپنی بات میں وزن ڈالتے ہوئے کہا کہ شکیل تو ایک دن تجھے چھوڑ کر کہیں اور شادی کر لے گا۔ لیکن یہ لڑکا تجھے دل سے چاہتا ہے۔ اسی لیے تمہیں مشورہ دے رہی ہوں کہ اس لڑکے سے دوستی کرلو۔"

پھر ایک دن نورین نے ثوبیہ کی ایک تصویر اور اس کے موبائل کا نمبر بھی اس لڑکے کو دے دیا۔ اس لڑکے نے جو ظاہر ہے کہ نورین اور انہی کی ٹولی کا ایک آوارہ مزاج لڑکا تھا' اس نے ثوبیہ کو فون کرنا شروع کر دیا۔ دو ایک بار تو ثوبیہ نے کال ریسیو کرلی اور اسے منع کرتی کہ میں شکیل کو نہیں چھوڑ سکتی' میں اس سے پیار کرتی ہوں اور ہر حال میں اسی سے پیار کرتی رہوں گی۔"

تب وہ بھی نورین کی بتائی ہوئی یہ بات دوہراتا کہ شکیل تو تمہارے پیار کے جذبوں سے کھیل رہا ہے اور جب اس کا دل تم سے بھر جائے گا تو تمہیں چھوڑ کر کسی اور سے شادی کرلے گا۔

وہ لڑکا لفظوں اور لڑکیوں کو پٹانے کا ماہر کھلاڑی تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے ثوبیہ کو اس قدر رام کر ہی لیا کہ اب وہ اس کی کال کاٹنے کی بجائے اس کی باتیں سننے لگی تھی۔ اور ایک دن تو میرے تن من میں جیسے آگ سی لگ گئی جب وہ لڑکا جانے کیا سوچ کر میرے پاس آیا اور کہا کہ "ثوبیہ تم سے پیار کرتی ہے یا نہیں؟"

میں نے جواب دیا کہ وہ تو مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتی ہے۔

اس نے کہا کہ کیا تمہارے علاوہ وہ کسی اور سے بھی چکر چلا سکتی ہے؟

میں نے کہا کہ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ثوبیہ اس ٹائپ کی لڑکی نہیں ہے۔

میری اس بات پر وہ لڑکا ہنسنے لگا۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولا "تم بہت معصوم ہو میرے دوست جو ثوبیہ کی محبت پر یقین کر رہے ہو۔"

میں نے کہا "اگر کسی اور لڑکی کی بات ہوتی تو شاید میں یقین کر لیتا۔ لیکن ثوبیہ ایسی گری ہوئی لڑکی نہیں ہے۔"

تب اس لڑکے نے اپنی جیب سے ثوبیہ کی تصویر نکال کر دکھاتے ہوئے کہا "تو پھر یہ دیکھو۔ اس نے مجھے نشانی کے طور پر اپنی تصویر بھی دی ہے اور اپنا موبائل نمبر بھی۔ ہم دونوں دیر دیر تک آپس میں باتیں کرتے ہیں۔"

حالانکہ اسے یہ سب نورین نے دیا تھا لیکن میں شدید غلط فہمی کا شکار ہو چکا تھا۔

اس وقت میں اتنے ذہنی کرب میں مبتلا تھا کہ اگر اس لمحے ثوبیہ میرے سامنے ہوتی تو میں نہ جانے اس کا کیا حشر کر بیٹھتا۔ اس دن میرا سر بری طرح سے چکراتا رہا' کسی کام میں من نہیں لگ رہا تھا۔ گھر والوں نے پوچھا بھی کہ کیا بات ہے' مگر میں ٹال گیا۔ اب انہیں کیا بتاتا کہ عشق کی راہوں میں مجھ پر کیا کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

گزر رہی ہے۔

جب میرے دل میں اٹھنے والا ابال کچھ ٹھنڈا ہوا تو میں نے ثوبیہ کو فون کر کے شکایت کی کہ تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی ”کیوں...... میں نے کیا کیا ہے؟“

میں نے اسے ساری بات بتادی۔

اس نے روتے ہوئے کہا کہ ”میں تمہیں ساری بات بتانے والی تھی مگر موقع ہی نہیں ملا اور ہمت بھی نہیں ہوئی کہ پتا نہیں تم کیا غلط سوچو۔“

میں نے طنز کے تیر چلاتے ہوئے کہا ”ہاں‘ اس سے فون پر بات کرنے سے فرصت ملتی تو موقع ملتا نا بتانے کا اور یہ کیا بات کی تم نے غلط سوچنے کی‘ یہ سوچو کہ اب میرے دماغ میں کتنی غلط سوچیں پیدا ہو چکی ہیں۔“

فون پر ثوبیہ کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ بری طرح سے رو رہی ہے۔ جبکہ یہاں میری آنکھوں میں بھی بے وفائی کی وجہ سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

وہ مجھ سے اپنی اس غلطی کی معافی مانگنے لگی۔ لیکن میں نے دوبارہ کبھی فون نہ کرنے کا کہہ کر کال کاٹ دی۔

اگلے دن پھر اس کی کالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا‘ جنہیں میں نظر انداز کرتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر میں نے خود اس کا نمبر ملایا۔

میرا نمبر ریسیو کرتے ہی وہ سسکتے ہوئے کہنے لگی ”پلیز مجھے معاف کر دو نا‘ میں نے ایک دو بار انجانے میں ہی اس سے بات کی ہے۔ وعدہ کرتی ہوں کہ اب کبھی اس سے بات نہیں کروں گی۔ پلیز...... تم مجھے غلط مت سمجھو‘ میں تمہارے علاوہ کسی اور سے پیار کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔

میں نے اس کے لہجے میں سچائی کو محسوس کرتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے۔ مگر آئندہ کوئی شکایت نہیں ملنی چاہئے۔“

میری بات سن کر وہ خوش ہو گئی۔ اور ہم دونوں پھر راز و نیاز کی باتیں کرنے لگے۔

مختلف زبانوں سے ہوتی ہوئی میری محبت کی یہ داستان اس کے والد تک بھی پہنچ ہی گئی۔ انہوں نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا البتہ ثوبیہ کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ ”تم کیوں شکیل کے پیچھے پڑی ہو۔ اس کی شادی تم سے تو ہو ہی نہیں سکتی۔ کیوں خاندان کی عزت کو داغ لگا رہی ہو۔“

اس کے بعد ثوبیہ نے مجھے فون کر کے ساری بات بتاتے ہوئے پوچھا ”اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں‘ پاپا کی بات سنوں یا اپنے دل کی بات مانوں؟“

میں نے کہا اپنے پاپا کی بات مان لو۔

وہ بولی ”ٹھیک ہے۔ اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو پھر آج کے بعد ہم کبھی بات نہیں کریں گے۔“

میں نے بھی دل پر جبر کر کے اوکے کہہ دیا۔

مجھے پتا تھا کہ وہ مجھ سے بات کیے بغیر نہیں رہ سکتی اور یہی ہوا‘ اس نے مجھے دو دن کے بعد ہی کال کی اور کہا کہ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں اور تم سے بات کیے بغیر نہیں رہ سکتی‘ یہ میرے دل کی بات ہے جو میں پوری سچائی کے ساتھ تم سے بیان کر رہی ہوں۔ میری ایک ہی غلطی تھی کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا‘ اس کی ہمت افزائی کرتا رہتا تھا جس کی وجہ سے وہ حد سے آگے بڑھنے کو بھی تیار رہنے لگی تھی۔

پھر آخر وہ لمحہ بھی آ ہی گیا جب میرے والد کی مرضی کے مطابق ان کے دوست کی بیٹی کے ساتھ میری شادی ہو گئی۔ اس دن ثوبیہ نے دو گھنٹے تک موبائل میرے کانوں سے نہیں ہٹنے دیا تھا۔ میں نے بھی اسے تسلی دی کہ اگر میری شادی کہیں اور ہو رہی ہے تو کیا ہوا‘ یہ تو ہونا ہی تھا جو میں پہلے ہی تمہیں بتا چکا ہوں۔

تو اس نے کہا کہ ”پھر اب کیا ہوگا؟“

میں نے کہا ”ہونا کیا ہے‘ شادی ہوئی ہے نا‘ کوئی بات نہیں لیکن ہمارا پیار تو باقی رہے گا ضروری تو نہیں کہ جس سے پیار کیا جائے شادی بھی اسی سے ہو۔“

وہ بولی ”تو کیا اپنی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی تم میرے ساتھ وقت گزارو گے۔“

میں نے جواب دیا ”تو اس میں حرج ہی کیا ہے وہ میری زندگی میں نئی آئی ہے۔ پتا نہیں اس کا رویہ میرے ساتھ کیسا ہو‘ میں تمہاری دوستی اور پیار کھونا نہیں چاہتا۔“

غرض میں نے اسی طرح کی ڈھیروں تسلیوں سے اسے بہلا لیا۔ لیکن شادی کے بعد سب کچھ الٹ گیا۔ ایک تو میری بیوی ثوبیہ سے کہیں زیادہ خوب صورت تھی‘ دوسرے یہ کہ اس نے مجھے سچے پیار کی ان حقیقتوں سے روشناس کیا جن سے میں اب تک بیگانہ تھا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ شادی کے دسویں مہینے ہی جب میرے گھر میں ننھے سے مہمان کا اضافہ ہوا تو فطری طور پر میری مصروفیات اور توجہ کا مرکز تبدیل ہونا ہی تھا۔ یوں رفتہ رفتہ میں ثوبیہ کو وقت بے وقت جھڑکنے بھی لگا اور شاید میرے اسی رویئے نے اسے سخت بددل کر دیا تھا اور اس کے اسی ڈپریشن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نورین نے اسے نئے نئے دوستوں سے ملوانا شروع کر دیا اور وہ بھی میرا غم بھلانے یا ہلکا کرنے کی غرض سے ان کی محفلوں میں شریک ہونے لگی اور شیطانوں کی محفل میں غرق ہونے کا صاف مطلب یہی ہے کہ ایک دن انسان خود بھی انسانیت کھو کر ذلت کی دلدل میں کھو جائے اور یہی ثوبیہ کے ساتھ بھی ہوا۔ پہلے تو وہ صرف دوست بناتی رہی پھر انتقاماً خود کو لٹاتی رہی اور نشے کی لت نے تو اسے کہیں کا نہ چھوڑا۔ مجھے ان سب باتوں کا پتا اس وقت چلا جب ایک جنازے کو دیکھ کر میرے دوست نے مجھے بتایا کہ یہ ثوبیہ کا جنازہ ہے۔ جس نے اپنی محبت کی ناکامی کا انتقام خود سے ہی لیا اور تمہیں خبر تک ہونے نہ دی۔

یہ سنتے ہی میری آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا سا چھا گیا۔ میں بے ساختہ اس کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے آگے بڑھ گیا اور قبرستان میں کفن دفن کی رسم پوری کر کے سارے لوگ واپس لوٹ گئے لیکن میں ایک مجرم کی طرح سر جھکائے اس کی قبر کے پاس بیٹھا رہا‘ میری آنکھوں کا ساون رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس کی بربادی اور اس انجام کا ذمہ دار میں خود کو سمجھ رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں خود کو کیسے معاف کروں۔

ثوبیہ نے ساحل پر گھروندا بنانے کی ناکام کوشش کی تھی جو وقت اور حالات کی بے رحم موجوں میں اپنا وجود قائم نہ رکھ سکا اور میں...... میں کیا کرتا‘ نوجوانی کی نادانیاں اکثر ایسے حادثات کو جنم دیتی رہتی ہیں۔ ورنہ کوئی ذی شعور شخص کیوں ساحل پر گھروندا بنانے کی کوشش کرے گا۔

⌘

WWW.PAKSOCIETY.COM

حقیقت

محترم جناب ایڈیٹر نئے افق

آداب!

حقیقت کے عنوان سے ایک کہانی حاضر خدمت ہے' ہماری زندگی محبت اور نفرت کے درمیان بسر ہوتی ہے اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ زندگی عبارت ہے محبت اور نفرت سے۔ بظاہر یہ الگ الگ جذبے ہیں' محبت مثبت اور نفرت منفی جذبہ ہے لیکن اگر اس کی گہرائی میں جایا جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ دونوں جذبے ایک ہی ہیں' نفرت بھی محبت ہی کی ایک شکل ہے یعنی نفرت محبت اور محبت نفرت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ یہ کہانی انہی دو جذبوں سے عبارت ہے' یقینا قارئین پسندیدگی کی سند عطا کریں گے۔

آپ کی آراء کی منتظر
ایس کے ورک
شیخوپورہ

یقین کریں پاپا...... میں ایسا کیسے کرسکتی ہوں...... یہ جھوٹ ہے۔'' اس نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اپنے جانِ عزیز باپ کی طرف دیکھا تو وہاں سوائے نفرت کے کچھ نہیں تھا جس پر اس کے لب تھرتھرا گئے تھے۔ جامد و ساکت ہوگئے تھے۔

''میری عزت کا جنازہ تیار ہے صرف قبر میں اتارنا رہ گیا ہے۔'' باپ کے ان لفظوں نے اس کی رہی سہی خوش فہمی بھی دور کردی تھی۔

''بے حیا' بے غیرت شرم نہیں آئی تمہیں' اپنے باپ کی عزت سے کھیلتے ہوئے۔'' ماں نے شدید مشتعل ہوتے ہوئے اس کا چہرہ پے در پے کئی تھپڑوں سے سرخ کرڈالا۔

''یہ آج' ابھی اور اسی وقت ہمارے لیے مرچکی ہے۔ لوگوں کے لیے تو یہ ڈولی اٹھ رہی ہے مگر اس گھر کے لیے جنازہ۔'' آصف صاحب کا لہجہ اتنا اجنبی اور برفیلا تھا کہ خدیجہ کے اندر تک دراڑ پڑگئی تھی۔ وہ ایک دم زرد چہرے کے ساتھ اس اجنبی کی طرف پلٹی تھی جو اس کا شوہر ہونے کا دعویٰ کررہا تھا۔ اس کی حالت میں عجیب بے بسی تھی۔

''میرا قصور' جرم کوئی غلطی تو بتایئے۔ آپ نے یہ ڈرامہ کیوں کیا؟ کیوں مجھے بے مول کیا؟ کیوں......؟''

''جانِ من کیا ہوگیا ہے تمہیں۔'' التمش حیدر نے غیر ارادی طور پر خدیجہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر قریب کیا تو وہ شدید مشتعل ہوکر چلائی تھی۔

''مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔''

''پلیز کول ڈاؤن! ہم نے گناہ نہیں کیا صرف نکاح ہی تو کیا ہے۔ یہ ہمارا حق ہے' جب بھی یہ بات کھلتی تو ایسی ہی صورت حال سے گزرنا تھا۔'' اس کا بات کرنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ خدیجہ سمیت کمرے میں موجود تمام نفوس اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

''میں تمہاری بدنامی برداشت نہیں کرسکتا' اب ضروری ہوگیا تھا کہ ہم اپنا نکاح دنیا کے سامنے ظاہر کرتے ورنہ میرا بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی دنیا کی نفرت کا نشان بنتا۔'' اس کا لہجہ اتنا مضبوط تھا کہ خدیجہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس لمحے پہاڑ نہ صرف خدیجہ کے دل پر گرا تھا

بلکہ اماں کے ساتھ ساتھ آصف صاحب بھی سناٹے کی زد میں آکر رہ گئے تھے۔

''مجھ میں اب اتنا حوصلہ نہیں کہ میں مزید تمہیں برداشت کروں' لے جاؤ اسے ورنہ......'' باپ کے سخت لہجے پر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی' وہ تو جیسے اپنے حواس میں ہی نہیں تھی۔ آنسو خشک ہوکر پلکوں پر اٹک گئے تھے اور وہ بے یقینی سے ٹکر ٹکر التمش حیدر کے پُرسکون چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑے سکون سے اس کی ذات کے پرخچے اڑا رہا تھا' اس کی روح پر نوکیلا خنجر گھونپا جارہا تھا۔ وہ ایک دم اپنے آپ کو اس خطرناک بھیڑیوں بھری دنیا میں تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔

ان سب کے رویوں نے اس کے ہونٹوں کو آپس میں ایسے جوڑ دیا تھا کہ باوجود کوشش کے بولنے کے لیے نہ کھل پارہے تھے۔ اس وقت اس کے لیے اپنے وجود کو زمین پر کھڑا کرنا دوبھر ہوا جارہا تھا۔ کسی نے بھی اس کو صفائی پیش کرنے نہیں دی تھی بلکہ سب اس کو سزائیں سنا رہے تھے۔ اس کی زندگی میں اندھیر ہوگیا تھا پھر آنکھوں میں بھی اندھیرا چھانے لگا اور اگلے ہی پل وہ لہرا کر زمین بوس ہوگئی تھی۔ جب ہوش آیا تو اجنبی در و دیوار کو دیکھ کر سب یاد آگیا تھا۔

''اے خدا یہ...... یہ سب ہونے کے بعد بھی میں زندہ کیوں ہوں۔'' کیا میں اتنی بدنصیب ہوں کہ موت نے بھی مجھے قبول نہیں کیا۔ یہ کیسا صور پھونکا گیا ہے کہ قیامت سے پہلے مجھ پر قیامت آگئی ہے۔ کیسا پگھلتا ہوا سیسہ انڈیلا گیا ہے' میری سماعتوں میں جو مجھ سے میری بصارتیں بھی چھین لے گا۔'' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کو گھور رہی تھی جیسے امید ہو کہ اس طرح دیکھنے سے چھت اس پر گر کر اسے اس عذاب سے' بہت دور' کسی مہربان کی گود میں لے جائے گی۔

❀......❀......❀

ایک ماہ گزر گیا تھا اسے اس سزا میں جلتے ہوئے' وقت نے اسے اپنے ڈگر پر جینا سکھادیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ وقت کسی کا محتاج نہیں' اپنی ڈگر پر اپنی مرضی سے چلتا ہے۔

ہزار بار سوچا' ہر لمحہ سوچا مگر کوئی بھی ایسا سرا ہاتھ نہیں آیا تھا' کوئی بھی ایسا گناہ یاد کرنے سے بھی یاد نہیں آرہا تھا۔ وہ ہر روز اپنے آپ کو کٹہرے میں کھڑا کرتی مگر کوئی بھی قصور کوئی بھی جرم وہ اپنے اوپر ثابت نہیں کرسکی تھی۔

وہ قید تنہائی میں تھی' زندگی کو قید کرنے والا شاید بھول گیا تھا کہ کوئی پنچھی بغیر پروں کے تڑپ رہا ہے' مر رہا ہے۔

اک احساس ہے جو اسے مرنے نہیں دیتا' جینے پر مجبور کرتا ہے' وہ اس احساس کو جاننے سے قاصر تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی' جب ایک دم دروازہ کھلا اور وہ بے رحم شکاری' اس کے سامنے کھڑا ہوگیا تھا وہ بے حد نروس ہوکر دو قدم پیچھے ہٹی تھی دل کی دھڑکنیں تھیں کہ سینے سے باہر نکلنے کو بے چین تھیں' کئی لمحوں تک وہ خود کو خود میں تلاش کرتی رہی تھی۔

''یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ جب وہ بے رحم شکاری اس کے سامنے ہوگا تو وہ کیا کرے گی۔ وہ اس کے لیے نامحرم تھی اور جب نامحرم مرد اور عورت ایک کمرے میں اکیلے ہوں تو کیا کہانی لکھی جائے گی۔ شیطان کیا کردار ادا کرتا ہے اور بے رحم شکاری' اپنے شکار کو کیسے اور کس طرح پامال کرتا ہے۔ زندگی کی ہر سانس رکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"بڑی بے غیرت ہو میں تو تمہاری فاتحہ پڑھنے آیا تھا' لوگ اپنی عزت کی خاطر جان دے دیتے ہیں مگر تم بے غیرتوں سے بھی بڑھ کر ہو۔" التمش حیدر کی سرخ آگ اگلتی آنکھیں خدیجہ الرحمٰن پر ٹک گئی تھیں۔

"کمزور پر حملہ کرنا بزدلی ہے' پہلے قصور تو بتاؤ۔" اس کے مقابلے میں اس کا لہجہ اتنا ہی پُرسکون تھا کیونکہ آنسوؤں کو اس نے پلکوں کی باڑ کے پیچھے ہی روک لیا تھا۔ اس لیے کہ سامنے والا ترس نہیں کھائے گا بلکہ طنز دے گا۔

"میں نے کمزور پر نہیں نجاست پر حملہ کیا ہے' نجاست عزت کی خواہاں کیسے ہو گئی۔" اس کا لہجہ طنز بھرا تھا۔

"دکھ' تکلیف' بڑے لفظ ایسے بدتر لفظوں کی مانند ہیں جو انسان کو دیمک کی طرح چاٹ جاتے ہیں۔ باہر سے تو کچھ نہیں بدلتا مگر اندر سے سب کچھ مٹی ہو جاتا ہے۔" اس کی آہ لبوں سے نکلی۔

"نہیں جانِ من! تمہیں ابھی زندہ رہنا ہے' جب تک تم اپنی جوانی اور حسن کو مٹی میں ملتا ہوا نہیں دیکھتی' تمہیں موت سے ہمکنار ہم نہیں ہونے دیں گے۔"

"آپ کون ہوتے ہیں کسی کو موت اور زندگی دینے والے التمش حیدر! زندگی اور موت دینے والا خدا ہے آپ نہیں اور رہی بات جی لینے اور زندہ رہنے کی تو وہ دو الگ الگ باتیں ہیں' ایک میں مجبوری جھلکتی ہے اور ایک میں خوشی' قدرت نے ہر چیز میں گنجائش رکھی ہے مگر التمش صاحب کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے بڑا فرق پڑتا ہے۔ ہمیشہ زندگی میں اک کمی رہ جاتی ہے۔ جینے کا انداز بدل جاتا ہے اور التمش حیدر کبھی ان لفظوں کو نہیں سمجھ سکتا۔"

آخر میں اس کے لہجے میں طنز بھر گیا تھا۔

"تم جیسی لڑکیاں تو زندگی سے کھیلتی ہیں' لفظوں سے کب سے کھیلنے لگی ہو تم اور رہی بات فرق پڑنے کی تو فرق پڑتا ہے جب کوئی اپنا عزیز ترین ہماری زندگی سے دور بہت دور مٹی میں دفن ہو جاتا ہے دوبارہ نظر نہ آنے کے لیے اور پھر اسے...... جان عزیز ہستی کو دفن کرنے کے بعد نفرت ہو جاتی ہے ہر اس شکل سے جس کی وجہ سے وہ جان دے دیتے ہیں۔ فنا ہو جاتے ہیں اور رہی بات تمہاری اس بھولی صورت سے تو نفرت ہے' نفرت...... شدید ترین نفرت ہے تم سے' تمہارے ہر اس رشتے سے جو تم سے محبت کرتے ہیں۔ بس ایک خواہش رہ گئی ہے کہ اس شکل (التمش حیدر) نے سختی سے اس کے جبڑوں کو پکڑا اور ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا' جو سی بھی نہیں کر سکی تھی) پر اتنے زخم ہوں کہ تم جیسی عورتوں نے بازار بنا دیا ہے کہ عورت سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔"

"نہ ہی میں بے غیرت ہوں اور نہ ہی بازاری عورت اور نہ ہی کردار کی کمزور ہوں۔ تم نے کیا دیکھ لیا مجھ میں وہ داغ جس سے تمہیں نفرت ہو گئی ہے۔ سسکتے' تڑپتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سا کرب تھا۔ عجیب سے بے بسی تھی۔ "میرا تکلیف میں رہنا آپ کو مسرت دیتا ہے' میری صورت اگر گوارا نہیں تو دعا کریں کہ میری شکل آپ کو کہیں بھی نظر نہ آئے۔ اتنا بڑا جھوٹ اتنی صفائی سے آپ نے بول لیا ہے تو اک زندگی کو موت میں بدل دیں' اف تک نہیں کروں گی۔" آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر گالوں پر بہنے لگے تھے۔

"آنسوؤں سے مجھے نفرت ہے اور خاص کر تمہارے' جو بات میں بتانے جا رہا ہوں اس کو سننے کے بعد بھی تم یقیناً زندہ رہو گی مرو گی نہیں کیونکہ بے

غیرت لوگ مرا نہیں کرتے۔" التمش حیدر کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جو تمام باتوں سے ہٹ کے تھا' اس کے دل کی دھڑکنیں رکنے لگی تھیں۔ وہ مسلسل اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی اس کی آنکھیں اور بھی اداس ہو گئی تھیں۔

"تمہارا غلط قدم اور گھر سے نکلنے والا قدم تمہارے بابا کی جان لے گیا تھا۔" وہ گرنے لگی تھی جب التمش حیدر نے سختی سے انگلیاں اس کے بازوؤں میں پیوست کر کے اسے اپنے سامنے کھڑا رکھا تھا۔ "اُف! تم اتنی کمزور تو نہیں تھیں' تم ایسے کیسے مر سکتی ہو' ماں کے بارے میں جاننے کا کوئی شوق' کوئی تجسس نہیں۔" نفرت اور حقارت میں ڈوبی یہ آواز خدیجہ کے اندر کو مار رہی تھی۔

"تمہاری...... خدیجہ الرحمٰن کی ماں لوگوں کی باتیں سہہ نہ سکی اور ٹھیک چار دن کے بعد خودکشی کر لی۔" خدیجہ الرحمٰن نے یکبارگی آسمان کی طرف دیکھا جب کہ التمش حیدر کے چہرے پر بلا کی سفاکی تھی اسے موت کی نوید سنا کر چلا گیا تھا۔

انتقام لینے والا صرف انتقام لیتا ہے' وہ یہ نہیں سوچتا اور نہ ہی دیکھتا ہے کہ اس کی انتقام کی آگ میں کتنے جلے ہیں اور کتنے جل کر راکھ ہوئے ہیں۔

"تم پچھتاؤ گے...... بہت......" وہ روتے ہوئے مسکرا دی تھی ایسے جیسے کرب اس کی جان نکال دے گا' یہی مذاق بھرا طنز تھا کہ خدیجہ نے چپ سادھ لی تھی۔ خودکشی انسان اپنے دفاع میں ناکام ہو کر کرتا ہے لیکن ناامید ہو کر کوئی زندہ ہوتے ہوئے مر جاتا ہے تو وہ خودکشی سے بھی بڑھ کر عذاب ہے خودکشی سے بڑھ کر سزا ہے۔ اس کی بھی ایسی ہی سزا تھی نہ وہ خودکشی کر سکتی تھی اور نہ ہی اس کی سزا ختم ہو رہی تھی۔ اس کی زندگی نے اسے منہ کے بل جا گرایا تھا وہ کوشش کے باوجود یہ زخم سہہ نہیں پا رہی تھی۔ دل تھا کہ ماتم پہ ماتم کر رہا تھا مگر آنکھیں ساکت ہو گئی تھیں۔ زندگی سے بالکل خالی' اس کی آنکھوں میں دکھ' کرب' تکلیف' حسرت' خوشی کچھ بھی نہیں تھا۔ کمرے میں خاموشی حیرت سے ساکت جسم کو تک رہی تھی۔ جس کی سانسیں کسی کے کہے گئے لفظوں میں اٹک گئی تھیں۔

"زندگی ایک سفر ہے ایک ایسا سفر جس میں نشیب و فراز بھی آتے ہیں' مگر کیا پتا تھا کہ اس سفر کے نشیب و فراز اسے ایسے موڑ پر لے آئیں گے جہاں زندگی' موت سے بھی بدتر ہو جائے گی۔"

اس سوچ نے اس کی زندگی کی سانسیں اور بھی مشکل کر دی تھیں وہ یہ نہیں سوچتی تھی کہ اس نے کیا پایا ہے بلکہ وہ یہ سوچنے لگی تھی کہ اس نے کیا کیا کھویا ہے۔ آج اس لمحے وہ رو رہی تھی' تڑپ رہی تھی' سسک رہی تھی ایسے رو رہی تھی جیسے یہ آنسو آخری ہوں۔

"اے خدا! میں اپنے زخم کس طرح کروں بیان' سننے والا کوئی نہیں' جو جھوٹ تھا وہ میرے لیے سچ بنا' پھر بھی میں نے زبان نہیں کھولی' میری سانسیں میری ذات میرے ستم کی ترجمان ہیں' کوئی ہم نشینی نہیں' کئی ہم راز نہیں۔ اس اکیلے پن' اداسیں کون یقین کرے میری داستان کا' میں کیسے بتاؤں کہ مجھے کیا ملے مجھے صبر کا ہی صلہ ملے۔" اس کی قسمت میں اندھیرا چھا گیا تھا یا شاید زندگی نے فریاد سن لی تھی۔

❁......❁......❁

مجھے وہ صبح یاد ہے تین سال پہلے کی وہ صبح بڑی خوب صورت تھی' خوشیوں اور قہقہوں سے بھرپور جب مجھے التمش حیدر کو میرے جگری اور جان سے عزیز دوست جان محمد نے آ کر یہ خوش خبری سنائی کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سہرا باندھنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور میں حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ سہرا باندھنے کے لیے تیار تھا بلکہ اس لیے کہ یہ انقلاب کب اور کیسے رونما ہوا۔ جو لڑکیوں کے نام سے دور بھاگتا تھا' شادی کے نام پر گھنٹوں ہم سے ناراض رہتا مگر یہ اچانک......! وہ میری حیرت کو بھانپ گیا تھا۔

"مجھے محبت ہو گئی ہے محبت......"

"نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔" میں نفی میں زور زور سے سر ہلانے لگا تھا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکلے' کوئی سمندر کو مٹھی میں قید کرنے کا دعویٰ کرے' کوئی ہَوا کا رخ موڑنے کی قسم کھائے یا پھر سورج پر گھر بنانے کی قسم کھائے' میں ان سب پر یقین کر سکتا ہوں مگر یہ یقین نہیں کر سکتا کہ جان محمد محبت کرے یا اسے محبت ہو جائے۔" مش اور رافع ہنسنے لگے

"یقین کر لو میرے دوستو! میرے جانِ جگروں' اس ناچیز بندے کو بھی محبت ہو گئی ہے۔ جسے محبت نام سے الرجی تھی۔" جان محمد انہیں جھٹکے پہ جھٹکے دے رہا تھا۔

"یہ کایا کب پلٹی؟" مش نے پوچھا۔

"ٹھیک پانچ ماہ پہلے۔" اس نے سکون سے کہا۔ جب کہ ان دونوں کو کرنٹ چھو گیا تھا۔

"کیا......؟ تم نے ہم دونوں سے چھپایا' مگر کیوں؟" رافع نے گھورتے ہوئے کہا۔

"یار ڈرتا تھا کہ دوسروں کا مذاق اڑانے والا خود مذاق نہ بن جائے اور دوسری بات مجھے پہلے خود کو یقین دلانا تھا اور اب یقین ہو گیا ہے کہ محبت سے فرار' حقیقتوں سے فرار ہے اور حقیقتوں سے مقابلہ کر کے میں نے سیکھ لیا ہے کہ آخر کو میں بھی اس دنیا کا حصہ ہوں۔" محبت پورے وقار کے ساتھ اس کے لہجے میں بول رہی تھی۔

وقت اس کے لیے رک گیا تھا' دنیا اس کی اسی کے گرد گھومنے لگی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ ہمیں بھی فراموش کر دیتا تھا۔ اب صرف خدیجہ ہوتی اور اس کی باتیں' اس کا دن اسی کے ساتھ گزرتا اور شام اسی کے خوابوں میں گزرتی۔ خدیجہ کی محبت اس کی زندگی میں زہر کی طرح بس گئی تھی اگر پاس ہوتی تو خوشبو کی طرح زندگی کی سانسیں بڑھا دیتی اور اگر دور ہونے کی بات کرتی تو زہر سانس روک دیتا۔ وقت نے ایسی کایا پلٹی وہ خاموش رہنے لگا' خاموشی کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو اپنے اردگرد کو بھولنے لگا۔

"کیا ہوا جان محمد! تم آج کل خدیجہ کی باتیں نہیں کرتے اور نہ ہی اس کا فون آتا ہے۔ کیا ناراضی چل رہی ہے؟" میرے اس طرح پوچھنے پر وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا تھا' عام سی بلیک پینٹ پر براؤن شرٹ اور کہنیوں تک فولڈ کی ہوئی آستینیں ماتھے پر بکھرے بال لیکن پُراعتماد اور بے باک انداز' بلاشبہ متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ اپنے آپ سے بے پروا اور اسی کی پروا کرنے والا' وہ حقیقت میں ایسا ہی تھا۔

"کیا ہوا جان! ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"مش! تمہارا دوست سراب کے پیچھے بھاگ رہا تھا' میری محبت میرے اندر ہی دم توڑ گئی۔ سپنے دیکھنے سے پہلے ہی دم توڑ گئے' ابھی تو میں نے محبت کو جاننا تھا۔ تم صحیح کہتے تھے مش! اس تیز رفتار زندگی میں کوئی کسی کے ساتھ مخلص نہیں' یہاں ہر چہرے پر نقاب ہے میں نے...... میں نے مش! اسے دل میں بسایا' آنکھوں میں جگہ دی' یہ میری غلطی ہے۔ میں نے اس کو اس کی تمام تر بے وفائیوں اور بے نیازیوں کے باوجود دل سے ٹوٹ کر چاہا' یہ میرا جرم ہے۔"

"ایسا کیا ہوا ہے جان؟ جس نے تمہیں اندر سے توڑ دیا ہے' بتاؤ نا جان......!" میں نے بے قرار ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بیڈ پر بیٹھا لیا تو وہ اس بچے کی طرح رونے لگا جس سے اس کا پسندیدہ کھلونا چھین لیا جائے۔

"کیا بتاؤں مش! یہ کہ اسے مجھ سے محبت نہیں تھی وہ میرے دل سے کھیل رہی تھی' وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے وہ کہتی ہے کہ اسے ہر اس شخص سے نفرت ہے جو اظہارِ محبت کرے' وہ جان ہی نہیں پائی مش! کہ وہ اس بے ضرر انسان کی محبت بن گئی ہے۔ وہ جان جائے نا وہ میری محبت بن کر میرے رگ رگ میں بس گئی ہے۔ اس نے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی' اس کی محبت میرے وجود کو ریزہ ریزہ کر دے گی' جیسے اس نے میرے خوابوں کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ وہ مجھے میری محبت سمیت نیست و نابود کر رہی ہے۔" وہ مش کی گود میں سر رکھے بچوں کی طرح رو رہا تھا اور میرے پاس کوئی ایسا لفظ نہیں تھا جو تسلی کے لیے اس سے کہا۔ میری زبان اس کے دکھ کا مداوا نہیں کر پائی تھی۔ کسی کی دل شکنی کے بعد دل جوئی کے ہزار طریقے اختیار کیے جائیں مگر اس کا اثر زائل کرنا محال ہے۔ میں نے اور رافع نے بہت کوشش کی کہ وہ دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آئے مگر وہ تو جیسے پتھر ہو گیا تھا' ہماری کوئی بات اس کے دل پر اثر نہیں کرتی تھی۔ اس کے اندر بس ایک خالی پن تھا۔ وہ اپنے آپ سے خفا ہو گیا تھا اور اپنے آپ سے خفا لوگ نہیں منائے جا سکتے۔ دنیا سے خفا لوگوں کو منانا آسان ہوتا ہے مگر جو اپنے آپ سے خفا ہو وہ منائے نہیں جاتے' اس کو اس حالت میں دیکھ کر ہمارے اندر اس لڑکی کے لیے سوائے نفرت کے اور کچھ نہیں تھا۔ ہم دونوں روز اسے گالیاں دیتے کوستے مگر جان نے اپنے آپ کو موت کے سپرد کر دیا' اس نے وقت کا انتظار نہیں کیا بلکہ اپنے اندر محبت کو لے کر قبر میں جا لیٹا۔

میں نے چیخ چیخ کر رونا چاہا مگر میری آواز گلے سے نکل ہی نہ پائی مجھے یوں لگا جیسے میں گونگا ہو گیا ہوں' آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر غم و غصے کی بے پناہ شدت نے شاید مجھے اندھا کر دیا تھا۔ جان دنیا چھوڑ گیا تھا اور رافع ملک چھوڑ گیا۔ مجھے ایسا لگنے لگا تھا میں خود سے بچھڑ گیا ہوں' میں بھری دنیا میں اکیلا' تنہا رہ گیا ہوں۔ جہاں جان کی موت نے مجھے لرزا کر رکھ دیا تھا وہاں رافع کا جانا مجھے دکھ دے رہا تھا غبار بیٹھنے لگا۔ وحشت شانت ہونے لگی۔ جنون رخصت ہو گیا مگر ان سب کے ختم ہونے کے بعد انتقام نے اس کے اندر جگہ لے لی تھی' انتقام اچھے بُرے کی تمیز بھلا دیتا ہے' اس نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ وہ مڈل گھرانے سے تعلق رکھنے والی اک عزت دار لڑکی تھی اور میرے ذہن میں ایک ہی طریقہ آیا کہ ایسے لوگوں کو مارنا ہو تو عزت سے مارو وہ خود بخود مر جائیں گے۔

❁......❁......❁

"کیا ہوا؟ کہاں ہے وہ؟" وہ جیسے ہی اسپتال میں داخل ہوا ملازمہ پر نظر پڑی' صبح صبح ملازمہ نے اطلاع دی تھی کہ خدیجہ کو اسپتال لے کر آئی ہیں۔

"صاحب جی! آئی سی یو میں ہے ابھی تک ہوش نہیں آیا۔ صاحب جی! ڈاکٹرز کہہ رہے تھے کہ اگر بی بی جی کو بارہ گھنٹوں میں ہوش نہ آیا تو وہ پاگل

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو جائیں گی یا پھر مر جائیں گی۔" ملازمہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے مروڑتے ہوئے نروس لگ رہی تھی مگر اس کے برعکس التمش حیدر پُرسکون تھا۔

"التمش حیدر!" اجنبی آواز پر مڑ کر وہ حیران رہ گیا تھا کیونکہ رافع پورے ایک سال کے بعد بالکل ویسا ہی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"رافع...... رافع...... کب آئے اطلاع کیوں نہیں دی آنے کی؟" التمش حیدر اس کے گلے ملتے ہی گلا کرنے لگا۔

"بس یار تمہیں سرپرائز دینے کے چکر میں پورا دن گزر گیا' سنو تم یہاں اسپتال میں کیا کر رہے ہو؟ کون ہے یہاں؟"

"وہی رافع...... جس نے ہماری خاموش زندگی میں صور پھونکا تھا۔ وہی رافع! جس نے ہماری زندگی کو موت سا سکوت دیا تھا' جس نے زندگی کی خوشیاں ہمارے لیے تنگ کر دی تھیں۔ وہی جس نے ہمارے دوست کو تڑپایا تھا وہی جس نے اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ وہی جس نے تمہارا دل اس ملک سے اُچاٹ کر دیا تھا' دیکھو رافع! میں نے اس کا کیا حال کیا۔" وہ اس کو ساتھ لے کر آئی سی یو کے باہر کھڑا ہو گیا۔ جہاں شیشے سے وہ صاف نظر آ رہی تھی' زندگی کی سانس گن رہی تھی۔

"دیکھو رافع! میں نے اس پر رحم نہیں کیا اس کی وجہ سے......" التمش حیدر نے نفرت سے اس بے جان لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا دوست تڑپا تھا۔"

"یہ کون ہے مش؟" رافع نے شیشے کے پار اس لڑکی کو افسوس سے دیکھا۔

"یہ خدیجہ الرحمٰن ہے' جس کی وجہ سے......"

"کون خدیجہ؟" رافع نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔

"خدیجہ جس کی وجہ سے جان کی جان گئی تھی۔"

"نہیں...... مش یہ وہ خدیجہ نہیں ہے۔" وہ بار بار شیشے کے اس پار خدیجہ کو پہچاننے کی کوشش میں ناکام ہو گیا تھا۔

"یہ وہی خدیجہ ہے رافع! تم ایسی لڑکیوں کو نہیں جانتے۔"

"نہیں مش! میں ملا تھا جب جان کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔" اس نے مڑ کر رافع کی طرف دیکھا۔ "میں اس سے التجا کرنے گیا تھا مگر اس نے کہا تھا کہ "انسان کسی سے محبت کر سکتا ہے مگر مجبور نہیں کر سکتا کہ جواباً اسے چاہا جائے اور اگر جان نے مجھ سے محبت کی ہے تو وہ مجھے مجبور نہیں کر سکتا کہ میں اسے اسی طرح چاہوں جیسے وہ چاہتا ہے۔" وہ خدیجہ ہاشمی تھی۔" وہ خاموش ہو گیا تھا جب مش کی آواز آئی۔

"یہ وہی خدیجہ الرحمٰن ہے' ہو سکتا ہے کہ پہلے خدیجہ ہاشمی ہو۔"

"نام تو بدلا جا سکتا ہے مگر شکل تو نہیں بدل جاتی۔"

"نہیں رافع میں...... غلط کیسے ہو سکتا ہوں۔" التمش حیدر کے منہ سے بمشکل یہ لفظ ادا ہوئے تھے وہ ایک دم زرد ہو گیا تھا۔ جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ دیا ہو وہ بے بسی کی آخری دوار پہ پر تھا اور وہ شیشے کے اس پار زندگی ہار رہی تھی' وہ کتنی آسانی سے موت کے سامنے ہار گئی تھی' کتنی آسانی سے ہار تسلیم کر لی تھی۔ اس نے ایک جھوٹ کے سامنے اپنے آپ کو فنا کر دیا تھا اپنے آپ کو ختم ہونے کے لیے پیش کر دیا تھا۔

"خدیجہ......" التمش حیدر ایک دم چیخا تھا۔ رافع کو یوں محسوس ہوا کہ اس کا دل پسلیوں کو توڑ کر باہر آ جائے گا' وہ کچھ اور بولنا چاہتا تھا مگر آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ رافع نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خاموش کروا دیا۔ آئی سی یو کا دروازہ کھلا تھا سفید چادر میں لپٹا وجود باہر نکالا جا رہا تھا۔ التمش حیدر کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس سے قبل کے وہ اپنے حواس کھوتا' رافع نے اسے اپنے مضبوط حصار میں لیا تھا' وہ آہستہ سے چلتا ہوا اس بے گناہ وجود کے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔ التمش حیدر نے ساکت وجود سے چادر سرکائی تو اسے ایسا لگنے لگا جیسے وہ پوچھ رہی ہو "میرا قصور تو بتائیے" وہ کیسے بے گناہ کو سزا دے سکتا تھا۔

"ایکسکیوز می! یہ آپ کے لیے......" ڈاکٹر نے سفید کاغذ التمش حیدر کے سپرد کیا۔

"رات ٹھیک چار بجے انہیں ہوش آیا تو انہوں نے یہ لکھ کر میرے سپرد کیا تھا کہ میں آپ کو دے دوں۔" اس نے سفید کاغذ کو کھولا اور پڑھنے لگا۔

"میرا غم دیکھ کر آپ کے غم کی آگ نہیں بجھی...... مگر میری موت دیکھ کر شاید آپ......"

❁......❁......❁
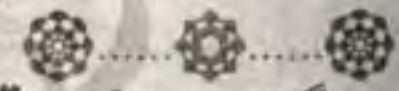
اس مختصر سی زندگی کو انسان فضول قسم کی ضدوں' جھگڑوں اور نفرتوں میں ضائع کر دیتا ہے مگر زندگی کے کم ہونے کا احساس اسے اس وقت محسوس ہوتا ہے جب یہ اس کے ہاتھوں سے پھسل رہی ہوتی ہے اور پھسل کر ایسی کھائی میں جا گرتی ہے کہ کوشش کے باوجود وہ...... وہ مقام حاصل نہیں کر سکتا جو وہ چاہتا ہے۔ بس اس کے پاس سوائے پچھتاوے اور ندامت کے...... اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا' اس سے انتقام لیتے لیتے خود سزا بن بیٹھا۔ تین سال گزر گئے ہیں مگر وہ اس سے معافی نہیں مانگ سکا۔ وہ جب بھی معافی طلب کرنے کی کوشش کرتا تو اسے معافی کا لفظ اس کی اذیتوں کے مقابلے میں بہت حقیر محسوس ہوتا۔

"مجھے التمش حیدر کو خدیجہ رحمٰن سے محبت ہو گئی ہے۔ تب جب وہ معصوم چہرہ سفید اسکارف کے ہالے میں پہلی بار میرے سامنے آیا تھا' تب جب وہ مجھ سے اپنا قصور پوچھا کرتی تھی یا شاید تب جب وہ میرے ہاتھوں بار بار اذیت اٹھاتی تھی شاید تب جب اس کا آنسو رخسار پر ٹھہر گیا تھا۔

مگر میری بدنصیبی دیکھو! جس طرح اس کے سامنے نفرت کا اظہار کرتا تھا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اذیت دیتا تھا' میں اس کے سامنے کبھی یہ نہیں کہہ سکوں گا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اتنی ہی شدید جتنی شدید نفرت کرتا تھا۔

محبت ایک تاریک جنگل کی طرح ہوتی ہے ایک بار اس کے اندر چلے جاؤ یہ پھر باہر آنے نہیں دیتی۔ باہر آ بھی جاؤں تو آنکھیں تاریکی کی اتنی عادی ہو چکی ہوتی ہیں کہ روشنی میں کچھ نہیں دیکھ سکتیں۔ وہ بھی نہیں جو بالکل واضح اور روشن ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا وہ کب اس تاریک جنگل کا باسی بنا اور کب محبت کی تاریکی کا عادی ہو گیا۔ اس کا انتقام قیامت تک کے لیے سزا بن گیا۔ وہ ہر پل سوچتا تھا کہ کاش ایک بار...... بس ایک بار...... میں نے حقیقت جاننے کی کوشش کی ہوتی۔

کاش......!

"انسان زمین پر چلتے ہوئے یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ اس کی رسّی تو کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی لگام کا مالک تو کوئی اور ہے' وہ ڈھیل دیتا ہے تو کھینچ بھی لیتا ہے۔"

❖

WWW.PAKSOCIETY.COM

قسط نمبر 1

ذاتکا قلندر

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قربِ الٰہی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو نات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر، ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو نات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا مسخر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے کیونکہ یہ محض خانہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

وہ میلے کی آخری رات تھی۔ میں نے مسافر شاہ کی تھڑے کی چار دیواری کے ساتھ اپنی بائیک روک کر بند کر دی۔ وہاں کافی اندھیرا تھا لیکن ان دیوں کی روشنی اس اندھیرے کو چیر رہی تھی۔ جو مسافر شاہ کے تھڑے کی نکڑ پر روشن تھے۔ رات کے سیاہ اندھیرے میں وہ ٹمٹماتے ہوئے دیے زندگی کی علامت معلوم ہورہے تھے۔ مرے دائیں جانب وہ کھلا میدان تھا۔ جہاں میلہ اب اُجڑ چکا تھا۔ وہاں لگی ہوئی عارضی دکانیں ختم ہوچکی تھیں۔ کچھ سمیٹ لی گئی تھیں اور کچھ سمیٹی جارہی تھیں۔ کافی فاصلے پر سیکڑوں لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ جہاں سے تیز روشنی کے ساتھ جابجا نصب اسپیکروں سے فلمی گیت کی آواز ہر جانب پھیلی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس مجمع کے پنڈال میں طوائفیں رقص کر رہی ہیں۔ میں نے بائیک کو لاک نہیں کیا ویسے ہی دیوار کے ساتھ لگا کر اتر آیا۔ میں نے لاشعوری طور پر اپنی "ڈب" میں موجود پسٹل کو ہاتھ سے محسوس کیا اور ایک سنسنی خیز لہر کے ساتھ اس مجمع کی جانب بڑھ گیا۔

اگرچہ ان طوائفوں کا ناچ دیکھنے علاقے کا کوئی بھی بندہ جاسکتا تھا لیکن میں اپنے گاؤں کے سردار شاہ دین کے اکلوتے بیٹے شاہ زیب کی خصوصی دعوت پر وہاں گیا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس نے مجھے وہاں کیوں بلوایا ہے۔ میں مجمع کو چیرتا ہوا پنڈال میں جا پہنچا جو لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

وہاں عام لوگ تو تھے تاہم علاقے کے امیر زادے اپنی انفرادیت، کروفر اور طمطراق کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ انہوں نے اپنی انفرادیت جتانے کے لیے خاص اہتمام کیا ہوا تھا۔ شامیانے میں کرسیاں قطاروں میں بچھی ہوئی تھیں۔ وہاں سبھی اپنے لاؤ لشکر اور مصاحبوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ایک طرف جہاں اپنی طاقت کا اظہار تھا تو دوسری طرف کسی بھی ناگہانی افتاد سے نپٹا جاسکتا تھا۔ میں ایک ہی نگاہ میں سارے پنڈال کا جائزہ لے کر اس جانب بڑھ گیا جدھر شاہ زیب بیٹھا ہوا تھا۔ میری آمد کے احساس پر اس نے اپنے ایک مصاحب کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی کرسی چھوڑ کر اٹھ گیا تو میں وہاں جا بیٹھا۔ ہم دونوں میں محض مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا۔ کیونکہ ہم دونوں ہی اپنی وہاں پر موجودگی کے بارے میں جانتے تھے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں میری آمد پر شکریے کا اظہار کیا پھر ان طوائفوں پر نوٹ برسانے لگا۔ جو وہاں ان کے سامنے محو رقص تھیں۔ دوسرے امیر زادے بھی ایسے ہی شغل میں مصروف تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ان امیر زادوں کے درمیان نوٹ برسانے کا مقابلہ چل رہا ہے۔ اطمینان سے بیٹھنے کے بعد میں اپنے جگری یار اشفاق عرف چھاکا کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جلد ہی وہ مجھے اپنی مخصوص منڈلی کے ساتھ دکھائی دے گیا۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر اپنے ہونے کا احساس دلایا تو میں سکون سے محفل کی طرف متوجہ ہوگیا جو اب گرم ہوچکی تھی۔

وہاں کافی طوائفیں ناچ رہی تھیں۔ سبھی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ تاہم مری نگاہ ایک سرو قد طوائف پر جم کر رہ گئی۔ سیاہ لباس میں ملبوس وہ تیز روشنی میں دمک رہی تھی۔ جوانی تو جیسے اس پر ٹوٹ کر آئی تھی۔ سیندور ملا گورا بدن اس کے لباس میں سے چھلک رہا تھا۔ بہت حد تک عیاں اور تھوڑا بہت نہاں گورا بدن تراشا ہوا لگ رہا تھا۔ کھلے ہوئے گیسوؤں میں گول چہرہ چمکتے چمکتے، کافی حد تک پسینے میں بھیگی ہوئی۔ سب سے بے نیاز، فلمی گیت کی لے پر جنونی انداز میں ناچ رہی تھی۔ شاید مجھے اس میں انفرادیت اس لیے دکھائی دے رہی تھی کہ وہ بس محو رقص تھی۔ خود ساختہ ادائیں نہیں دکھا رہی تھی۔ وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر تھی میں نے اس کے چہرے کے نقوش دیکھے مگر اس کے حسن کو محسوس نہ کر سکا۔ جیسے اس کے بدن کی تمام تر ادائیاں میرے سامنے تھیں لیکن وہ ساری بھول بھلیاں ابھی اوجھل تھیں جن میں کوئی گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ میری نگاہ اس پر ٹک کر رہ گئی۔ فقط میں ہی نہیں وہاں پر موجود زیادہ تر لوگوں کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ عورت جو کچھ ڈھکی اور زیادہ عیاں ہو، جس کے بدن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہو، اتنے بڑے ہجوم میں اعتماد اور بے نیازی سے اپنے فن میں ڈوبی ہوئی ہو، ایسی حسینہ کسی بھی مرد کے دل میں اتر جائے تو یہ ایک فطری سی بات ہوتی ہے۔ اس وقت وہ سرو قد طوائف زادی آسمان سے اتری ہوئی پری ہی دکھائی دے رہی تھی۔ خود میں نے اپنے من میں اس کی کشش کے بارے میں لہر اٹھتی ہوئی محسوس کی تھی۔

رات جس قدر گہری ہوتی جارہی تھی پنڈال میں اسی قدر جوش و مستی چھا رہی تھی۔ امیر زادے اپنی امارت کے نشے میں مخمور نوٹ برساتے چلے جارہے تھے۔ میں ان امیر زادوں کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ وہ سب ان محو رقص طوائفوں کے ساتھ مست تھے۔ زمین کے اس ٹکڑے پر یہ محفل ہر طرف گرم تھی جبکہ آسمان پر چاند پوری آب و تاب سے چاندنی کی ٹھنڈک لٹا رہا تھا۔ تین دن اور تین راتیں لگنے والا۔ یہ میلہ بڑا ہی رنگین ہوا کرتا تھا۔ اس میلے میں شرکت کے لیے پورا علاقہ سال بھر انتظار کیا کرتا تھا بلکہ اس کے لیے بھرپور تیاریاں بھی کی جاتی تھیں۔ تقریباً پچاس گاؤں اور ان کے درمیان چھوٹی بڑی بستیوں سے کئی نوجوان مختلف کھیلوں کے لیے تیار ہوا کرتے تھے۔ انہی نوجوانوں کے درمیان مقابلے ہوتے جو جیت جاتا وہ اپنا اعزاز بچانے کے لیے مزید محنت کرتا اور جو ہار جاتے وہ جیتنے کی خواہش میں سخت سے سخت محنت سے گزرتے۔ یوں پورا علاقہ چند دھڑوں میں تقسیم ہوگیا تھا اور ہر دھڑے کی سرپرستی کوئی نہ کوئی امیر زادہ کرتا۔ سبھی اپنے اپنے نوجوانوں اور شہہ زوروں پر خصوصی توجہ دیا کرتے تھے۔ اس لیے علاقے میں بہت سارے گبھرو و شہہ زور جوان نکلا کرتے تھے۔ اس کے درمیان مقابلے کروانے کے لیے علاقے کی ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

انجمن بنی ہوئی تھی جو نہ صرف امن وامان برقرار رکھتی بلکہ انعام واکرام سے بھی نوازتی تھی۔

پاکستان بننے سے بھی کہیں پہلے اس میلے کی ابتدا نجانے کب ہوئی تھی۔ اس بارے میں کوئی نہیں جانتا بس ایک روایت تھی کہ ایک بزرگ جسے لوگ مسافر شاہ کے نام سے جانتے تھے وہ اس میلے والے میدان کے ایک کونے میں کچھ عرصہ ٹھہرے تھے۔ جہاں اب ایک پختہ تھڑا بنا ہوا تھا۔ وہیں ایک برگد کا درخت تھا۔ جس پر معلوم نہیں کتنے برس گزر چکے تھے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ اس پورے علاقے میں کہیں کوئی برگد کا درخت نہیں تھا۔ میلے والے میدان میں جنگلی جھاڑیاں اگا کرتی تھیں۔ نجانے کب اس جگہ کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ اگر کوئی وہاں منت مان لے تو اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مسافر شاہ نے اپنے قیام کے دوران بہت سارے لوگوں کو فیض یاب کیا تھا۔ عوام اس برگد کے درخت کو بڑے احترام سے دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں وہ درخت مسافر شاہ نے لگایا تھا۔ لوگ اس درخت پر منت کا رنگین دھاگہ باندھتے تھے۔ پہلے پہل وہ تھڑا کچا تھا۔ مجھے جہاں تک معلوم تھا اس تھڑے کو شاہ زیب کے پڑدادا نے پختہ کروایا تھا۔ اس کے ساتھ ایک کنواں بھی کھدوایا اور اس تھڑے کے اردگرد چار دیواری کا حصار بھی بنا دیا۔ عمومی طور پر سارا سال وہ میدان خالی رہتا۔ راہ چلتے مسافر اس برگد کے درخت تلے کچھ دیر آرام کرتے۔ کنویں سے پانی پی کر اپنی پیاس بجھاتے اور اپنی راہ لیتے۔ اردگرد کے غریب لوگ جنگلی جھاڑیاں کاٹ کر لے جاتے۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ اتنے بڑے میدان پر کسی جاگیردار یا سردار کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ میلہ شروع ہونے سے چند دن قبل کھمبوہ کی مانند رونق ابھرنے لگتی۔ پہلے دکانیں سجنے لگتیں پھر دور و نزدیک سے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والے فنکار جمع ہونا شروع ہو جاتے۔ تھیٹر، موت کا کنواں، بازی گر، نٹ باز، بہروپے، جادوگری اور شعبدہ بازی کے کمالات دکھانے والے سنیاسی، حکیم، پتھر بیچنے والے، عورتوں کے ہار سنگھار اور بچوں کے کھلونے فروخت کرنے والے اور نجانے کون کون سے حلوائی آ جاتے۔ ہر کوئی اپنے فن کا مظاہرہ کرتا اور داد حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اچھی خاصی رقم کما لے جاتا۔

اس میلے میں ایک بڑا میدان مختلف مقابلوں کے لیے مختص تھا۔ میلے کے دنوں سے پہلے ہی امیر امراء اپنے اپنے شہ زوروں، فنکاروں اور نوجوانوں کے ساتھ وہاں ڈیرے ڈال لیتے۔ مختلف مقابلے ہوتے، شرطیں لگتیں، انعامات ملتے، جیتنے ہارنے کے نجانے کتنے منظر دیکھنے کو ملتے اور پھر آخری رات اس میدان میں طوائفیں آ جاتیں۔ تب رنگین مزاج لوگ اس ماحول کو رنگین تر کر دیتے۔ رات کے آخری پہر تک سماں بندھا رہتا۔ امیر زادوں میں نوٹ برسانے کا مقابلہ چلتا۔ جس کے پاس نوٹ ختم ہو جاتے یا وہ حوصلہ ہار جاتا وہ چپکے سے اپنی ہار تسلیم کرتے ہوئے نکل جاتا۔ محفل کے اختتام تک نوٹ لٹانے والے کی واہ واہ پورا سال علاقے بھر میں گونجتی رہتی۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ وہاں پر آنے والی طوائفیں ایک ہی خاندان سے ہوتی تھیں۔ یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی پشت میں سے کون سی طوائف پہلے یہاں آئی تھی۔ یہ بات بھی روایت کی طرح مشہور تھی کہ جب مسافر شاہ کا یہاں قیام تھا ان دنوں ایک طوائف کا گزر یہاں سے ہوا تھا۔ وہ بڑی بے بس اور غریب تھی۔ نہ اس کے پاس خوب صورتی تھی اور نہ دولت وہ جب یہاں سے پلٹ کر گئی تو اس کی قسمت ہی بدل گئی۔ دوبارہ جب وہ یہاں آئی تو مسافر شاہ نہیں تھے۔ وہ رات بھر یہاں ناچتی رہی۔ پھر اس کے خاندان سے طوائفیں یہاں آنے لگیں۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ یہی ایک رات یہاں مجرا کرتی تھیں۔ پھر اس کے بعد سال بھر وہ کہیں بھی کوئی محفل نہیں سجاتی تھیں۔ اب یہ بات درست تھی یا غلط، کسی نے بھی تحقیق نہیں کی تھی۔ میلے کی آخری شام ڈھلتے ہی وہ لوگ آ جاتے۔ رات بھر محفل رنگین کرتے اور صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی واپس لوٹ جاتے۔ وہ لوگ کبھی کسی کے مہمان نہیں رہے تھے۔ بچپن سے میں یہی سنتا آیا تھا میں ہر سال میلہ دیکھنے آتا تھا لیکن چند سال ہوئے ادھر نہیں آیا تھا۔ اس بار شاہ زیب کی خصوصی دعوت پر چلا آیا تھا۔

اس وقت رات گہری ہو گئی تھی۔ وہ سرو قد طوائف زادی پسینے میں شرابور تھی۔ اس کا سیاہ لباس بھیگ کر بدن سے چپک گیا تھا۔ جس قدر اس کا پسینہ بہہ رہا تھا۔ تماش بین اسی قدر نوٹوں کی بارش کر رہے تھے۔ مجھ سے ذرا فاصلہ پر شاہ زیب بھی اپنے سامنے نوٹوں سے بھرا تھیلا رکھے ہوئے تھا۔

اس دفعہ اس کا خمار ہی عجیب تھا۔ میلے کے ان تین دنوں میں اس کی سرپرستی میں نوجوانوں نے سب سے زیادہ انعام جیتے تھے۔ ان شہ زوروں، محافظوں، نوجوانوں اور گاؤں کے لوگوں کے درمیان وہ کھل کر ان طوائف زادیوں کو داد و تحسین سے نواز رہا تھا۔ کچھ طوائفیں تھک ہار کر بیٹھ گئی تھیں۔ جس طرح کچھ امیر زادے اپنی ہار تسلیم کر کے وہاں سے چلے گئے تھے اس وقت شاہ زیب کے سامنے ایک اکیلا پیر فیروز کا بیٹا، پیر زادہ وقاص ہی ڈٹا ہوا تھا۔ یہی دکھائی دے رہا تھا کہ اس کے پاس نوٹ ختم ہی نہیں ہو رہے تھا۔ ان دونوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ باقی بچی ہوئی طوائفیں انہی دونوں کے درمیان بٹ کر رہ گئی تھیں۔ لاشعوری طور پر یہ وہ لمحہ تھا جو بھی طوائفوں کو اپنے سامنے ناچنے پر مجبور کر دے۔ وہی یہ مقابلہ جیت جائے گا۔ ورنہ سامنے والے کے نوٹ ختم ہو جانے تک یہ مقابلہ جاری رہنا تھا۔

میں اس سرو قد طوائف زادی میں کھویا ہوا تھا جو ہمارے سامنے ناچ رہی تھی۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے اسے اپنا ہوش ہی نہیں ہے۔ وہ مست الست حالت میں تھی۔ اس کے ساتھ دوسری چند طوائفیں بھی تھیں مگر اس کا جنون بالکل منفرد تھا۔ اسے کوئی ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے؟ وہ شاہ زیب کے سامنے سے ہٹی ہی نہیں تھی چند طوائفیں پیر زادہ وقاص کے سامنے تھیں۔ مگر لوگوں کی توجہ ان پر نہیں تھی۔ یوں پورا پنڈال اس سرو قد حسینہ کی طرف متوجہ تھا۔ شاہ زیب نے اس کی مستی اور جنونی کیفیت کے پیش نظر اپنے دونوں ہاتھوں میں نوٹ پکڑے اور اٹھ کر نوٹ وارنے لگا۔ جس پر پنڈال میں ہاؤ ہو کا شور مچ گیا۔ پیر زادہ وقاص کے سامنے ناچنے والی طوائفوں کو ہر کوئی بھول گیا۔ مجمع سمٹ کر اس سرو قد طوائف زادی کے اردگرد جمع ہونے لگا۔ یہ پیر زادہ وقاص کے لیے بڑی ہتک کی بات تھی۔ یک بارگی اس کی طرف سے ایک نوجوان اٹھا اور بڑی تیزی سے آ کر اس سرو قد طوائف زادی پر نوٹ برسانے لگا۔ کوشش یہی تھی کہ وہ اس حسینہ کو اپنی جانب متوجہ کر لے یا پھر اسے مائل کر کے اپنی طرف لے جائے۔ شاید اس طرح ہاتھ سے جاتا ہوا میدان وہ مار لیں۔ مگر وہ سرو قد حسینہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ اسی جنونی انداز سے ناچتی رہی کہ جیسے اسے اپنے اردگرد کا ہوش ہی نہیں ہے۔ اس نوجوان کو جب اپنی کوشش رائیگاں جاتی ہوئی دکھائی دی جو بلاشبہ شرمندگی کا باعث تھی۔ تب اس نوجوان نے سرو قد

WWW.PAKSOCIETY.COM

طوائف زادی کا بازو پکڑ لیا۔ وہ اسے اس جانب لے جانے کی کوشش کرنے لگا جس طرف سے وہ آیا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کوئی طوائف کو ہاتھ لگائے۔ یہی وہ لمحات تھے جب میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ جس مقصد کے لیے شاہ زیب نے مجھے دعوت دی تھی وہ وقت آن پہنچا ہے۔

بلاشبہ میرے لیے امتحان کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ کیونکہ شاہ زیب کے حواری اور مصاحب اٹھ کھڑے ہوئے تھے چلتا ہوا گیت اچانک رک گیا تو ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ جس کے ساتھ ہی اس سرو قد طوائف زادی کو ہوش آ گیا۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے اردگرد دیکھا پھر حیرت اور غصے سے اس نوجوان سے اپنا بازو ایک جھٹکے سے چھڑا لیا۔ تبھی شاہ زیب کی آواز گونجی۔

"او نوجوان! ایسا نہ کرو...... مقابلہ کرو مقابلہ...... نوٹ اگر کم پڑ گئے ہیں تو مجھ سے لے لو لیکن مقابلہ کرو، یہ جو تم کر رہے ہو میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گڈیاں اس نوجوان کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "یہ لو صبح ہونے کا انتظار کرو اور مقابلہ کرو۔"

شاہ زیب کی آواز کیا گونجی پورے پنڈال میں سناٹا چھا گیا۔ جبکہ میرے بدن میں وہی سنسناہٹ ہونے لگی تھی جو بھوکے شیر کو اپنا شکار مل جانے پر ہوتی ہے۔ میرے جبڑے بھنچ گئے تھے پھر وہی ہوا جو میں سوچ رہا تھا۔ پیرزادہ وقاص کی طرف چند لوگ اٹھے وہ انتہائی غیظ و غضب میں تھے۔ ان کے پیچھے بہت سارے لوگ بڑھے چلے آ رہے تھے۔ وہ میدان جہاں چند منٹ پہلے تک طوائفیں ناز و انداز کے ساتھ محو رقص تھیں۔ وہی اب میدان کارزار بن گیا تھا۔ ایک ہجوم ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا۔ اسی دوران پیر زادہ وقاص کی طرف سے کسی نے ہوائی فائر کر دیا۔ فائر کی آواز نے میرے اعصاب کے تار ہلا دیے۔ ممکن ہے اس کا مقصد یہی رہا ہو کہ لوگ ڈر جائیں اور خوف زدہ ہو کر بھاگ جائیں۔ تبھی میرے قریب کھڑے شاہ زیب نے میری جانب دیکھا اور کہا۔

"جمال! جس کے پاس بھی اسلحہ ہو وہ یہاں سے بچ کر نہ جائے۔ باقی میں سنبھال لیتا ہوں۔"

جیسے ہی اس کے لفظ میرے کانوں میں پڑے اس لمحے میرا پسٹل میرے ہاتھوں میں تھا اور میں اس کا سیفٹی کیچ ہٹا چکا تھا۔ وہاں کسی کو قتل کرنا مقصد نہیں تھا بلکہ جو بھی اسلحہ چلانے کی کوشش کرتا اسے اس طرح زخمی کر دیا جائے کہ وہ اسلحہ نہ چلا سکے۔ اب یہ کڑے امتحان والی بات تھی کہ اتنے بڑے ہجوم میں فائر اس طرح کیا جائے کہ سامنے والا محض زخمی ہو۔ شاہ زیب کو معلوم تھا کہ میرا نشانہ کس طرح "سچا ہے" اور مجھے بھی اپنے فن پر ناز تھا۔ اس لیے میں نے پہلا نشانہ ہی اس بندے کا لیا جس نے ہوائی فائر کیا تھا اور اس فائر کا رد عمل دیکھ رہا تھا۔ ایک دھماکے کے ساتھ پیرزادہ وقاص کے پاس ایک چیخ ابھری۔ تب تک میں اپنی جگہ تبدیل کر کے نسبتاً اندھیرے میں اونچی جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے دو مزید بندوں کا نشانہ لیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ وہاں ہلچل مچ گئی۔ کچھ دیر پہلے جہاں جوش بھرے نعرے اور جوانی سے بھرپور رنگین فقرے بازی ہو رہی تھی اب وہاں خوف میں لپٹی ہوئی چیخیں اور جان بچانے کی فکر میں لوگوں کی بھگدڑ تھی۔ دونوں حریفوں کے لوگ گتھم گتھا تھے جبکہ میں یہی دیکھتے ہوئے اندھیرے میں ہو گیا کہ مخالف فریق میں سے اسلحہ کس کس کے پاس ہے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ کس حریف کا پلہ بھاری پڑ رہا ہے۔ مجھے تو اپنا کام کرنا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

پیرزادہ وقاص کے اردگرد چند محافظ تھے۔ ان کے پاس مختلف ماڈل کی گنیں تھیں۔ میں اگر انہیں ہی نشانہ بنا لیتا تو نہ صرف پیرزادہ کی ہوا نکل جاتی بلکہ وہ فائر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ جتنی جلدی ہو جاتا اتنا ہی فائدہ مند تھا۔ دشمن کے بارے میں جب یہ یقین ہو جائے کہ وہ وار کرے گا تب ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس پر وار کر دو ورنہ اس نے تو وار کرنا ہی ہے۔ دشمن کو موقع دینا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ پیرزادہ وقاص کے حصار کو خوف زدہ کر دینا صرف اور صرف سچے اور سچے نشانے ہی سے ممکن تھا۔ میری پہلی نگاہ میں وہ شخص آیا جو اپنی گن کو بولٹ مار چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، میں نے اس پر فائر جھونک دیا اگلے ہی لمحے وہ چیخ مار کر ڈھیر ہو گیا۔ گولی اس کے کندھے کو چیر گئی تھی۔ پھر میں نے یہ نہیں دیکھا کہ ان کے چہروں پر حیرت کس قدر رہی۔ گولی کی سمت ہی متعین کرتے رہ گئے اور میں نے ان کے حصار پر اپنا میگزین خالی کر دیا۔ یکے بعد دیگرے کئی فائر ہوئے تھے اس لیے انہیں سمت کا اندازہ ہو گیا۔ تبھی ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور میرے قریب سے گزر گئی۔ اگر میں نے عادت کے مطابق جگہ تبدیل نہ کی ہوتی تو بلاشبہ وہ گولی میرے بدن میں پیوست ہو جاتی میں نے میگزین بدلا اور جگہ بدل کر فائر کرنے لگا۔ ان دیکھی موت کا خوف زیادہ ہوتا ہے۔ یکے بعد دیگرے کئی اسلحہ بردار ڈھیر ہو گئے تو ان میں مقابلے کی سکت نہ رہی۔ ان دیکھی گولیوں کا شکار وہیں گر کر تڑپنے لگے تو پیرزادہ وقاص میں دم نہیں رہا۔ میں نے دیکھا وہ تیزی سے لوگوں کے درمیان میں سے نکلتا چلا جا رہا ہے۔ میں نے اس کا نشانہ لیا اور چاہا کہ اسے زخمی کر دوں مگر نجانے کیا سوچ کر اس کے قریب کھڑے بندے پر فائر جھونک دیا۔

وہ بندہ چیخ مارتے ہی الٹ گیا۔ تبھی اس کا خوف دیدنی تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کا پتا ہی نہ چلا کہ وہ کدھر گیا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میرا پورا دھیان اس طرف تھا کہ گولی کسی کو بھی ایسی جگہ نہ لگے جس سے وہ مر جائے صرف انہیں زخمی کر کے دہشت زدہ کرنا تھا اور وہ ہو گئے۔ پیرزادہ وقاص کو میں خوف زدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اپنے سردار کو وہاں سے بھاگتے ہوئے دیکھ کر اس کے حواری بھی تتر بتر ہونے لگے۔ جس کے جس طرف سینگ سمائے وہ اس طرف نکل گیا۔ خوف کی اس فضا میں دونوں طرف سے ہی لوگ زخمیوں کو اٹھا کر بھاگنے لگے۔ گاڑیاں اسٹارٹ ہونے لگیں اور اندھیرے میں لوگ بھاگنے لگے۔ تقریباً پندرہ منٹ کے دورانیے میں وہ میدان ایک الم ناک انجام کا منظر پیش کر رہا تھا۔ چیخ و پکار، خوف و ہراس، زخمیوں کی کراہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے کوئی مر گیا ہے یا نہیں لیکن یہ میدان بھی ہمارے گاؤں کے لوگوں نے مار لیا تھا۔ میں دور کھڑا شاہ زیب کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ دیکھ رہا تھا۔ لوگ اپنے اپنے زخمیوں کو اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ اب میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ میں تیز قدموں کے ساتھ اندھیرے میں اس سمت بڑھ گیا جدھر میری بائیک کھڑی تھی۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ کوئی اسے اٹھا کر نہیں لے گیا تھا۔ میں نے پسٹل اپنی ڈب میں رکھنے سے پہلے اس کا میگزین دیکھا اسے نکال کر دوسرا لگایا۔ پھر اڑس کر بائیک نکال کر وہاں سے چل دیا۔ اندھیرے میں ذرا فاصلے پر بائیک کی روشنی میں برگد کا درخت مسافر شاہ کا تھڑا اور اس کے قریب کھڑے چند لوگ ایک لمحہ کے لیے میری نگاہوں میں آئے اور پھر میں اپنے گاؤں جانے والے راستے پر ہو لیا۔

میلے والے میدان سے میرا گاؤں "نور نگر" دو کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ تمام راستا کچا تھا۔ راستے میں کھیت پڑتے تھے۔ کچھ تھوڑا سا چٹیل میدان تھا۔ پھر نہر کا پل، اس سے آگے پکی سڑک پر تقریباً ایک میٹر دور میرا گاؤں تھا۔ گاؤں کے وہ لوگ جو سواری پر تھے وہ نکل چکے تھے۔ جو پیدل تھے وہ اس راستے سے گاؤں جا رہے تھے۔ جتنے زخمی تھے وہ سب لے جائے جا چکے تھے۔ میں ان سب لوگوں کی نگاہوں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک پگڈنڈی والا راستا اپنایا تا کہ کسی کی بھی نگاہوں میں آئے بغیر گاؤں پہنچ جاؤں۔ یہ محض احتیاط تھی میرے راستے میں کوئی بھی دشمن گھات لگا کر بیٹھا ہو سکتا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میدان میں بہت سارے لوگوں نے مجھے فائر کرتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔ یہ تو صبح ہی معلوم ہونا تھا کہ کس کا کتنا نقصان ہوا ہے۔ میں پوری توجہ سے پگڈنڈی پر بائیک لیے جا رہا تھا۔ چاندنی میں ہر شے واضح دکھائی دے رہی تھی۔ میں پوری طرح محتاط تھا۔ جو راستا میں نے اپنایا تھا ممکن ہے اس پر بھی کوئی دشمن حملہ آور ہو سکتا تھا۔ میں نے ہیڈ لائٹ بند کی ہوئی تھی اور چاندنی ہی میں اندازے سے بائیک لیے جا رہا تھا۔ ورنہ دور ہی سے پتا چل جاتا کہ کوئی بائیک لیے جا رہا ہے۔ میرے سارے حواس جا رہے تھے۔ اچانک میری نگاہ ایک ہیولے پر پڑی جو ذرا فاصلے پر تیزی سے ایک کھیت میں گھس گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا میری نگاہوں سے بچنا چاہتا تھا یا میری تاک میں تھا جو جتنا محتاط ہوتا ہے اس کا لاشعور اسے اتنا ہی دھوکہ دیتا ہے۔ لمحہ بھر میں کئی سوال میرے ذہن میں در آئے میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ میری توجہ بٹ گئی۔ ایک طرف مجھے پگڈنڈی کا خیال کرنا تھا تو دوسری جانب مجھے اس ہیولے پر بھی نگاہ رکھنی تھی۔ میں اس کے قریب سے بھی گزر کر اس کے وار سے نہیں بچ سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ ایک سے زیادہ لوگ ہوں۔ میں نے اچانک بائیک روک دی۔ پھر تیزی سے اتر کر اس جگہ فصل میں گھس گیا جہاں میں نے ہیولہ دیکھا تھا۔ میں فصل میں گھستے ہی دم سادھ کر بیٹھ گیا۔ وہاں جو کوئی بھی مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے ہوتا وہ ردعمل میں ضرور کچھ نہ کچھ کرتا۔ میں نے پسٹل نکال کر اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا کسی بھی متوقع آہٹ کو سننے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ چند لمحوں تک کچھ نہ ہوا۔ ویسا ہی سناٹا رہا۔ تبھی میں سوچنے لگا کہ کہیں یہ میری نگاہوں کا دھوکا تو نہیں ہے۔ میں اس پر غور کر ہی رہا تھا کہ مجھے خود سے چند قدم کے فاصلے پر ایک لمحے سے بھی کم وقت میں لشکارا محسوس ہوا۔ یوں جیسے کوئی جگنو چمکا ہو۔ پھر چمک بار بار ہونے لگی۔ میں سرکتا ہوا آگے بڑھنے لگا تا کہ جان سکوں کہ یہ لشکارا کس کا ہے؟ پھر اچانک میں ٹھٹک گیا وہ کوئی عورت تھی بکھری ہوئی زلفیں شانوں پر پھیلی ہوئی تھیں سیاہ لباس اور سفید گردن کے پاس زلفوں کے درمیان کان میں بڑا جھمکا چاندنی میں جگنو کی طرح ٹمٹما رہا تھا۔ میں نے مزید غور سے دیکھا تو خوش گوار حیرت میرے اندر پھیل گئی۔ وہ سرو قد طوائف زادی تھی۔ وہی جو کچھ دیر پہلے پنڈال میں جنونی انداز سے محو رقص تھی۔ وہ یہاں چھپی ہوئی تھی۔ بھگدڑ میں جس کا منہ جدھر آیا وہ اس طرف نکل گیا۔ وہ بھی اس طرف نکل آئی ہو گی۔ میں نے اس کے یہاں ہونے پر مزید غور نہیں کیا بلکہ سرکتا ہوا محتاط انداز میں کوئی آواز نکالے بغیر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ ڈر یہی تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی چلانے نہ لگ جائے۔ میں نے ایک دم سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اس افتاد پر مچھلی کی مانند میرے ہاتھوں میں تڑپی اور پھسلنے کے لیے بے تحاشا مچلنے لگی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر مضبوطی سے جکڑ لیا۔ وہ گھوم کر میرے سینے سے آ لگی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اس کا دل کتنی زور سے دھڑک رہا ہے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے میرے چہرے کو دیکھنے لگی۔ پھر اس کی نگاہ میرے ہاتھوں میں سیاہ پسٹل پر پڑی۔ تب اس کی ساری زور آزمائی دم توڑ گئی۔

"ڈرو مت، میں تمہارا دشمن نہیں ہوں تم محفوظ ہاتھوں میں ہو۔" میرے کہنے پر وہ ایک دم سے ساکت ہو گئی۔ میں نے اس کے منہ پر سے اپنا ہاتھ ہٹایا تو وہ گھگھیائے ہوئے انداز میں بولی۔

"ک......کک......کون ہو تم......؟"

"میں اگر تمہیں اپنا تعارف کرا بھی دوں تو کیا تم مجھے پہچان لو گی۔ ہاں یہ جان لو کہ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔"

"لیکن...... دوست...... بھی تو نہیں ہو......!" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"چاہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ یہاں کیوں چھپی ہوئی ہو؟" میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"مجھے میرے لوگوں تک پہنچا دو وہ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔" اس نے کافی حد تک خود پر قابو پاتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہاں میدان میں تو اب کوئی بھی نہیں ہے جس کا جدھر منہ ہوا وہ ادھر نکل گیا جیسے تم یہاں پر ہو، اگر میری بات کا یقین نہ آئے تو چلتے ہیں خود ہی دیکھ لو۔" میں نے چاندنی میں اس وحشت زدہ ہرنی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ میرے ساتھ لگی دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے لبوں پر لگی لپ اسٹک اس کے دائیں گال تک پھیل گئی تھی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ تبھی اسے احساس ہوا کہ وہ میرے کس قدر قریب ہے۔ اس لیے ذرا سا کسمسا کر وہ مجھ سے الگ ہو گئی۔ میں نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ مگر اس کے بدن کی ملائمت میرے بدن سے چمٹی رہی۔ کافی حد تک عیاں اور تھوڑا بہت نہاں چاندنی میں نہایا ہوا بھیگا بدن میرے سامنے تھا۔ مجھے یوں دیکھتا ہوا پا کر وہ خود میں سمٹنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ تب میں نے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے پوچھا۔

"یہیں کھڑی سوچتی رہو گی یا چلو گی میرے ساتھ۔"

"تم خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ میدان میں کوئی نہیں ہے۔" اس نے بے یقینی سے کہا۔

"تو پھر چلو میرے ساتھ گاؤں، صبح دیکھیں گے تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟" میں نے کہا اور اس کا ردعمل اس کے وحشت زدہ چہرے پر دیکھا۔ جہاں بے یقینی کے بادل چھائے ہوئے تھے میں نے چند لمحے اس کا انتظار کیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے اپنا پسٹل واپس ڈب میں رکھا اور کچھ کہے بنا پلٹ کر فصل سے باہر آ گیا۔ میں نے ایک طرف گری ہوئی بائیک کو اٹھایا میں نے لمحے میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر وہ میرے ساتھ جانا چاہتی ہے تو ٹھیک اگر نہیں تو کون سا میرا اس کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اسے چھوڑ کر اپنی راہ لوں گا۔ میں اس کی وجہ سے اپنی راہ کھوٹی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بائیک اسٹارٹ کر کے اس کی جانب دیکھا۔ وہ بت بنی وہیں ساکت کھڑی تھی۔

"اگر آنا ہے تو آ جاؤ، میں جا رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے گیئر لگا دیا۔ اس نے پھر بھی حرکت نہ کی تھی۔ میں نے اس کی پروا نہیں کی اور بائیک بڑھا دی۔ اگرچہ یہ غلط حرکت تھی کہ میں اس کو یوں ویرانے

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں تنہا چھوڑ کر چلا جاتا مگر وہ مجھ پر اعتماد کرتی تبھی نا
اب میں اس کی منت سماجت کرنے سے تو رہا بھاڑ میں جائے مجھے کیا' میں ابھی چند گز کے فاصلے پر گیا ہوں گا کہ وہ چیختے ہوئے بولی۔

''ٹھہرو...... ٹھہرو' خدا کے لیے ٹھہرو......!'' اس نے خوف بھری ہذیانی صدا لگائی تھی۔ میں رک گیا تو وہ بھاگتی ہوئی میرے قریب آئی اور بائیک پر پیچھے بیٹھ گئی۔ میں نے گیئر لگا کر بائیک بڑھا دی۔ وہ میرے ساتھ چپک کر یوں بیٹھ گئی کہ اس کے بدن میں ہونے والی لرزش کو میں بخوبی محسوس کرسکتا تھا۔ تب میں نے پوچھا۔

''اب کیا ہوا......؟''

''بس تم چلو'' اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا تو میں استہزائیہ انداز میں بولا۔

''تو پھر یوں کرو کہ مجھے مضبوطی سے پکڑ لو۔ راستا بہت دشوار ہے۔''

''اب اس سے زیادہ کیا مضبوطی سے پکڑوں۔''

اس نے تلخ انداز میں کہا تو میرا قہقہہ نکل گیا۔ اس کا بدن گیلا تھا۔ ایک عجیب لذت انگیز مہک تھی جو مجھے مدہوش کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ میں چند لمحے تو اس کے سحر میں رہا۔ پھر سر جھٹک کر راستا دیکھنے لگا۔ وہ خوف سے لرزتا ہوا بدن لیے مجھ سے چمٹی ہوئی تھی اور میں گاؤں تک پہنچ جانے کے لیے بے تاب تھا۔ جب میں نہر کا پل کراس کر کے پکی سڑک پر آیا تب بھی وہ مجھ سے یونہی چپکی رہی۔ میرے ذہن میں سوال ٹھوکریں مارنے لگا کہ وہ اتنی ہی خوف زدہ ہوگئی ہے کہ اب تک اس کا خوف دور نہیں ہوا یا محض میرا امتحان لے رہی ہے دونوں صورتوں میں ''کیوں'' میرے دماغ میں چپک کر رہ گیا۔

میں نے اپنے گھر کے سامنے بائیک روک دی لوہے کا بیرونی گیٹ اندر سے بند تھا۔ میں نے ہارن دیا تبھی اس نے بڑے اعتماد سے پوچھا۔

''ہم کہاں آ گئے ہیں؟''

''یہ میرا گھر ہے اور یہاں میرے علاوہ فقط میری ماں رہتی ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ کھیت سے گھر تک کے سفر میں اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ پھر گاؤں میں آ جانے کے باعث اس کا اعتماد بحال ہو جانا فطری بات تھی۔ جن کے پاس سواری تھی وہ بہت پہلے آ چکے تھے اور پیدل آنے والے ابھی تک آ رہے تھے۔ گاؤں کے لوگ بھی زخمی ہوئے تھے۔ اس باعث گاؤں میں تھوڑی بہت ہلچل بھی تھی۔ چوک سے گزرا تو وہاں بھی کافی لوگ جمع تھے۔ پورے علاقے کے لیے میرے خیال میں یہ رات بھاری تھی۔ جس کسی کا زخمی نہیں ہوا ہوگا وہ سوچتا ضرور ہوگا۔ میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اندر سے بولٹ کھلنے کی آواز آئی اس کے ساتھ ہی گیٹ کھل گیا۔ ماں نے پہلے مجھے دیکھا پھر جیسے ہی اس کی نگاہ میرے پیچھے بیٹھی اس سرو قد طوائف زادی پر پڑی تو اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ استعجاب اتر آیا۔

''کون ہے یہ؟'' اماں نے خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے کڑک انداز میں پوچھا۔ اماں کا اس طرح پوچھنا بنتا تھا اس حسینہ کا لباس میری اماں کی نگاہوں میں نہیں جچنے والا تھا۔

''اماں! یہ ایک ناچنے والی طوائف ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے چھپ رہی تھی۔ میں اسے تحفظ دے کر یہاں لے آیا ہوں۔ صبح ہوتے ہی چلی جائے گی۔'' میں نے صاف لفظوں میں ساری صورت حال بتا دی کیونکہ میری ماں ہی وہ دنیا کی واحد ہستی تھی جس کے سامنے میں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور

یہ ہی میں نے جھوٹ بولنے کی کبھی کوشش کی تھی۔ میں نے سچ بتا کر اماں کی طرف دیکھا۔ اماں اس سرو قد طوائف کو سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی۔ پھر نجانے اس کے من میں کیا آیا اس نے گیٹ کا ایک پٹ وا کرتے ہوئے کہا۔

''چل' آ جا اندر۔''

میں بائیک لیے اندر چلا گیا۔ وہاں میں نے بائیک روک کر بند کر دی تو وہ نیچے اتر آئی۔ دو سیڑھیاں چڑھنے کے بعد بڑا سا سارا صحن تھا اور پھر اس سے آگے دالان تھا۔ اماں ہمارے پاس سے گزر کر اندر کی جانب بڑھ چکی تھیں۔ میں دالان میں گیا تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ گئی۔ تبھی اماں کمرے میں سے نکلی اس کے ہاتھوں میں ایک زنانہ جوڑا تھا جو وہ اس طوائف زادی کی جانب بڑھاتے ہوئے بولیں۔

''جاؤ' پہلے نہا کر یہ کپڑے پہنو پھر کوئی بات کرتے ہیں۔''

تبھی میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا سیاہ لباس کہیں کہیں سے پھٹ چکا تھا۔ پاؤں میں جوتا بھی نہیں تھا۔ اس کی گوری پنڈلیوں پر بڑی خراشوں سے خون رس کر سوکھ چکا تھا۔ وہ جوڑا پکڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی تو اماں نے دیوار کے ساتھ پڑے اپنے سلیپروں کی جانب اشارہ کیا تو وہ انہیں پہن کر اس جانب بڑھ گئی جدھر غسل خانہ تھا۔ تبھی میں نے اماں کی توجہ بٹانے کے لیے کہا۔

''اماں' بڑی سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔''

''کھانا موجود ہے جب تک وہ نکلتی ہے میں گرم کر دیتی ہوں تو بھی اپنا حلیہ ٹھیک کر جا کے' لگتا ہے اس بار میلے میں کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔'' آخری فقرہ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں اماں' لڑائی ہو گئی تھی کافی بندے زخمی ہو گئے ہیں اس میں یہ پھڈا......!''

''تم نے کتنے بندوں کو زخمی کیا ہے' کوئی مرا تو نہیں؟'' اس نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

''پتا نہیں' صبح پتا چلے گا۔'' میں نے گول مول بات کرنا چاہی۔ ''وہ شاہ زیب کی جان کو آئے تھے میں نہ ہوتا تو شاید وہ آج زندہ نہیں بچتا...... بس اسی وجہ......!''

''تجھے معلوم ہے نا کہ تو مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔'' اماں نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو اماں پھر مت پوچھو' جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔'' میں نے سر کھجاتے ہوئے آہستگی سے کہا تو وہ میری طرف چند لمحے دیکھتی رہیں پھر کچن کی جانب بڑھ گئیں۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور گیٹ بند کرنے کے لیے چلا گیا۔ صحن کے کونے میں بنے باتھ روم میں نہانے کی آواز چھن کر باہر آ رہی تھیں۔ میں نے ان پر توجہ نہیں دی بلکہ باہر والے کمرے میں چلا گیا۔

میں تازہ دم ہو کر آیا تو دالان میں بڑی چارپائیوں پر اماں نے کھانا رکھ دیا تھا۔ وہ سرو قد طوائف زادی ایک دوسری چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بدن پر دیہاتی عورتوں کا لباس خوب جچ رہا تھا۔ بلب کی پیلی روشنی میں وہ بھیگی بھیگی ہوئی خاصی پرکشش لگ رہی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے اس کے پاس دھری دوسری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نام تو میرا سوہنی ہے اب تم جس نام سے چاہو پکار لو۔'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ تو ایک لمحے کے لیے اس کا سادہ سادہ سا بغیر میک اپ کا چہرہ مجھے پرکشش لگا۔ دل چاہا کہ اسے غور سے دیکھوں لیکن اماں کا احساس کرتے ہوئے میں نے جلدی سے ایک روٹی نکالی

WWW.PAKSOCIETY.COM

چنگیر میں رکھ کراس پر ذرا سا سالن رکھا اور اطمینان سے کھانے لگا۔ جی بھر کے کھانے کے بعد میں نے کچن کی طرف دیکھا۔ اماں پیالوں میں چائے ڈال رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد وہ چائے لے کر آ گئیں۔

''اے لڑکی' کھانا کھالیا تونے؟'' اماں نے سوہنی کے سامنے پڑی خالی چنگیر کی طرف دیکھتے ہوئے ہولے سے پوچھا۔

''جی۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے دھیرے سے منمنائی تو اماں نے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لو یہ چائے پیو اور وہاں اس کمرے میں میرے ساتھ آ کر سو جانا۔ جو باتیں بھی کرنا ہوں وہ صبح کر لینا۔''

''جی اچھا۔'' اس نے پھر منمنانے والے انداز میں کہا اور پیالہ پکڑ لیا۔ میں اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس دوران اماں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میری نگاہوں سے پنڈال میں ناچنے والی وہ طوائف زادی گم ہو چکی تھی۔ جس کے نقوش دیکھنے کی خواہش میرے دل میں اٹھی تھی۔ اب وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھی۔ اس وقت وہ ایک دیہاتی الہڑ مٹیار دکھائی دے رہی تھی۔ بھیگے ہوئے سیاہ گیسو' بڑی بڑی کاجل بھری زندگی سے بھرپور آنکھیں' بھرے بھرے گال' ستواں ناک میں سونے کی ہلکی سی تار تھی۔ رس بھرے گلابی ہونٹ' جن کی ہلکی ہلکی لکیریں دور ہی سے دکھائی دے رہی تھیں۔ شفاف گردن' بھاری سینہ اور پتلی سی کمر' دفعتاً مجھے خیال آیا کہ اس کی پنڈلیاں زخمی تھیں۔

''اماں نے دوا دی تھی وہ لگالی تھی میں نے......!''

وہ اچانک بولی تو میں حیران رہ گیا۔ اس نے تو میری نگاہیں پڑھ لیں میں ابھی اس حیرت سے نکلا نہیں تھا کہ وہ بولی۔ ''لڑکپن سے جوانی تک یہی سیکھا ہے کون کس نگاہ سے ہمیں دیکھتا ہے۔'' اس کے لہجے میں اعتماد اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ تبھی میں نے خوش گوار انداز میں پوچھا۔

''اچھا ہے' تم نے مجھے بتا دیا خیر۔ اب جاؤ اور جا کر اماں کے پاس سو جاؤ۔''

''دل تو چاہتا ہے کہ ابھی جا کر سکون سے سو جاؤں مگر مجھے نیند نہیں آئے گی۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔

''ہاں اجنبی جگہ پر ایسا ہوتا ہے۔ مگر تم اماں کے پاس جا کر لیٹو گی تو نیند آ جائے گی۔ اب تم میرے گھر میں ہو' کسی بھی قسم کا خوف نہیں ہونا چاہیے تمہیں۔'' میں نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''بات یہ نہیں ہے' میرے ساتھ کے لوگ نجانے کہاں ہوں گے۔ ان کے ساتھ کیا بیتی؟ وہ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے پتا نہیں وہ لوگ اس وقت کہاں ہوں گے۔'' وہ ایک ہی سانس میں تیزی سے کہہ گئی۔

''صبح ہونے میں چند گھنٹے ہیں۔ تم آرام کرو دن نکلتے ہی سب معلوم ہو جائے گا۔ میں تمہیں خود ان کے پاس چھوڑ آؤں گا۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ میری چائے ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے خالی پیالی وہیں رکھ کر اٹھ گیا۔ اٹھتے ہوئے جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہوں میں ایسا بہت کچھ تھا جس کے بہت زیادہ مفہوم نکالے جا سکتے تھے۔ مگر میں کوئی ان پڑھ دیہاتی نوجوان تو نہیں تھا جو اس کی نگاہوں کو نہ سمجھ پاتا۔ وہ انہی اداؤں ہی سے تو دوسروں کو لوٹ لینے کا ہنر جانتی تھی۔ میں نے ایک ہلکی سی مسکان کے ساتھ اس کی نگاہ کا سحر خود پر سے توڑا اور باہر والے کمرے میں جا کر لمبی تان کر سو گیا۔

مجھے یہی لگا کہ جیسے ایک جھپکی سی آئی ہے آنکھ کھلی تو صبح کا ملگجا اجالا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ سورج ابھرنے میں ابھی وقت تھا۔ دالان کے پاس اماں جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھی اور سوہنی اماں والے کمرے میں چارپائی پر بے سدھ پڑی سو رہی تھی۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا اور معمول کے مطابق ڈیرے پر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ دعا مانگتے ہوئے اماں نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر دعا مانگنے لگی۔ میں نے بائیک اٹھائی اور ڈیرے کی جانب چل دیا۔ جہاں بھیدہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ بھیدہ چاہے میرا ملازم تھا لیکن میں نے اسے ڈیرے کا مالک بنایا ہوا تھا کہ وہ جو چاہے سو کرے۔ وہ میرے بچپن کا دوست تھا۔ پرائمری تک میرے ساتھ پڑھا تھا۔ پھر غربت کی وجہ سے نہ پڑھ سکا اور نہ کچھ کر سکا۔ اب جبکہ وہ جوان ہو گیا تو میں نے اس کے معاملات کی ذمہ داری لے لی۔ وہ ہی نہیں میں بھی بے فکر ہو گیا تھا۔ ہم اپنے کاموں میں مصروف تھے کہ ڈیرے پر حویلی کا خاص ملازم فخرو آ گیا۔

''بولو کیا بات ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''تمہیں سردار شاہ دین نے حویلی بلایا ہے۔'' اس نے اپنا پیغام دے دیا۔

''اتنی صبح صبح' خیریت تو ہے نا۔'' میں نے پوچھا۔

''سردار جی تو ساری رات سوئے ہی نہیں ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے پیغام دینے کا کہہ کر گئے ہیں شاید ان کا یہ خیال ہو کہ تم کسی اور طرف نہ نکل جاؤ' دن چڑھتے جانا۔'' اس نے تفصیل سے سمجھا دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے میں یہاں سے گھر جاتے ہوئے آ جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر میں اپنے کام میں لگ گیا۔ پیغام دے کر فخرو چلا گیا۔ مجھے امید تھی کہ بھیدہ کوئی تبصرہ کرے گا مگر خلاف معمول اس نے کوئی بات نہیں کی بلکہ اپنے کام میں مگن رہا۔

☆......☆......☆

صبح کی تیز چمکتی ہوئی دھوپ میں امرتسر کے راجہ سانسی ایئرپورٹ پر ایئر انڈیا کا سفید اور سرخ رنگ کا طیارہ لینڈ ہو چکا تھا۔ مسافر سیڑھی کے ذریعے اتر رہے تھے۔ ان میں جسپال سنگھ عرف جسی بھی شامل تھا۔ جیسے ہی اس کے بھارت کی سرزمین پر قدم پڑے اس کے اندر نفرت کا الاؤ دہکنے لگا۔ اس کے اندر دہکتی ہوئی نفرت نے ایک بار تو اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اٹھائیس برس پہلے جو چنگاری اس کے بدن میں آن پڑی تھی وقت نے اسے الاؤ بنا دیا تھا۔ وینکوور سے امرتسر تک کے طویل سفر نے اسے تھکا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے ذہن میں خنجر کی مانند پیوست یہ سوال اسے لہولہو کر رہا تھا اس کا دیس کون سا ہے؟ بھارت کا پنجاب جہاں وہ پیدا ہوا تھا یا پھر کینیڈا کا وینکوور جہاں اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ اس کی فضاؤں میں پرورش ہوئی اور ایک سنہرا مستقبل اس کا منتظر تھا یا پھر دونوں جگہیں ہی اس کا دیس نہیں ہیں اور وہ محض ایک بے وطن مسافر ہے۔

امیگریشن کے مراحل سے گزرنے کے بعد جب وہ اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ باہر آیا تو بھارت کی ہواؤں میں اس نے پہلا طویل سانس لیا۔ یہ ہوا جو اس کے سینے میں اتری تو اسے اپنے اندر مزید آگ بھڑکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ وہ ان ہواؤں میں اپنے اجداد کے لہو کی مہک محسوس کر رہا تھا۔ اس کا دوران خون بڑھ گیا۔ غصہ دماغ میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے کچھ دیر اس کی یہی حالت رہی تو دھماکے سے پھٹ جائے گا۔ اس نے خود پر قابو پانے کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ انہی لمحات میں اس کے کانوں میں آواز گونجی۔

''جسپال سنگھ جسی جی' ست سری اکال' کہاں کھوئے ہوئے ہو۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے فوراً ہی اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے خوبرو نوجوان انوجیت سنگھ ڈھلوں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے سر پر گہرے نیلے رنگ کی پگڑی، چیک دار شرٹ اور سیاہ پتلون کے ساتھ تلّے والا سنہری کھسہ پہنا ہوا تھا۔ جسپال سنگھ نے اسے صرف تصویروں ہی میں دیکھا تھا اور ایسا ہی انوجیت کے ساتھ بھی تھا۔ دونوں ہی پہلی بار مل رہے تھے جبکہ بہت پہلے وہ ذہنی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے۔ ان کی ملاقات کا ذریعہ کمپیوٹر بنا تھا۔ پھر فون پر رابطے نے ان کے درمیان گہرا ہی نہیں اٹوٹ تعلق قائم کر دیا تھا۔

"ست سری اکال انوجیت۔" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا مگر اپنی لرزتی ہوئی آواز پر قابو نہ رکھ پایا۔ جسے انوجیت نے محسوس کرتے ہوئے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"کیا بات ہے جسپال، تو بہت جذباتی ہو رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جسپال کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"ہاں انوجیت، میں واقعی ہی جذباتی ہو رہا ہوں۔ تم میرے محسوسات کا اندازہ نہیں کر سکتے شاید۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔

"چل، چلتے ہیں ہمارے پاس بہت وقت ہے باتیں کرنے کے لیے۔" انوجیت نے اس کا سوٹ کیس اٹھایا۔ وہ ہرمندر صاحب کی جانب رخ کیے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ اس نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے آنکھیں بند کرلیں تبھی اس کے کانوں میں گولیاں چلنے کی تڑتڑاہٹ گونجی، اس نے فوراً ہی گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور پاگلوں کی مانند ارد گرد دیکھنے لگا۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ ہر طرف ویسا ہی سکون تھا اب گولیوں کی تڑتڑاہٹ بھی نہیں تھی۔ وہ بے چین ہو گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس بار اس نے آنکھیں بند کی تو نہ صرف گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں بلکہ لوگوں کی ہذیانی انداز میں چیخ و پکار بھی سنائی دینے لگی۔ ایک ایسے کہرام کی آواز جس میں بے گناہ لوگوں کو قتل کیا جا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں بلکہ کانوں میں پڑنے والی آوازوں پر دھیان دینے لگا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ چیختے چلاتے لوگ، عورتوں اور بچوں کی کراہیں، توپوں سے گولے داغنے اور پھٹنے کی آوازیں اس کی بند آنکھوں کے سامنے جو اندھیرا تھا جو ہٹ گیا اس کی جگہ منظر ابھر آیا۔ پر کرے پر گری ہوئی لاشیں موت کے منہ میں جاتے ہوئے سسکتے، سڑتے مچلتے جسم، خون ہی خون، وہ پر کرے جو دودھ سے دھویا جاتا ہے وہ خون سے سرخ ہو گیا تھا۔ شفاف تالاب کا پانی خون سے گدلا ہو چکا تھا، مچھلیاں حیران تھی کہ انسانی لاشیں کیسے تیر رہی ہیں؟ یہ منظر تین جون انیس سو چوراسی کا تھا۔ جب اندرا گاندھی حکومت نے دربار صاحب پر فوج کشی کی تھی ہر طرح کی دستیاب گنوں، آرٹلری آرمڈ فوج، توپ خانہ اور ٹینک تک چڑھا دیے۔ نیوی کے غوطہ خوروں کے ساتھ ایک ایسے ٹروپس کو بھی آزمایا گیا جو بے رحمی سے قتل کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ بیساکھی کے تہوار کا دن تھا۔ گورو گوبند سنگھ کے خالصہ کا دن، جس دن اس نے سکھ پنتھ کو حتمی صورت دی تھی۔ ہر سکھ کو سنگھ اور ہر سکھنی کو کور کا خطاب دیا تھا۔ یہ اجتماع اس دن کی یاد میں تھا۔ اس دن سکھوں کا سب سے بڑا اجتماع دربار صاحب میں ہوتا تھا۔ بھارت کے علاوہ پوری دنیا سے سکھ آتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی عورتیں اور بچے بھی مذہبی عقیدے کے لیے آتے۔ ساری قیام گاہیں بھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

جاتیں؛ ہزاروں کی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ اپنی مذہبی رسومات ادا کرنے ان بے گناہ سکھوں پر جے ہند کے نعرے لگاتے بھارتی فوجیوں نے برہمنی ذہنیت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی بربریت کا وہ مظاہرہ کیا جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا اور اسی اجتماع میں جسپال سنگھ کا باپو سردار کلوندر سنگھ بھی آیا ہوا تھا۔ پھر وہ کبھی لوٹ کر واپس نہیں گیا۔ نہ اس کی لاش ملی اور نہ ہی کوئی اتا پتا ملا۔

وہ بنا کچھ کہے اپنا بیگ لیے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دونوں پارکنگ میں گئے کچھ ہی دیر بعد وہ نئے ماڈل کی فور وہیل جیپ میں ائرپورٹ کے احاطے سے نکلتے ہوئے امرتسر شہر کی جانب چل پڑے۔

''اچھا بتا پہلے بریک فاسٹ شکھے گا یا......!''

انوجیت نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ تا کہ جسپال خود ہی بتا دے کہ اس کا پروگرام کیا ہے۔

''ابھی کچھ دیر پہلے جہاز میں ناشتا کیا ہے ابھی کچھ بھی کھانے کو جی نہیں کر رہا ہے۔ تو سیدھا شری دربار صاحب لے چل پھر اس کے بعد سب کچھ دیکھتے ہیں۔'' جسپال سنگھ نے اس قدر اعتماد سے کہا کہ انوجیت نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ چند لمحے پہلے والا جسپال نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر سختی کی بجائے فطری نرماہٹ تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے اپنا سارا دھیان ڈرائیونگ پر لگا دیا۔

ہوٹل کے سامنے پارکنگ میں گاڑی لگانے کے بعد وہ دونوں بائیں طرف سے دربار صاحب کی جانب بڑھنے لگے۔ اس طرف کا داخلی دروازہ پار کرتے ہی سامنے پرکرما (مقدس راستا) سرودو (مقدس تالاب) اور ہرمندر صاحب تھا۔ دائیں جانب اکال تخت اپنی پوری آب و تاب سے دکھائی دے رہا تھا۔ چمکتی ہوئی دھوپ میں ہر وہ منظر واضح دکھائی دے رہا تھا جو اس نے فلموں اور تصویروں ہی میں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ سارا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ بسنتی رنگ کا جھنڈا صاحب نے نیلے آسمان میں لہرا دیا تھا۔ وہ اس سارے منظر کو محسوس کرتے ہوئے اپنے اندر اتارنے کی کوشش میں تھا۔ کیونکہ سکھ پنتھ کے مطابق یہی وہ مقام ہے جسے وہ اپنی روحانی غذا کا سپلائی سینٹر سمجھتے ہیں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہاں آ کر وہ روحانی سکون محسوس کرتا، جس کی وہ توقع کر رہا تھا لیکن بجائے شانت ہو جانے کے اس کے اندر موجود الاؤ کے بھڑکنے کی آواز مزید بڑھ گئی۔ وہ چونک کر اپنے آپ پر حیران ہونے لگا کہ اس کے ساتھ یہ کیا ہونے لگا ہے۔ اس نے گھوم کر اپنے اردگرد دیکھا۔ اسے ہر طرف سکون دکھائی دے رہا تھا۔ مگر اس کے اندر یہ نہ سمجھ میں آنے والی منفرد بے چینی کیوں در آئی ہے؟ سامنے تالاب کا نیلا چمکتا ہوا پانی، ہرمندر صاحب کا طلائی رنگ اور اکال تخت کا سفید اور زرد رنگ چمک رہا تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ کچھ تالاب میں نہا رہے تھے۔ ہر طرف سکون تھا لیکن اس کے اندر جوار بھاٹا کیوں دربار صاحب کے جاں بحق بے جان بدن کسی کچرے کی مانند اٹھائے اور کسی انجان ویرانے میں لے جا کر آگ لگا دی تھی۔ یہ خیال کرتے ہی جسپال کے دماغ میں نفرت کا الاؤ تڑتڑانے لگا وہ اس قدر بے چین ہو گیا کہ اس کا وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ نجانے کیوں اسے سکون ملنے کی بجائے نفرت کی آگ اس کے اندر بھڑکنے لگی تھی۔

''جسپال، تو خیریت سے تو ہے نا۔'' انوجیت کی جھنجھناہٹ بھری آواز اسے کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔ اسے بات سمجھنے میں چند لمحے لگے۔ تبھی

اس نے تھرتھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''ہاں، میں ٹھیک ہوں انوجیت۔''

''تو پھر یہ تمہاری حالت۔'' اس نے الجھتے ہوئے پوچھا تو جسپال نے اچانک کہا۔

''کچھ نہیں ہوا ہے، چل انوجیت...... آ...... چلیں واپس......!'' اس نے اضطراری انداز میں انوجیت کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''واپس؟'' انوجیت کو ایک جھٹکا لگا۔ اس نے شدید حیرت سے پوچھا۔ ''یار! ابھی تو آئے ہو! ابھی تو ادھر اکال تخت...... اور اِدھر لنگر خانہ...... ہرمندر صاحب...... ان سب کی۔''

''نہیں نا، ابھی نہیں...... تم چلو واپس، پھر کبھی ہی...... چلو۔'' اس نے سختی سے یوں کہا کہ ایک لمحے کو انوجیت کو لگا کہ جسپال سنگھ ڈر گیا ہے۔ اسے واقعی خوف آ گیا ہے۔ اس وقت وہ دونوں پرکرما پر کھڑے تھے۔ انوجیت کو برا تو لگا لیکن اس کا اظہار نہ کر پایا۔ جسپال نے پلٹ کر اسی دروازے کا رخ کر لیا تھا جدھر سے وہ آیا تھا۔ انوجیت نے ایک لفظ نہیں کہا مگر اس کے چہرے پر جو تاثر پھیلا ہوا تھا اس میں کئی سوالوں کی بنت موجود تھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ کہیں وہ ہرمندر صاحب کا اپمان تو نہیں کر رہا ہے۔ جسپال نے قدم بڑھا دیے تھے۔ اس لیے انوجیت کو بھی واپس پلٹنا پڑا۔ وہ دونوں خاموشی سے پارکنگ تک آئے۔ گاڑی لی اور اس میں بیٹھ گئے انوجیت نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اب بتاؤ، کہاں جانا ہے؟'' اس کے لہجے میں غصہ چھلک رہا تھا۔ جس طرح نرم سی آواز میں انجن جاگ اٹھا۔

''سیدھے پنڈ جانا ہے۔'' اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے گاڑی بڑھا دی۔ وہ آہستہ روی سے رش والے علاقے سے گاڑی لے کر چلا۔

امرتسر سے نکلتے ہوئے ان کے درمیان خاموشی رہی۔ تاہم شہر کے کنارے تک آ جانے پر اس نے پوچھا۔

''جسپال گاؤں جانے کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک ترن تارن اور نکودر کی طرف سے اور دوسرا جالندھر کی طرف سے بتا کس طرف سے چلیں۔''

''یار، ہمیں اپنے پنڈ اوگی جانا ہے۔ جس طرح سے بھی چلو، راستا تو تمہی جانتے ہو۔'' جسپال کو انوجیت کی بات کرنا اچھا لگا تھا۔ اسے خود پر چھائی ہوئی حالت خاصی کم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''یار وقت تو دونوں طرف سے ایک جیسا ہی لگے گا۔'' اس نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔ جسپال چاہتا تھا کہ وہ مزید باتیں کرے اس لیے پوچھا۔

''تو بتا یہ دونوں راستے کیسے ہیں، پھر ان میں سے کوئی ایک چن لیں گے۔'' اس پر انوجیت نے لمبا ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔

''یہاں سے جالندھر تک بہت اچھی سڑک ہے کارپٹ روڈ، سفر تھوڑا زیادہ ہے یہی کوئی پچاسی کلومیٹر کے لگ بھگ لیکن سکون سے پہنچ جائیں گے۔ پھر جالندھر سے مغرب کی طرف سیدھی سڑک اوگی کو جاتی ہے لیکن وہ اتنی اچھی نہیں یعنی جالندھر سے اوگی تک کا سفر۔''

''اور دوسرا راستا؟'' اس نے تیزی سے کہا۔

''ترن تارن تک سڑک ٹھیک ہے پھر ذیلی سڑکوں سے تلونڈی چوہدریاں کے قریب نہر پار کر کے بابا جوگی روڈ، پھر وہاں سے کھتوان روڈ سے......!''

''یار، وہ پہلے والا سیدھا راستا ٹھیک ہے۔ چاہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس میں زیادہ وقت لگ جائے گا۔ مگر یقین تو ہے نا کہ ہم پہنچ آسانی سے جائیں گے۔" جسپال کے لہجے میں تازگی ابھر آئی تھی۔

"ہاں، یہ تو ہے خیر، سناؤ...... پر شارے؟" انوجیت نے گاڑی جالندھر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یار کسی بھی ڈھابے پر روک لینا۔" جسپال نے کہا اور سکون سے اپنا سر سیٹ کی پشت گاہ سے لگا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ جالندھر ہائی وے پر چڑھ گئے۔ کارپٹ روڈ کے باعث انجن کی آواز مدہم تھی۔ تبھی انوجیت نے پوچھا۔

"جسپال، ایک بات پوچھوں۔"

اس کے یوں کہنے پر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر اس کی جانب دیکھ کر گمبھیر لہجے میں بولا۔

"انوجیت، ایک بات نہیں، تم ہر وہ بات پوچھو جو تمہارے ذہن میں ہے۔ مجھے تیری بڑی ضرورت ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ میرے بارے میں تمہارے ذہن میں کوئی بھی الجھن رہے۔"

"شاید میرے ذہن میں کوئی سوال نہ آتا جسپال مگر دربار صاحب میں جو تمہارا رویہ تھا نا اس نے وہ سارا تاثر ختم کر دیا جو میرے ذہن میں تمہارے لیے تھا۔ تم وہ نہیں ہو جس کی دوستی میرے ساتھ نیٹ پر ہوئی تھی۔" اس کے لہجے میں کافی حد تک جذباتی پن تھا۔

"نہیں انوجیت میں وہی ہوں اور جتنا میں نے تمہیں بتایا ہوا ہے وہ جھوٹ نہیں حقیقت ہے۔ اب سنو میں نے تمہیں یہی بتایا ہے نا کہ میرا تعلق اوگی سے ہے لیکن یہ اب تک نہیں بتایا کہ میرا تعلق کس خاندان سے ہے۔ میرا سارا خاندان انیس سو چوراسی کے سکھ ہولوکاسٹ میں تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ تم یہ جانتے ہو کہ میں پہلی بار بھارت آیا ہوں۔ لیکن تمہارے اوگی میں میری حویلی، میری زمینیں اب بھی میری راہ تک رہی ہیں کہ میں ہی اپنے خاندان کا آخری فرد بچا ہوں۔"

"تم پیدا تو یہیں اوگی میں ہوئے...... تو......!" انوجیت نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں، میں یہیں اوگی میں پیدا ہوا لیکن میں نے شعور وینکوور میں سنبھالا۔" یہ کہہ کر جسپال چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "میں تمہیں شروع سے بتاتا ہوں۔ ممکن ہے اس میں تمہارے لیے کوئی نئی بات ہو جہاں بھی تمہیں لگے کہ یہاں الجھن ہے تو مجھ سے پوچھ لینا۔"

"ٹھیک ہے کہو۔" اس نے سڑک پر نگاہیں جمائے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جب شری دربار صاحب پر اندرا حکومت نے فوج کشی کی تھی، میرے باپو میری پیدائش پر مانی گئی منت اتارنے سیوا کار کے لیے وہیں دربار میں موجود تھے لیکن ساکا (سانحہ) چوراسی میں ہی میرے دو تائے ایک چاچا ان کی بیویاں بچے اور میری ایک پھوپھو سمیت سب کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ اس گاؤں اوگی میں انہیں مارا گیا اور انہیں جلایا گیا۔ میری ایک پھوپھو بچی تھی جو ساتھ والے گاؤں میں بیاہی ہوئی تھی اس نے آ کر مجھے سنبھالا میں اس وقت محض ایک سال کا تھا شاید گوشت کا ایک بے ضرر لوتھڑا سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ وہی پھوپھو اپنے شوہر کے ساتھ مجھے وینکوور لے گئی وہیں میں نے شعور سنبھالا۔"

"تمہاری پھوپھو نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ وہ سب کیسے ہوا؟" انوجیت نے پوچھا۔

"اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ بھارتی فوج اور اندرا حکومت نے مل کر سکھ قوم کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ جس طرح انگریزوں نے مسلمانوں کو مذہبی طور پر نقصان پہنچانے کے لیے "مرزائی" تخلیق کیے تھے۔ بالکل اسی طرح سکھوں کو ختم کرنے کے لیے مذہبی طور پر، نرنگاری سکھ تخلیق کیے۔ جنہیں چانیہ سیاست امرت دھاری سکھوں پر مسلط کر رہی تھی۔ دوسری جانب امرت دھاریوں کو ختم کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا گیا۔ انہیں کاٹ کاٹ کر پھینکا گیا، انہیں زندہ جلایا گیا۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ ایسا ہی تھا؟ یا فقط تمہاری پھوپھو ہی کا خیال تھا۔" انوجیت نے چمکتی آنکھوں سے پوچھا۔

"اب تک میں نے جو بھی ذرائع ابلاغ میں پڑھا۔ معلومات لیں تیرے جیسے نیٹ دوستوں سے گپ شپ کی۔ اس سے میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہی ہوا ہوگا لیکن انوجیت، صرف ہمارے خاندان کے ساتھ ایسا کیوں ہوا اوگی میں اور کوئی پورا خاندان اس قدر بے دردی سے نہیں مارا گیا۔ ہمارا خاندان ہی کیوں؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے میری پھوپھو نے نگاہیں چرائیں اس لیے میرے دماغ میں یہ بات نوجوانی ہی سے تھی کہ میں اس حقیقت سے پردہ چاک کروں گا۔ میری پھوپھو نے مجھے کبھی یہاں بھارت آنے کی اجازت نہیں دی، مگر اب وہ "پوری" ہو گئی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

"اوہ! بہت افسوس ہوا۔" انوجیت کے لہجے میں بھی دکھ تھا۔

"ہاں انوجیت وہ میری پھوپھو ہی نہیں میری ماں بھی تھیں میرا باپ بھی وہی، میری دوست، میری محسن میرا سب کچھ تھیں۔" جسپال نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"ان کی کوئی اولاد ہوئی۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں، دو بیٹے اور بیٹی مجھے بڑا بھائی مانتے ہیں اپنا سارا کاروبار انہی کے سپرد کر کے آیا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے چند لمحے خاموشی اختیار کرنے کے بعد کہا۔

"میں نے وینکوور میں پڑھا۔ اپنا بزنس شروع کیا اور آج پچیس سال بعد ایک مضبوط بزنس انہیں دے کر یہاں آ گیا ہوں انوجیت، میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی کہ مجھے کوئی ایسا بندہ مل جائے جو اوگی پنڈ کا ہو۔ وہاں تو مجھے کوئی نہیں ملا۔ صرف تم میرے نیٹ فرینڈ بنے جو اوگی سے تعلق رکھتا تھا۔"

"اور تمہاری مجھ پر نوازشات کی وجہ یہی تھی کہ تم یہاں پر......!" اس نے کہنا چاہا مگر جسپال نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا انوجیت، میں نہیں چاہتا تھا کہ تم میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاؤ، میں نے جو کچھ بھی کیا تمہیں اپنا دوست بنانے کے لیے کیا۔ یہ تم پر کوئی احسان نہیں بلکہ میری مجبوری تھی۔ اب تم اسے جو سمجھو۔" اس کے لہجے میں شرمندگی کی ہلکی سی بھی رمق نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے اعتماد تھا۔

"مجھے اچھا لگا جسپال کہ تم نے صاف صاف کہہ دیا۔ اب یہ یقین رکھنا کہ میں تمہارا دوست ہوں۔ جتنا چاہے مجھ پر اعتماد کر لینا۔"

"میں شکریہ نہیں کہوں گا انوجیت۔" جسپال نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہنا بھی نہیں چاہیے۔" وہ دھیرے سے بولا، پھر تیزی سے پوچھا۔ تم اب اوگی میں کیا کرنا چاہتے ہو۔"

"سچ پوچھو تو مجھے خود نہیں معلوم میں نے کیا کرنا ہے، کیا نہیں کرنا۔ اب یہ حالات ہی بتائیں گے۔" وہ ایسے بولا جیسے اس کی آواز کسی گہرے کنویں سے آ رہی ہو۔ اسے دربار صاحب میں اپنی کیفیات یاد آنے لگیں۔ اسے یہ باور تو ہو گیا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے لیکن یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کن حالات میں اس نے کیا کرنا ہوگا۔ دربار صاحب سے اسے اشارہ مل گیا تھا۔ انہیں امرتسر سے نکلے تقریباً

WWW.PAKSOCIETY.COM

پون گھنٹہ ہو گیا تھا۔ تبھی سڑک کنارے ایک ڈھابے کی طرف گاڑی موڑتے ہوئے انوجیت نے کہا۔

''چل یار پرشاد تو شکھیں، پھر دیکھی جائے گی۔''

جسپال سنگھ مسکرا کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

تارکول کی سیاہ سڑک نے گاؤں اور حویلی کے درمیان حد فاصل قائم کر دی تھی۔ یہ سردار شاہ دین کی حویلی اور نورنگ الگ الگ دکھائی پڑتے تھے۔ سڑک کے دائیں جانب آبادی والے گاؤں میں زندگی کی جدید سہولتیں میسر آنا شروع ہو گئی تھیں۔ سڑک کے بائیں جانب کافی آگے جا کر حویلی تھی۔ تارکول کی بڑی ساری سڑک تقریباً ڈیڑھ فرلانگ فاصلہ طے کر کے حویلی تک پہنچاتی تھی۔ سولہ ایکڑ رقبے پر حویلی کی چاردیواری تھی۔ جبکہ رہائشی حصہ چار ایکڑ پر تھا۔ جس کے اردگرد سبز قطعات، باغ اور ملازمین کے رہائشی کوارٹر تھے۔ ایک طرف اصطبل تھا جو اب جدید ماڈل کی گاڑیوں کا گیراج بن چکا تھا۔ میں نے درمیانی سڑک سے حویلی والی سڑک پر بائیک موڑی تو سفید پینٹ کی ہوئی حویلی مجھے دھوپ میں چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ آہنی گیٹ بالکل سیاہ تھا۔ جو کسی قلعے کا گیٹ ہونے کا تاثر دے رہا تھا۔ میں نے گیٹ کے پاس بائیک روکی تو چوکیدار نے مجھے دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا۔ میں بائیک سمیت اندر چلا گیا۔

حویلی کے عقب میں سبز لان کے ایک کونے میں بڑی ساری چھتری تلے سردار شاہ دین کے ساتھ شاہ زیب بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے سامنے دھری میز پر چائے کے نفیس برتن تھے۔ میرے اور ان کے درمیان پتھر کی ایک روش تھی۔ وہیں پر میں نے ایک طرف بائیک کھڑی کی اور ان کی جانب بڑھ گیا۔ وہ دونوں بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جس سے نجانے مجھے کیوں یہ احساس ہوا کہ وہ میرے منتظر تھے۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا اور بڑے مودب انداز میں کھڑا ہو گیا۔ تب سردار شاہ دین نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''بیٹھو۔'' اس کا اشارہ قریب رکھی کرسیوں میں سے ایک کی طرف تھا جو مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر رکھی ہوئی تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ سردار مجھے اپنے برابر بیٹھنے کے لیے کہے۔ اس لیے میں نے بڑے مودب انداز میں کہا۔

''نہیں سردار جی، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں آپ حکم کریں۔''

''جب میں تمہیں کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہہ رہا ہوں تو بیٹھ جاؤ۔'' اس نے قدرے الجھتے ہوئے کہا۔

''سردار جی اس کرسی پر بیٹھنا بہت آسان ہے مگر بیٹھ کر اٹھنا بہت مشکل ہے وہ تھوڑی دیر جو میں اس کرسی پر گزاروں گا اس کی لذت میرا دماغ خراب کر دے گی۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔'' میں نے اسی ادب سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے خوش گوار لہجے میں بولا۔

''جمال، میں جانتا ہوں کہ منت نے تجھے ڈھال کر تلوار بنا دیا ہے۔ تم چمک بھی گئے ہو لیکن ابھی تیز دھار ہونے میں تمہیں کچھ وقت لگے گا۔''

''میں جانتا ہوں سردار جی، جہاں تلوار بن گیا ہوں وہاں دھار لگنے میں اب کتنا وقت لگے گا۔ خیر آپ حکم کیجیے۔'' میں نے اپنے لہجے کو باادب ہی رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ وہ چند لمحوں بعد بولا۔

''یہ تو تمہیں معلوم ہے نا جمال کہ میں نے ہمیشہ فنکاروں کی قدر کی ہے۔ فٹ بازوں سے لے کر تیرے جیسے ماہر نشانہ بازوں تک نے اس حویلی سے ہمیشہ قدر پائی ہے۔ رات پہلے والا معاملہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میرے گاؤں کا لڑکا بھی اتنا بڑا فنکار ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ سو روپے والے نوٹوں کی ایک گڈی میز پر برتنوں کے ساتھ رکھ دی۔

''لو یہ تمہارا انعام ہے اٹھا لو۔''

اس کے یوں کہنے پر میرے اندر ایک بگولا اٹھا۔ جس سے مجھے توہین کا احساس ہوا۔ میں انعام اور معاوضے کے درمیان فرق کو سمجھتا تھا لیکن سامنے پڑی ہوئی نوٹوں کی گڈی نہ انعام اور نہ معاوضہ یہ وہ چارہ تھا جو کسی کو ذہنی غلام بنانے کے لیے ڈالا جاتا ہے۔ میں سردار شاہ دین کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لیے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''سردار جی اتنی بڑی رقم؟''

''نہیں، یہ کوئی اتنی بڑی رقم نہیں ہے تمہارے شایان شان تو اس سے بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ یہ گڈی اٹھا کر جیب میں ڈالو پھر میں تم سے وہ کچھ کہوں جو میں تمہارے بارے میں سوچا ہے۔'' وہ بہت کائیاں تھا۔

قدم بہ قدم آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ میرا ردعمل ہی اسے آگے بڑھنے میں مدد دیتا۔ اس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ ضرور کوئی ڈیل کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ میرے جیسے بے اوقات بندے کے لیے تو اس کے پاس سوچنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ میں نے ایک لمحے میں سوچا اور آگے بڑھ کر گڈی اٹھا لی۔ پھر ادب سے بولا۔

''جی سردار جی حکم۔''

''تجھے معلوم ہی ہے کہ شاہ زیب نے چودہ جماعتیں پڑھ لی ہیں۔ تم دونوں ایک ساتھ ہی تو کالج پڑھتے رہے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے اب لاہور یونیورسٹی بھیج دوں۔ تم بھی اس کے ساتھ پڑھنے کے لیے وہیں داخلہ لے لو سارا خرچہ حویلی ہی سے ہو گا۔ وہاں تم اس کے ساتھ رہو گے۔ اس کے لیے معقول ماہانہ رقم بھی ملے گی جاؤ، تیاری کر لو کل تم لوگوں نے یہاں سے نکلنا ہے۔'' اس نے بڑے سکون سے اپنا خیال ظاہر کر دیا۔ تبھی میں خود پر قابو پاتے ہوئے پرسکون لہجے میں بولا۔

''مطلب، مجھے وہاں شاہ زیب کا باڈی گارڈ بن کر رہنا ہو گا۔''

''ہاں، ایک تو ہماری دشمن داری بہت ہے یہ تجھے معلوم ہے، دوسرا یہ وہاں فقط پڑھنے ہی نہیں جا رہا بلکہ میں اسے وہاں سے سیاسی طور پر ابھارنا بھی چاہتا ہوں۔ جیسے ہی یہ یونیورسٹی پڑھ لے تب تک کم از کم صوبے کے لوگ تو اسے جانتے ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بڑے خنک لہجے میں کہا۔ ''پھر...... تجھے بھی تو ابھی تیز دھار بننا ہے۔ تمہارے لیے بھی یہ سنہری موقع ثابت ہو گا۔''

''گویا مجھے وہاں پر شاہ زیب کا ملازم بن کر رہنا ہو گا جس کے عوض اتنی نوازشات مجھ پر کی جا رہی ہیں۔'' اس بار میرے لہجے میں تلخی کی ہلکی سی رمق در آئی تھی۔ اس پر سردار نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''تم اسے جو مرضی نام دے لو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ طنزیہ انداز میں مسکرا دیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔ میں نے بڑے سکون سے وہ گڈی دوبارہ میز پر رکھ دی اور بولا۔

''یہ تو قدرت کی تقسیم ہے نا سردار جی کہ آپ کے پاس دولت کا شمار نہیں لیکن مجھے جو میرے رب نے دیا ہے وہ آپ کے پاس نہیں۔ آپ شاہ زیب کے لیے اپنی دولت سے نجانے کتنے باڈی گارڈ خرید سکتے ہیں۔ میرا فن اس جیسے گھٹیا کاموں کے لیے نہیں ہے مجھے اپنے فن کی قدر کرنا آتا ہے اور باقی رہی میرے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تیز دھار ہونے کی بات تو وقت سب کچھ بنا دیتا ہے اور کوئی حکم ہے میرے لیے؟" اس بار میں نے سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی تو وہ مسکرا دیا اور بڑے سکون سے بولا۔

"تم میں سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ تمہارا خون بہت گرم ہے۔ یہ تجھے کچھ بھی نہیں سوچنے دیتا۔ جاؤ' آج سارا دن میری آفر پر ٹھنڈے دماغ سے غور کرنا۔ بات سمجھ میں آجائے تو حویلی آجانا اپنی تیاری کر کے......!"

اس سے پہلے کہ میں فوری طور پر انکار کر دینے کے لب کھولتا اچانک شاہ زیب نے تیزی سے کہا۔

"یہ کیسی باتیں چل پڑی ہیں۔" پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "یار کیا تم نے مزید آگے نہیں پڑھنا۔ ہم کل تک اکٹھے پڑھتے آئے ہیں اگر اب ایک ساتھ داخلہ لے لیں گے اور ساتھ میں رہیں گے تو اس میں برائی کیا ہے۔ تم نہ بننا میرا باڈی گارڈ دوست بن کر رہ سکتے ہو میرے ساتھ۔ دوسرے لوگ تھوڑے ہیں اس کام کے لیے۔"

"شاہ زیب' چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر...... بات تو ایک ہی ہے۔ سنو' میں سردار صاحب کی آفر سے انکار کرتا ہوں۔"

"برخوردار' تم بہت بڑی آفر ٹھکرا کر محض کنویں کے مینڈک رہنا چاہتے ہو جبکہ میں تجھے آسمان تک پہنچانے کی بات کر رہا ہوں۔" سردار نے طنزیہ لہجے میں کہا تو میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"سردار جی' مجھے ابھی آسمان پر نہیں جانا' ابھی زمین پر بہت کام ہیں اللہ حافظ۔"

میں نے ان دونوں پر ایک نگاہ ڈالی جو میری طرف ہی دیکھ رہے تھے میں نے مزید کچھ سنے بغیر اپنے قدم واپسی کے لیے بڑھا دیے۔ رہائشی عمارت کی طرف آتے ہوئے راستے میں میری بائیک کھڑی تھی۔ میں نے وہ اسٹارٹ کی تو اس کی آواز نے خاموشی کو چیر دیا۔ میں اپنے آپ کو پرسکون کرتا ہوا وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی ماں نے میرا چہرہ پڑھ لیا۔ وہ اس وقت صحن میں لگے نیم کے درخت تلے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے سبزی کی ٹوکری تھی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری چارپائی پر سوہنی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بائیک کھڑی کر کے اندر جانے لگا تو ماں نے کہا۔

"اوئے جمالے' ادھر بات سن' تجھے خیریت تو ہے نا۔"

میں رک گیا اور وہیں کھڑے کھڑے بولا۔

"کوئی بات نہیں ماں سب ٹھیک ہے تو مجھے ناشتا دے بعد میں اس کے ساتھیوں کا اتا پتا معلوم کرنے جاؤں' ان کا پتا چل گیا تو ٹھیک ورنہ اسے شہر کے اڈے پر چھوڑ دیتا ہوں خود چلی جائے گی۔"

"حویلی والوں نے تجھے کیوں بلایا تھا۔" اماں نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا تو میں اماں کے پاس جا بیٹھا اور وہاں کی ساری روداد سنا دی۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

"اچھا کیا تو نے سردار کو انکار کر دیا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں۔

"ماں' کیا تجھے میرا انکار کرنا اچھا نہیں لگا۔" میں نے الجھتے ہوئے پوچھا تو وہ تڑپ کر بولیں۔

"دیکھ جمالے میں نے تجھے اس وقت بھی نہیں ڈرایا تھا جب تو میری چھاتی سے لگ کر دودھ پیتا تھا۔ تو جانتا ہے کہ میں نے آج تک نہ تجھے ڈرایا ہے اور نہ کبھی تیرا حوصلہ توڑا ہے لیکن ابھی' ان سرداروں کے ساتھ تیری دشمنی سے تیری زندگی اجیرن ہو جائے گی۔" ماں

نے کہا تو سوہنی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"ان کی دوستی کون سا سکون لینے دے گی ماں کیا تجھے اپنے بیٹے پر بھروسا نہیں تو بیوہ ہو کر بھی میری پرورش کرتی رہی اور میں تجھے ناامید کر دوں گا۔" میں نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھے بس تیری فکر ہے کیونکہ یہ دنیا بڑی ظالم ہے پتر۔" ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ماں جب تک تیری دعا ہے نا مجھ پر کوئی آنچ نہیں آسکتی۔ چاہے ساری دنیا میری مخالف ہو جائے اور تو نے مجھے جو بنانا تھا بنا دیا اب میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا بننا ہے اور کیا کرنا ہے۔ بچپن سے لے کر آج تک یہی ایک سبق تو سیکھا ہے میں نے۔" میں نے حتمی انداز میں کہا تو ماں نے دلار سے کہا۔

"میرے لعل' میں تجھے بہت بڑا آدمی دیکھنا چاہتی ہوں۔" ان کے لہجے میں ممتا گھلی ہوئی تھی۔

"اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ میں کسی کی نوکری کروں یا کسی کا غلام بن جاؤں۔ یہ سردار تو انسان پر انسان کی حکومت چاہتے ہیں۔ جسے میرا ضمیر کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ میری قسمت میں جو ہو گا میں بن جاؤں گا۔ چل چھوڑ اس قصے کو۔ مجھے ناشتا دے بہت بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا تو اماں اٹھ گئیں۔ سوہنی ایک ٹک مجھے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ تبھی میں نے اس سے پوچھا۔

"ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آرہی ہے سوہنی۔ تیرے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔ تو اس طرف کیسے آگئی۔"

"میں......!" اس نے سوچتے ہوئے کہا جیسے یاد کر رہی ہو پھر بولی۔ "میں اس وقت تم لوگوں کے قریب ہی تھی جب فائرنگ شروع ہوئی۔ اسی بھگدڑ میں کسی نے مجھے بازو سے پکڑا اور ایک طرف لے کر نکل کھڑا ہوا۔ وہ کوئی دیہاتی بندہ تھا۔ اس کے پیچھے چند لوگ تھے۔ شاید وہ مجھے مال غنیمت سمجھ رہے تھے یا...... پتا نہیں کچھ ایسا تھا کہ مجھے خوف آگیا۔ میں پوری قوت لگا کر اس سے اپنا بازو چھڑایا اور جدھر منہ آیا ادھر بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ کچھ دور تک میرے پیچھے آئے میں اندھا دھند بھاگتی ہوئی فصلوں میں چھپ گئی۔ مجھے ان کا تو پتا نہیں کدھر گئے لیکن اتنی دیر میں تم آگئے۔" اس نے اپنی بات کہی تو میں نے پوچھا۔

"تجھے مجھ پر اعتبار آگیا یا مجبوری میں ڈر کر......!"

"میں نے اگر تمہیں وہاں پنڈال میں فائر کرتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو کبھی تیرے ساتھ نہ آتی۔ اس وقت مجھ کسی پناہ کی ضرورت تھی۔ سو میں تمہارے ساتھ یہاں آگئی۔" وہ حتمی لہجے میں بولی تو میں نے کہا۔

"اچھا تو ایسے کر اپنی تیاری پکڑ میں ناشتا کر لوں تو تجھے چھوڑ آؤں۔"

"کہاں...... کہاں چھوڑ کے آؤ گے...... میرے ساتھی مل گئے ہیں؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"پتا کرتے ہیں مل گئے تو ٹھیک ورنہ تجھے شہر کے اڈے پر چھوڑ دیتا ہوں کسی بس میں بیٹھ کر چلی جانا۔"

"کیا تو مجھے دو چار دن ماں جی کے ساتھ نہیں رہنے دے گا آخر میں نے چلے ہی جانا ہے آج نہیں تو چند دن بعد......!" اس نے حسرت آمیز لہجے میں کہا تو میں مسکرا دیا اور عام سے لہجے میں بولا۔

"چل زیادہ فلمی ڈائیلاگ مت مار' میں خوامخواہ کی کوئی الجھن نہیں پالنا چاہتا۔ چل اٹھ جا۔" میں نے کہا تو اٹھ گئی۔

اس وقت اماں نے میرے سامنے ناشتا رکھ دیا تھا۔ جب چھا کا گیٹ سے اندر آتا ہوا دکھائی دیا اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے مخالف سمت چارپائی پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

بیٹھتے ہوئے بولا۔

''پتا ہے رات کتنے بندے زخمی ہوئے ہیں دونوں طرف سے لگ بھگ اٹھارہ بندے شدید زخمی ہیں۔ اب شاید ان میں دو چار بندے مر بھی جائیں۔'' اس نے خبر سنائی اور بڑے سکون سے ناشتے کی طرف ہاتھ بڑھادیا۔

''یہ مرنے والے بندے کن کے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''پیرزادہ وقاص کے، اپنے بندے تو بہت کم زخمی ہوئے ہیں۔'' اس نے نوالا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو ناشتا کر کے تیار ہوجا شہر چلتے ہیں وہاں زخمیوں کا بھی پتا کرلیں گے اور اس کو بھی چھوڑ دیں گے۔'' میں نے دالان میں کھڑی سوہنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یار، رات تو بڑی خوب صورت لگ رہی تھی یہ...... اسے بلانا پاس، ذرا قریب سے دیکھوں۔'' اس نے مذاق سے کہا۔

''ابھی تیرے ساتھ بٹھادوں گا دیکھتے رہنا اسے چل تو ناشتے کی طرف دھیان دے۔'' میں نے مکھن اس کے پراٹھے پر رکھتے ہوئے کہا تو وہ دھیرے سے مسکرا کر رہ گیا۔

اس وقت ہم ناشتا کر کے چائے پی رہے تھے کہ سوہنی دھیمی چال سے چلتی ہوئی ہمارے قریب آئی اور بڑے اجنبی سے لہجے میں بولی۔

''یہاں گاؤں میں کوئی فون ہے، کہیں سے میں کال کرسکتی ہوں؟''

''ہاں، چوک میں ہے اچھو کریانے والے کے پاس، کیوں کسے کرنا ہے فون؟'' میں نے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تیرا معاملہ نہیں ہے جمال، اب میں چلی جاؤں گی تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا تو میں نے چھاکے کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل اجنبی بن کر ہماری بات سن رہا تھا۔ تب میں نے کہا۔

''چل بول کیا ہے تمہارا نمبر میں وہاں فون کردیتا ہوں، ہاں تجھے چوک میں نہیں لے جاسکتا؟''

''میں ابھی لکھ دیتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ الٹے قدموں اندر کی طرف چلی گئی جبکہ چھاکا کچھ کہے بغیر واپس چلا گیا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ میں نے اسے اب ہر حال میں یہاں سے بھیج دینا ہے اور پھر ہمیں شہر بھی تو جانا تھا وہیں کسی بس میں بٹھا کر اس سے جان چھڑوالینا تھی۔

میں گلی میں نکل کر پیدل ہی چوک کی طرف جانے لگا میں ابھی چند قدم ہی بڑھا تھا کہ سامنے سے ایک سرخ رنگ کی کھلی چھت والی جیپ آناً فاناً گلی میں داخل ہوئی۔ اگلے چند لمحوں میں وہ میرے پاس آن رکی۔ جس سے دھول کا ایک مرغولا اٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دھول ہٹتی کسی نے زور سے پکارا۔

''اوئے، جمال تو ہی ہے نا۔''

جیپ میں چھ لوگ سوار تھے۔ ان کی شکلیں میرے لیے بالکل اجنبی تھیں۔ ان کا یوں میرا راستا روکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میری نگاہوں میں سردار شاہ دین کو کیا گیا انکار گھوم گیا۔ سردار یہ کب چاہتے ہیں کہ ایک ایسا آدمی جس نے یتیمی میں پرورش پائی ہو، غریب ہو، دولت اس کے منہ پر مار کر اس کے حکم سے سرتابی کرے۔ سردار سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گاؤں میں رہنے والے اس کے زیر تسلط لوگ اس کے حکم سے انحراف کردیں۔ میں نے بغاوت کی تھی۔ اب اس کی سزا تو مجھے ملنا تھی۔ اس وقت تک دھول کی دھند چھٹ چکی تھی کہ ایک کالے

بھجنگ شخص نے دوبارہ پوچھا جو پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا ان کا لیڈر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے لہجے اور انداز میں جو اکھڑ پن تھا وہ مجھے بہت برا لگا۔ اس لیے میں نے بھی ٹیڑھے انداز میں پوچھا۔

''او تجھے کس جمال کی تلاش ہے۔''

''جو رات میلے سے لڑکی اٹھا کر لایا ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ تو ہے چل وہ لڑکی ہمیں دے دے ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔'' اس نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اسی اکھڑ پن سے حکم صادر کیا۔

اس وقت فوراً ہی میرے ذہن نے سوچا کہ اسے کیسے معلوم کہ لڑکی میرے پاس ہے میں نے پہلے کبھی اسے یہاں نہیں دیکھا۔ بارہ گھنٹے سے زیادہ وقت ہوگیا تھا۔ سوہنی نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا۔ پھر یہ کون ہے؟

''کون...... کیسی لڑکی...... تو ہوش میں تو ہے کیا بک رہا ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں کہا تو وہ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

''یہ ایسے نہیں مانے گا، چل اس کے گھر چل، وہاں سے لڑکی لے آتے ہیں۔ دیکھتے ہیں یہ سورما کیا کرتا ہے؟''

اگلے ہی لمحے ڈرائیور نے جیپ بڑھا دی۔ وہ میرے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔ چند لمحوں میں وہ میرے گھر کے سامنے تھے۔ میں تیزی سے مڑ کر ان کی جیپ کے سامنے آگیا۔ مگر ان میں سے کوئی اترا نہیں تھا میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

''اوئے رکو، کیا چاہتے ہو تم لوگ؟''

''بڑا بے وقوف ہے تو، ابھی تجھے بتایا ہے...... خیر...... چل جلدی سے لڑکی نکال لا باہر ورنہ پھر ہم تو نکال ہی لائیں گے اسے۔'' اس کے لیڈر نے استہزائیہ انداز میں کہا تو خون میرے دماغ میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے تحمل سے پوچھا۔

''تو میرے ہی گھر کے سامنے کھڑا مجھے دھمکی دے رہا ہے۔ تمہاری خیر اسی میں ہے کہ تو جدھر سے آیا ہے ادھر ہی واپس چلا جا۔ میں نہیں جانتا کہ تو کس کا کتا ہے جیسے ہی مجھے معلوم ہوا میں خود جا کر اس گھٹیا حرکت کے بارے میں پوچھ لوں گا۔''

میرے یوں کہنے پر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر تضحیک آمیز انداز میں میری طرف دیکھ کر دوبارہ قہقہہ لگایا۔ پھر چند لمحے میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد وہ جیپ سے اترنے لگا۔ مگر میں اسے کب موقع دیتا اس سے پہلے کہ اس کا پاؤں زمین پر پڑتا۔ میں نے چشم زدن میں پسٹل نکالا اور اس کی پنڈلی پر فائر کردیا۔ میں نے اپنی جگہ تبدیل کی اور دوسری طرف پہلو میں آ کر اس کے کاندھے میں فائر جھونک دیا۔ اس سے پہلے کہ دوسرے اپنا اسلحہ سیدھا کرتے میں نے پورا میگزین ان پر خالی کردیا۔ یہ سب آدھے منٹ کے دورانیے میں ہوا۔ مجھے میگزین بدلنا تھا۔ میں اچانک ہی سامنے والے گھر میں داخل ہوگیا۔ میں نے تیزی سے میگزین نکالا اور بدلتے ہی دیوار پر چڑھنے لگا چند لمحوں میں دیوار کے اوپر سے باہر دیکھا۔ ان کی حالت نازک تھی۔

''جس نے بھی حرکت کی وہ اپنی زندگی سے جائے گا سر پر ہاتھ رکھ کر جیپ سے نیچے اتر آؤ۔''

جس وقت میں یہ کہہ رہا تھا ان میں سے ایک سیانے نے اپنا دایاں ہاتھ قریب پڑی گن کی طرف بڑھایا میں نے اس کے ہاتھ کا نشانہ لیا اور فائر کردیا۔ وہ چیخ مار کر الٹ گیا وہ بھی سہم گئے۔ شاید انہیں اس قدر فائر ہونے کی توقع نہیں تھی۔ وقت سے پہلے ہوجانے والا اندازہ ہی انسان کو یا تو فتح سے ہمکنار کردیتا ہے یا مات اس کے مقدر میں ہوتی ہے۔ ان کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اندازہ غلط ہوگیا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے یہی خیال کیا ہو کہ وہ ایک چیونٹی کو مسلنے کے لیے جا رہے ہیں۔ وہ لیڈر بھی میری جانب پھٹی پھٹی مگر دردناک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے کاندھے پر رکھا ہوا ہاتھ خون سے تر ہو چکا تھا۔ فائرنگ کی آواز سے گلی کے دروازے کھل کر بند ہوگئے تھے۔ میں نے پسٹل کی نال سے انہیں جیپ سے اترنے کا اشارہ کیا۔

''اب بتاؤ' تم میں سے پہلے کس نے مرنا ہے؟''

میرے یوں کہنے پر دوسروں کے تو چہروں پر رنگ آ کر گزر گئے مگر ان کا لیڈر اپنے حواس میں تھا اس نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے جمال' تو بھاری پڑ گیا ہے' ہمیں جانے دے۔''

''ٹھیک ہے' یہ بتا دو کہ تمہیں کس نے بھیجا ہے میں تجھے جانے دوں گا۔'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا تو وہ چند لمحے تذبذب میں پھر اپنی پشت پر موجود ساتھیوں کی آہ و بکا سن کر بولا۔

''پیرزادہ وقاص نے......!'' اس نے کہا تو میں ایک دم سے چونک گیا۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ سوہنی میرے پاس ہے۔ یہی سوال میں نے اس سے کیا تو وہ بولا۔

''ہمیں اس گاؤں سے پتا چلا ہے اس لڑکی کے ساتھ والے پیرزادہ کے پاس ہیں۔'' اس نے دردناک لہجے میں کہا۔ اس کی آواز اب ڈوبنے لگی تھی یا وہ ڈراما کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ' اسے کہنا کہ لڑکیوں کے ساتھیوں کو یہاں بھیج دے میں لڑکی انہیں دے دوں گا اور ہاں۔ اسے بتا دینا میں نے لڑکی کو اغوا نہیں کیا بلکہ وہ میرے ساتھ خود آئی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مجھے شدید غلطی کا احساس ہوا۔ وہ کچھ دور جا کر اسلحے کے بل بوتے پر کچھ بھی کر سکتے تھے۔ میں نے ان کے ہر بندے کو زخمی کیا تھا۔ میں اگر اس وقت ان پر رحم کرتا تو ممکن تھا کہ وہ مجھے جان سے مار دیتے۔ وہ فطری طور پر سیدھے ہوئے ہی تھے کہ میں نے کہا۔

''جیپ چھوڑ دو پیدل جاؤ یہاں سے۔ دس تک گنتی گنوں گا......پھر جو بھی نشانے پر چڑھا میں اسے مار دوں گا......ایک......!'' میں نے کچھ ایسے انداز میں کہا تھا کہ فوراً ہی ان میں ہلچل مچ گئی۔ میرے پسٹل تاننے کی دیر تھی وہ طوعاً کرہاً جیپ سے اترے اور تیزی سے واپس گلی میں چل دیے۔ حالانکہ ایک سے چلا نہیں جا رہا تھا میں جان بوجھ کو دھیرے دھیرے گن رہا تھا۔ سات' آٹھ تک پہنچا تھا کہ وہ گلی سے نکل گئے۔ میں جب تک دیوار سے نیچے آیا گلی میں سے کئی مرد اور عورتیں نکل آئے۔ میں نے کسی کے سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ میرا ذہن اس وقت تیزی سے یہی سوچ رہا تھا کہ پیرزادہ وقاص تک سوہنی کے بارے میں معلومات کیسے پہنچیں کیا گاؤں میں اس کا کوئی مخبر ہے یا پھر مخبری پر کسی کو مامور کر دیا گیا ہے؟ ان سوالوں کے جواب کا یہ وقت نہیں تھا۔ اس وقت میں شدید خطرے میں تھا۔ پیرزادہ وقاص کو دہری چوٹ دے چکا تھا۔ ان بارہ گھنٹوں میں اس کے کئی بندے زخمی کر دیے تھے۔ وہ ایسا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ خاموش بیٹھا رہتا۔ اب اس کا حملہ ایسا نہیں ہونا تھا کہ جسے میں روک سکتا۔ میں نے تیزی سے جیپ کی تلاشی لی' سارا اسلحہ ایک جگہ اکٹھا کیا پھر اسے اٹھا کر گھر کی جانب پلٹا ہی تھا کہ گیٹ کی جھری سے سوہنی دکھائی دی جو مجھے دیکھ رہی تھی۔ گلی میں موجود کسی بھی مرد یا خاتون نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے گیٹ کھولنا چاہا مگر سوہنی نے کھول دیا۔

''مجھے لینے آئے تھے وہ......؟'' اس کے لہجے میں خوف سے زیادہ تجسس تھا۔ اماں دکھ بھرے چہرے کے ساتھ دیکھ رہی۔

''ہاں' تجھے لینے...... تیرے سارے سنگی ساتھی ان کے پاس ہیں۔'' میں نے اسے جواب دیا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ میں نے اوپر والے کمرے پر پڑے تالے کو مخصوص انداز میں دبایا تو وہ کھل گیا۔ یہ میری خاص تکنیک تھی۔ اس تالے کی چابی نہیں تھی۔ دروازہ کھول کر میں نے اسلحہ ایک طرف رکھا۔ دروازہ بند کیا اور نیچے آ گیا۔ اماں اب تک ویسے ہی افسردہ اور حیرت زدہ بیٹھی ہوئی تھی۔

''تو کیا سمجھتا ہے کہ یہ پیرزادے تھے......سردار شاہ دین کی چال بھی تو ہو سکتی ہے۔'' ماں نے دھیرے سے کہا اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا سوہنی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''دیکھو میری وجہ سے خون خرابہ ہو سکتا ہے۔ وہ اب بھرپور حملہ کر سکتے ہیں۔ مجھے بتا دو کہ وہ پیرزادہ کدھر رہتا ہے میں خود چلی جاتی ہوں وہاں۔''

''بکواس مت کرو۔'' میں نے انتہائی غصے سے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''یہ میرے مزاج کے خلاف ہے کہ کوئی زبردستی مجھ سے کچھ چھین لے' جو میں نے کہا ہے ویسا نہ ہو میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ وہ تجھے یہاں سے آ کر لے جائیں تو لے جائیں۔''

''اس کا مطلب ہے میں اب تمہاری قیدی ہوں؟'' اس کے لہجے میں خوف کے ساتھ تشویش جھلک رہی تھی۔ وہ میری بات کے کچھ اور ہی معنی لے بیٹھی تھی۔ تب میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کوئی یوں دھونس جما کر تمہیں مجھ سے لے جائے ایسا ممکن نہیں تیرے سنگی ساتھی آ جائیں تو لے جائیں تمہیں...... مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''پتر! میرا من نہیں مانتا کہ پیرزادہ ایسا کر سکتا ہے تم ایسے کرو' جاؤ اور اس سے رابطہ کرو تم پر سارا معاملہ کھل جائے گا۔''

ماں کا کہنا میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ میں نے سوہنی سے کوئی بات نہیں کی اور باہر نکل گیا۔ میرا رخ پھر سے اچھو کریانے والے کی دکان کی طرف تھا۔ میں نے جاتے ہی پیرزادہ وقاص کا نمبر ملانے کے لیے کہا وہ علاقے کا معروف آدمی تھا۔ ایسے سارے لوگوں کے نمبر اس کے پاس ہوتے تھے۔ اس نے نمبر ڈائل کر کے ریسیور مجھے تھما دیا۔ دوسری جانب رنگ بجنے لگی چند گھنٹیوں کے بعد فون ریسیو کر لیا گیا۔

''ہیلو۔'' دوسری جانب سے پیرزادہ وقاص کی آواز ابھری تو میں نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں نور نگر گاؤں کا جمال بات کر رہا ہوں۔ ابھی کچھ بندے بھیجے تھے میری طرف تو نے کیا وہ واپس پہنچ گئے ہیں تیرے پاس؟''

''ابھی تک تو کوئی بندہ نہیں بھیجا تیری طرف۔ مجھے پتا چلا ہے کہ ایک طوائف تیرے پاس ہے۔ تصدیق ہوتے ہی بھیج دوں گا بندے۔ اچھا کیا تو نے فون کر لیا۔ بتا وہ ہے تیرے پاس؟''

''ہاں وہ میرے پاس ہے جو بندے تو نے بھیجے تھے میں نے انہیں زخمی کر کے واپس تیرے پاس بھیج دیے ہیں۔ جھوٹ کیوں بولتا ہے مرد ہے تو سچ بول۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''کہا نا میں نے نہیں بھیجے اگر میں اپنے بندے بھیج دیتا تو وہ لڑکی لے کر ہی آتے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' اس نے غراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تجھے کیسے پتا چلا انہوں نے تو یہ بتایا ہے کہ اس لڑکی کے سنگی ساتھی تیرے پاس ہیں اور باقی رہی بندے بھیجنے کی بات تو اپنا یہ شوق بھی پورا کر لے۔ میں تیرے انتظار میں ہوں۔ خود آنا ان

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے ساتھ۔'' میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا تو اس نے کافی حد تک تحمل بھرے لہجے میں کہا۔

''دیکھ جمال! میں تیرے جیسے ہیرے کی قدر کرتا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تو میرے ساتھ اونچی آواز میں بات کرے۔ تیرے جیسے کئی فنکار میرے ڈیرے پر پڑے ہوئے ہیں لیکن میں اسے شہہ زوری نہیں مانتا۔ وقت جس کے ہاتھ میں وہی شہہ زور ہے اور وہی طاقت ور...... میرے ساتھ دھیمے لہجے میں بات کر بتا اصل بات کیا ہے؟''

''وہی جو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے سکون سے کہا تو وہ نرم لہجے میں بولا۔

''تو سن اس لڑکی کے سارے ساتھی میرے ڈیرے پر پڑے ہوئے ہیں۔ اس لڑکی کے انتظار میں مجھے کہا گیا ہے کہ دوپہر سے پہلے وہ ان تک پہنچ جائے گی۔ اب یہ مجھے نہیں معلوم کہ کیسے لیکن یہ غلط بات ہے کہ میں نے کوئی بندے تمہارے طرف بھیجے ہیں۔''

''تو پھر تو بھی سن! تیرا نام لے کر چھ بندے میرے گھر پر حملہ کرنے آئے تھے۔ تاکہ اس لڑکی کو اٹھا کر لے جائیں۔ میں نے تم سے اس لیے پوچھا ہے کہ سازش کرنے والے نامردوں والا کام کب سے کرنا شروع کر دیا ہے'' میرے لہجے میں انتہائی درجے کی تلخی گھلی ہوئی تھی۔

''اچھا کیا! اچھا کیا تو نے مجھے بتا دیا میرے بندے مر تو جاتے لیکن لڑکی ضرور لاتے۔ تم نے اپنی باتوں میں خود ہی اشارہ دے دیا ہے کہ سازش کرنے والا نامرد کون ہے۔ میں اسے خود دیکھ لوں گا۔ اب تو دیکھ تجھے کیا کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ دھیرے سے ہنس دیا تو میں بھی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''وقت جس کے ہاتھ میں ہوگا فیصلہ اسی کے حق میں ہو جائے گا۔ وہ لڑکی میرے پاس ہے اس کے ساتھی بھیج دو میں لڑکی انہیں دے دوں گا۔ حملہ آوروں کی جیپ میرے گھر کے باہر کھڑی ہے دیکھتا ہوں وہ جیپ کون لے کر جاتا ہے۔''

''چلو طے ہوا لڑکی کے ساتھی تیرے پاس آ جاتے ہیں لیکن انہیں ان کے ٹھکانے تک بحفاظت پہنچانا اب تیری ذمہ داری ہوگی۔ ہے تم میں اتنا دم؟''

اس نے بڑا خوب صورت پینترا بدلا تھا۔ اس نے اتنے اچھے انداز میں مجھے دھمکی دی کہ میں ایک بار تو جھوم اٹھا اس نے میرے حوصلے کو چیلنج کر دیا تھا۔

''میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں پیر زادہ وقاص......!''

''مجھے تم سے یہی امید تھی لو پھر کرو انتظار' بھجوا رہا ہوں انہیں۔ ربّ راکھا۔'' اس نے جوش سے کہا اور فون بند کر دیا۔ میرے ہاتھ میں ریسیور میں ٹوں ٹوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے بے دھیانی میں ریسیور رکھا اور سوچ میں پڑ گیا وہ کیا کھیل کھیلنا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

جالندھر شہر کے باہر ہی انوجیت نے گاڑی ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ اس کا سارا دھیان ڈرائیونگ پر تھا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ جب انوجیت نے اپنی جیب میں سے سیل فون نکالا اور نمبر تلاش کر کے پش کر دیا۔ لمحوں بعد رابطہ ہو گیا تو اس نے کہا۔

''جی ہم جالندھر سے اوگی کے راستے پر ہیں' بس آپ دیکھ لیں کتنی دیر لگے گی۔ ہاں بس پہنچ کر اطلاع دیتا ہوں۔''

اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر کے پھر جیب میں ڈال لیا۔ جس پر جسپال نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ حالانکہ اندر سے تجسس ابھرا تھا۔ چاہے گاؤں اس کا اپنا تھا لیکن وہاں پر اس کا کوئی جاننے والا نہیں تھا اور

اس انوجیت سے بھی تو وہ آج ہی ملا ہے۔ چاہے پچھلے دو برسوں سے رابطہ تھا۔ آگے حالات کیا ہوتے ہیں۔ اس کا اسے خوف نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اتنا حوصلہ کر کے وینکوور ہی سے نہ آتا۔ ان دونوں کے درمیان خاموشی طویل ہو گئی۔ چونکہ انوجیت کا یہ رستا دیکھا بھالا تھا۔ اس لیے وہ تیز رفتاری سے گاڑی بھگائے جا رہا تھا اور اس کی ساری توجہ سڑک پر تھی۔ یوں جسپال نے بھی اسے باتوں میں لگانا مناسب نہیں سمجھا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی جب انوجیت نے اپنی طویل خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

''لے بھئی' جسپال سنگھ جی وہ سامنے جو گاؤں نظر آ رہا ہے وہی تیری منزل ہے۔ تیرا پنڈ اوگی۔''

اس نے دیکھا' ہرے بھرے کھیتوں کے سرے سے آبادی شروع ہوتی تھی لیکن اس کا دوسرا کنارہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''ارے یہ تو کافی بڑا گاؤں ہے۔''

''او یار' تقسیم ہند کے وقت اس پنڈ کی تین نمبرداریاں تھیں اور تین پنچوں پر ایک سرپنچ تھا۔ اب تو اتنی آبادی ہو گئی ہے چاہے اس پنڈ کو تحصیل کا درجہ دے دو' تم خود دیکھ لینا۔'' اس کے لہجے میں کافی حد تک تفاخر تھا۔

''ہاں' وہ تو دیکھوں گا سب کو ہی دیکھوں گا۔'' اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ شاید انوجیت نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔ ورنہ وہ اس کے لہجے پر چونکتا ضرور۔ اس وقت انوجیت نے گاڑی سڑک کنارے کر کے کھڑی کر دی تھی۔ جبکہ گاؤں ابھی فرلانگ بھر کے فاصلے پر تھا۔ اس سے پہلے کہ جسپال اس سے رکنے کی وجہ پوچھتا وہ خود ہی ایک طرف سڑک کے دائیں جانب ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''وہ دیکھو' وہ بڑی ساری کوٹھی' کھیتوں کے درمیان۔''

''ہاں' دیکھ رہا ہوں۔'' جسپال نے سرخ اور سفید دو منزلہ خوب صورت کوٹھی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک پختہ راستا سڑک سے کوٹھی تک جا رہا تھا۔ سبز کھیتوں کے درمیان چمکتی ہوئی دھوپ میں وہ گھر بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ تبھی انوجیت نے کہا۔

''یہ وہ گھر ہے جہاں میں رہتا ہوں۔''

''اچھا ہے۔'' جسپال سنگھ نے دل سے تعریف کی۔

''اب بتا پہلے گھر جانا ہے یا سیدھے وہاں جاؤ گے جہاں تمہارا آبائی گھر تھا' بولو۔'' اس نے اس قدر اعتماد سے کہا کہ جسپال چند لمحوں کے لیے حیران رہ گیا۔ تبھی اس نے پوچھا۔

''تو میرے آبائی گھر کے بارے میں کیسے جانتا ہے جبکہ میں نے تجھے کبھی نہیں بتایا۔''

''یہ سب کچھ میں نہیں میری بے بے بتائے گی۔ بس تو اپنے دماغ پر بوجھ نہ ڈال۔ تجھے سب پتا چل جائے گا۔'' انوجیت نے اس قدر اپنائیت سے کہا کہ وہ مزید سوال نہ کر سکا۔ اس لیے بڑے سکون سے بولا۔

''تو پھر انوجیت جیسے تمہاری مرضی۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس کا عندیہ پاتے ہی انوجیت نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر پش کر کے رابطہ ہو جانے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر کچھ لمحوں بعد بولا۔

''جی' ہم پہنچ گئے ہیں اور حویلی کی طرف جائیں گے پہلے پھر واپس آ کر باتیں ہوتی رہیں گی۔''

اس پر جسپال کچھ نہیں بولا اس نے طے کر لیا تھا کہ دیکھیں انوجیت کیا کرتا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد انوجیت نے وہ فرلانگ بھر فاصلہ طے کیا اور گاڑی گاؤں کے داخلی راستے پر ڈال دی۔ مختلف گلیوں سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوتا ہوا وہ ایک چوراہے میں آ گیا جو کافی کشادہ تھا۔ چوراہے کے درمیان میں ایک برگد کا درخت تھا۔ جس کے اردگرد گول پختہ تھڑا تھا اور وہاں پر کافی سارے مختلف عمر کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ گاؤں کی "ستھ" (چوپال) تھی۔ ان لوگوں سے کچھ فاصلے پر انوجیت نے گاڑی روک دی۔ پھر اترنے پر تولتے ہوئے بولا۔

"اس گاؤں میں ایسی چھ اور ستھ ہیں لیکن سب سے پرانی یہی ہے۔ یہیں سارا دن یہ بوڑھے اور فارغ لوگ اپنا وقت گزارتے ہیں دیکھو۔ کوئی تاش کھیل رہا ہے کوئی کنٹوری اور کچھ۔"

"مطلب یہ گاؤں کا کلب ہے۔" جسپال نے کہا اور دوسری جانب اتر گیا۔ دوسری بار اس گاؤں کی مٹی اس کے پاؤں تلے آئی تھی۔ اس کے لیے یہ سب نیا تھا' بالکل انوکھا۔ بھارتی پنجاب کا حقیقی رنگ۔ وہ رنگ جو اس سے پہلے اس نے کبھی فلموں یا تصویروں میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے سنا ہی تھا کہ پنجاب کا علاقہ بہت امیر ہے اور یہ حقیقت ہے کہ چاہے بھارتی پنجاب ہو یا پاکستانی پنجاب علاقہ امیر ہے لیکن وہاں کے بیشتر سے زیادہ لوگ غریب ہیں۔ اس کی وجہ صرف اور صرف وہی لوگ ہیں جو سیاسی اور معاشی طور پر مضبوط ہیں اور دوسرے لوگوں کا حق غصب کر جاتے ہیں۔ یہ سیاست بھی بڑا بے عزت کھیل ہے۔ جس کھیل کی بنیاد ہی منافقت ہو۔ اس میں انسانی فلاح کا پہلو کہاں سے آ سکتا ہے۔ اب معلوم نہیں اس نے یہاں کے اور کتنے رنگ دیکھنا تھے۔ یہ تو قسمت اور زندگی پر منحصر تھا کہ وہ اس کا ساتھ دیتی بھی یا نہیں۔ وہ ان لوگوں کو غور سے دیکھ رہا تھا جبکہ وہ سارے جو کچھ بھی کر رہے تھے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اس نے دور ہی سے ہاتھ جوڑ کر سب کو ست سری اکال کہا اور انوجیت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو اس کی پشت کی جانب ایستادہ بڑی ساری حویلی کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ ہے تمہاری آبائی حویلی...... جسپال۔ اٹھائیس برس سے یہ ویسی کی ویسی ہے۔" انوجیت نے کہا تو جسپال کے دل پر ایک گھونسہ لگا۔ اس نے اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے اس بدقسمت حویلی کو دیکھا جس کے سارے مکین اٹھائیس سال پہلے قتل کر کے جلا دیے گئے تھے۔ اس حویلی کی حالت اپنی خاموش زبان سے خود ہی بتا رہی تھی کہ اس پر اور اس کے مکینوں پر کیا قیامت گزری ہو گی۔ اٹھائیس برس پہلے اٹھنے والے دھوئیں سے جو سیاہی آئی تھی وقت نے اسے مزید سیاہ کر دیا تھا۔ نجانے کتنے ساون اور کتنی بارشیں ہوں گی۔ مگر اس حویلی کی قسمت میں سیاہی ہی رہی۔ جلا ہوا پھاٹک بند تھا۔ شاید لوگوں نے پانی ڈال کر آگ بجھائی ہو گی۔ لوہے' پیتل کے کنڈوں کے درمیان میں سے اندر کا بھیانک پن دکھائی دے رہا تھا۔ تبھی اس نے بھیگتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"انوجیت' کیا کبھی کوئی اس حویلی کے اندر نہیں گیا؟"

"نہیں جسپال سچ پوچھو تو لوگ اس حویلی کے اندر جانے سے ڈرتے ہیں۔" انوجیت نے دکھی لہجے میں کہا۔ تب اس نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ کیوں؟"

"یہ حویلی سن چوراسی کے مئی میں مکمل ہوئی تھی اور اس مہینے سب لوگ اس میں آ کر رہنے لگے تھے۔ جولائی میں یہ سانحہ ہو گیا اور لوگ اس حویلی کو منحوس خیال کرنے لگے اور اب تک کرتے ہیں۔"

یہ سن کر جسپال مزید کچھ نہیں بولا بلکہ اسے خود پر قابو پانے میں کئی لمحے لگ گئے۔ پھر اس نے اپنی

ہمت جمع کی اور دھکیل کر پھاٹک کو کھولا۔ ذرا سی چرچراہٹ کے بعد وہ کھلتا چلا گیا۔ ڈیوڑھی میں تند گند بھرا پڑا تھا۔ وہ چلتا چلا گیا۔ آگے صحن میں بھی حالت ویسی ہی تھی۔ صرف ایک سرسبز درخت کھڑا تھا۔ نیم کا سرسبز درخت' جس کے پتے اٹھائیس برس سے گر رہے تھے اور ان سے صحن میں سڑانڈ بسی ہوئی تھی۔ وہ صحن پار کر کے طویل برآمدے میں آ گیا۔ سیاہ کمرے اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ پھر اس کی آنکھوں کے سارے منظر ڈوب گئے۔ یہیں اس حویلی میں یہاں صحن' برآمدے اور ان کمروں میں اس کا باپو ماں' تائے' تائیاں' چاچا' چاچی ان کے بچے' اور پھوپھی...... سب زندہ رہے تھے اور اب...... ایک دم سے کہرام زدہ چیخ و پکار اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ ہوائیں بین کرنے لگیں۔ دیواریں ماتم کناں ہونے لگیں۔ اس آہ و بکا میں وہ جی کڑا کر کے وہیں کھڑا رہا۔ اس کے اندر نفرت کا الاؤ پوری قوت سے تڑتڑانے لگا تھا اور وہ لمحات کسی تیل کی مانند اسے مزید بھڑکا رہے تھے۔ رگوں میں دوڑتے ہوئے خون میں ہر خلیہ نفرت میں بھیگا ہوا تھا۔ جس میں انتقام رچ بس گیا تھا۔ نفرت اور انتقام دونوں مل کر اس کا جسم پھاڑ دینے کو تھے اور وہ خود کو ٹوٹ جانے سے بچا کر اپنے آپ پر قابو پا رہا تھا۔ ان لمحات میں اگر وہ خود پر قابو نہ رکھ پاتا تو ساری زندگی کی ریاضت ضائع ہو جانے والی تھی۔ ایسے وقت میں جبکہ وہ خود کو سنبھال رہا تھا۔ اس کی پشت پر ایک نرم سا ہاتھ آن ٹھہرا۔ اسے لگا جیسے بھڑکتی ہوئی آگ پر ساون کی رم جھم پھوار پڑنے لگی ہے۔ وہ چونک گیا اس نے آہستگی سے مڑ کر دیکھا۔ نگاہوں میں ممتا' چہرے پر موٹے نقوش' کھلتے ہوئے رنگ میں سے جھلکتا خلوص' سر پر موتیا رنگ کا آنچل لیے فربہ مائل بزرگ سی خاتون

سچ تو یہ ہے کہ!

+ اگر کوئی کہے کہ وہ محروم ہے تو سمجھ جائیے کہ وہ گستاخ ہے' محرومی' گستاخی کا ہی دوسرا نام ہے۔

+ ہر شخص حقیقت پسند ہونے کا دعویٰ کرتا ہے مگر حقیقت سے نظر چراتے ہوئے۔

+ قریب رہنے والے ضروری نہیں' دل کے قرب و جوار میں بھی رہتے ہوں۔

+ جو جتنا قریب دکھتا ہے' اصل میں وہ اتنا ہی دور ہوتا ہے جیسے کہ چاند دیکھنے میں اتنا قریب اور چھونے کا سوچو تو حدوں سے باہر۔

+ خواہشات انسان کو متحرک کیے رکھتی ہیں۔

(صبا سلیم ارگر' ٹنڈو جان محمد)

اسے پرشوق نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"پتر جسپال' میں انوجیت کی بے بے ہوں تیری پھوپھو سکھ جیت کور کی گہری سہیلی کلجیت کور۔"

"کلجیت کور...... ! آپ۔" جسپال سنگھ نے حیرت سے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ نام اس نے اپنی پھوپھو سے بارہا سنا تھا۔

"ہاں پتر! تو چل میرے ساتھ گھر وہیں چل کر باتیں کرتے ہیں۔ میں اس لیے یہاں آئی ہوں تو جتنی دیر یہاں ٹھہرے گا اتنا ہی......!" یہ کہتے ہوئے کلجیت کور کا اپنا گلا رندھ گیا۔

جسپال نے چند لمحے کلجیت کور کے چہرے پر دیکھا جو شدت جذبات سے سرخ ہو گیا تھا۔ پھر وہ اس کے گلے لگ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ بہت دنوں کے بعد اپنی پھوپھو سے مل رہا ہو۔ ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو جسپال نے اس کا ہاتھ پکڑ کر باہری جانب چل دیے۔ صحن میں پھیلے ہوئے نیم کے درخت طرف دیکھتے ہوئے کلجیت کور نے کہا۔

"صرف یہی بچا ہے' تیری طرح...... تیری اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کی عمر ایک جتنی ہے غور کر پتر جسپال۔ اس درخت کو پالنے والا دنیا میں کوئی شخص نہیں ہے پر رب تو ہے پالنے والا' دیکھ جسے کوئی نہیں پالتا رب اس کو پھل دینے والا بنا دیتا ہے۔ اسے کسی نے نہیں تراشا پر رب نے اس کو کس قدر سبز و شاداب کر دیا ہے۔ میری یہ بات پلے باندھ لے پتر۔"

ان جذباتی لمحوں میں جسپال نے کلجیت کور کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"پھوپھو وعدہ کریں آپ مجھے وہ سب کچھ سچ بتا دیں گی جو میں نہیں جانتا۔"

"ہاں پتر میں سب کچھ بتا دوں گی مگر ایک وعدہ تم نے بھی مجھ سے کرنا ہے۔"

"ایسا کوئی وعدہ مت لینا پھوپھو جسے میں پورا نہ کر سکوں۔" جسپال نے سوچتے ہوئے کہا۔

"چل پھر چھوڑ' بعد میں بات کریں گے آؤ چلیں۔" وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولیں اور باہر کی جانب چل دیں۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا باہر تک آ گیا۔

باہر لوگوں کا ٹھٹ لگ چکا تھا۔ ہر کسی کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ کلوندر سنگھ کا پتر اور اس حویلی کا مالک آ گیا ہے۔ وہ سب اسے دیکھنے کے مشتاق تھے۔ جسپال سنگھ رک کر ان سب کو دیکھنے لگا۔ وہ سب مختلف عمر کے مرد اور عورتیں' جوان' لڑکے لڑکیاں تھیں تب انوجیت نے اپنی بے بے سے کہا۔

"بے بے تم چلو' میں جسپال کے ساتھ تھانے سے ہو کر آتا ہوں۔"

"تھانے' مگر کیوں؟" جسپال نے پوچھا۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ تم غیر ملکی پاسپورٹ پر ویزا لگوا کر بھارت آئے ہو پھر سکھ بھی ہو۔ تھانے میں رپورٹ تو کرنا ہوگی۔ کیونکہ تم غیر ملکی ہو۔ شاید تمہیں اس ملک کا شہری بھی تصور نہ کیا جائے کیونکہ تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ تمہارا تعلق اس ملک سے ہے۔" انوجیت کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ جیسے وہ اس کے بارے میں نہ کہہ رہا ہو بلکہ اپنی قوم کا نوحہ پڑھ رہا ہو۔ اس پر جسپال نے طویل سانس لی اور سکون سے کہا۔

جیسے ہی کلجیت کور اپنی سفید کار میں ڈرائیور کے ساتھ واپس چلی گئیں۔ انوجیت اپنی جیپ کی طرف بڑھا۔ جسپال اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا تو اس نے جیپ بڑھا دی۔ ان کا رخ تھانے کی طرف تھا۔

☆......☆......☆

میں بے چینی سے پیرزادہ وقاص کا انتظار کر رہا تھا۔ اب تک اس کی طرف سے آنے والے لوگوں کو آ جانا چاہیے تھا۔ چھاکا تیار ہو کر آیا تو اسے بدلی ہوئی صورت حال کے بارے میں معلوم ہوا۔ اس نے فوراً ہی اپنے چند دوستوں کو اکٹھا کر لیا۔ وہ سب گھر کے باہر مختلف جگہوں پر پھیل گئے تاکہ کسی بھی ناگہانی صورت حال سے نمٹا جا سکے۔ جبکہ میں صحن میں ٹہلنے لگا۔ اماں اور سوہنی بھی صورت حال سے آگاہ تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں دو تین بار چھت پر سے ہو کر آ گیا۔ میرے گھر کی چھت سے دور تک سڑک صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس بار جب میں چھت پر گیا تو مجھے ایک ہائی ایس وین آتی ہوئی دکھائی دی۔ مجھے اس پر شک ہوا۔ ایسی ویگنیں ہمارے علاقے میں نہیں چلتی تھیں۔ میں نے تیزی سے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ پھر خود ہی اتر کر گلی میں آ گیا جہاں میری بائیک پہلے ہی سے کھڑی تھی۔ چھاکے وغیرہ نے گلی میں کھڑی ہوئی جیپ کو دھکا لگا کر گلی کے کنارے لگا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ہائی ایس گلی میں داخل ہوئی اور پھر میرے دروازے کے سامنے آن رکی۔ اس میں کافی ساری عورتیں اور مرد تھے۔ ان عورتوں کے چہرے شناسا تھے۔ ایک موٹا سا شخص باہر نکلا اور بڑے مودب لہجے میں بولا۔

"وہ...... جی...... سوہنی...... آپ کے ہاں......!"

"وہیں ٹھہرو' ابھی بلاتا ہوں۔" میں نے کہا اور پلٹ کر گیٹ میں آ گیا۔ سوہنی نیم کے درخت تلے اماں کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں نے وہیں سے ہانک لگاتے ہوئے کہا۔ "آ جاؤ' سوہنی تمہارے لوگ تجھے لینے کے لیے آ گئے ہیں۔"

میرے یوں کہنے پر وہ اماں کے گلے لگ گئی۔ پھر اپنے آنسو پونچھتی ہوئی باہر کی جانب چل پڑی تب میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"رک جاؤ۔" وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اماں سے کہا۔

"اماں اس کے وہ کپڑے جو یہ پہن کر یہاں آئی تھی وہ تو دے دو اسے۔"

اماں کو جیسے ہوش آ گیا وہ پلٹی اور چند منٹوں میں ایک بڑا سا راشاپنگ بیگ لا کر سوہنی کو دے دیا۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے میری جانب لپکی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی ویگن میں موجود لوگوں کی جان میں جان آ گئی۔ جبکہ سوہنی میرے سامنے کھڑی میرے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔ اس کا انداز یوں تھا کہ جیسے میرا چہرہ اپنی آنکھوں میں جذب کر رہی ہو۔ پھر آہستگی سے بولی۔

"جمال میں تجھے ہمیشہ یاد رکھوں گی اور تیرا انتظار کروں گی جب چاہے آ زمالینا۔"

میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ "جاؤ' یہ ڈائیلاگ بازی مت کرو جانے والے کہاں پلٹ کر دیکھتے ہیں۔" مگر وہ میرا ردعمل دیکھے اور میری بات سنے بغیر ویگن کی طرف بڑھی اور اس میں سوار ہو گئی۔ جب تک وہ موٹا شخص میرے قریب ہوا اور بڑے مودب لہجے میں بولا۔

"پیرزادہ صاحب کا پیغام ہے کہ آپ انہیں فون کر لیں۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پلٹ کر پسنجر سیٹ پر جا بیٹھا۔ تب تک میں بھی اپنی بائیک پر بیٹھ چکا تھا۔ ویگن کے بڑھتے ہی میں نے اپنی بائیک بڑھا دی۔ پھر جس وقت وہ چوک پار کر رہے تھے تب تک چھ موٹر سائیکلیں ویگن کے ارد گرد چل پڑی تھیں۔ ہر موٹر سائیکل پر دو دو بندے تھے اور وہ سب اسلحہ سے لیس تھے۔ اگر کچھ ہونا ہوتا تو یہیں ہونا تھا کیونکہ گاؤں کی گلیوں سے نکلتا ہوا یہ قافلہ

شادی کے لڈو......!

+ ۔غیر شادی شدہ لوگوں پر بھاری ٹیکس لگانا چاہیے' یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ کوئی شخص دوسروں سے زیادہ خوش ہو۔

+ ۔غیر شادی شدہ آدمی عورتوں کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں' اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ بھی...... شادی شدہ ہوتے۔

+ ۔ایک نیا شادی شدہ جوڑا مسکراتا ہے سب جانتے ہیں "کیوں؟" جب ایک دس سالہ شادی شدہ جوڑا مسکراتا ہے تو سب حیران ہوتے ہیں "کیوں؟"

+ ۔ایک آدمی کلاسیفائیڈ میں اشتہار دیتا ہے "ضرورت بیوی" اگلے دن اسے سو سے زیادہ خطوط ملتے ہیں' ان سب میں ایک ہی بات لکھی ہوتی ہے۔ "آپ میری لے سکتے ہیں۔"

+ ۔شادی سے پہلے آدمی "نامکمل" ہوتا ہے اور شادی کے بعد وہ...... ختم ہو جاتا ہے۔

(ارم کاش' پیر بخاری ملتان)

WWW.PAKSOCIETY.COM

سڑک پر آ گیا تھا اور سامنے سردار شاہ دین کی حویلی تھی۔ میں پوری طرح چوکنا تھا ویگن نے سڑک پر چڑھ کر شہر کی طرف رخ کرلیا۔ چند کلومیٹر تک ہم ان کے ساتھ گئے پھر پلٹ آئے۔ اس دوران میں نے سوہنی کی جھلک کئی بار دیکھی۔ جب بھی میری نگاہ اس پر پڑی وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ چھاکے نے انہیں شہر تک چھوڑ کر آنا تھا۔ وہ ان کے ساتھ بڑھ گیا۔ ان کے ساتھ ایک موٹر سائیکل پر دو لوگ تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ سردار شاہ دین نے مجھے دھمکانے کی کوشش کی تھی جو ناکام ہوگئی۔ میں کسی ایسے ہی وقت کا انتظار کر رہا تھا جب سردار میرے ساتھ دشمنی کا آغاز کرے اور میرے خیال میں وہ ایسا کر چکا تھا۔

مجھے پیرزادے کو فون کرنا تھا میں نے چوک میں جا کر اسے فون کیا وہ گھر پر نہیں تھا۔ سو میں ڈیرے کی طرف چل دیا۔ اس وقت سہ پہر ہو چکی تھی اور میں ڈنگروں کو چارہ ڈال کر بیٹھا ہی تھا کہ بھیدہ دودھ دوہنے کی تیاری کرنے کے لیے برتن میں پانی بھرنے گیا ہوا تھا۔ اس دن ہمیں دیر ہوگئی تھی۔ میں اور بھیدہ مغرب تک مصروف رہتے ابھی کچھ دیر بعد گوالوں نے آ جانا تھا۔ جو ہم سے دودھ خریدتے تھے۔ اگرچہ دیر ہو جانے کی وجہ سے مجھے بھیدے کا ہاتھ بٹانا تھا مگر میرا ذہن کام کی طرف نہیں تھا۔ بلکہ میں بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

پچھلے کئی گھنٹوں میں جو میرے ساتھ پے در پے واقعات پیش آئے تھے۔ مجھے ان کا سرا نہیں مل رہا تھا۔ اس وقت میں دھوتی بنیان میں تھا۔ کام بھی کر رہا تھا لیکن میرا دماغ میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ انہی لمحات میں ڈیرے کی جانب آنے والے کچے راستے پر سفید کرولا آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے پیچھے دھول اڑ رہی تھی۔ جس میں دو تین اور بھی گاڑیاں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ میں پہچان گیا کہ وہ شاہ زیب کی گاڑی تھی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کیونکہ پیرزادہ وقاص کے ساتھ بات کرکے میرا اندازہ تھا کہ وہ میرے پاس ضرور آئے گا۔ اس نے باہر والے پھاٹک پر ہی گاڑی روک دی تو باقی گاڑیاں بھی وہیں رک گئیں۔ وہ اپنی گاڑی سے نکلا اور بڑی بے تکلفی سے تنہا پھاٹک کھول کر اندر ڈیرے میں آ گیا۔ باقی لوگ باہر ہی کھڑے رہے۔ علیک سلیک کے ساتھ وہ چارپائی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ میں اس کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھا تو چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''پیرزادہ وقاص نے بڑی گہری سازش کر کے مات والا بدلہ لے لیا۔ تم شاید نہ سمجھو لیکن میں جانتا ہوں کہ اس نے میرا بہت بڑا نقصان کر دیا ہے۔''

''کون سا نقصان...... اور کتنا سردار شاہ زیب۔'' میں نے کہا تو باوجود کوشش کے طنز کو اپنے لہجے سے الگ نہیں کر پایا۔ تبھی وہ تاسف سے بولا۔

''یہ نقصان روپے پیسے کا نہیں ہے جمال! اس نے جو میرے خلاف تیرے دل میں شک کا زہر اتار دیا ہے نا یہ بہت بڑا نقصان ہے...... یہ نوٹوں سے پورا کرنا بھی ناممکن ہے۔''

''میں سمجھتا ہو سردار جی کون کیا کر رہا ہے۔ اتنی عقل ہے مجھ میں۔'' میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا جہاں افسوس بھرا تاثر پھیلا ہوا تھا۔ میری بات سن کر وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

''عقل ہی تو نہیں ہے تجھے ورنہ تو بھی وقت کے ساتھ چلتا۔ آج تیرا شمار اکھڑ اور بدمزاج لوگوں میں نہ ہوتا تو نے پتا نہیں میرے لیے کیا معیار بنایا ہوا ہے کہ تجھے کوئی بندہ پسند ہی نہیں آتا۔ مصلحت سے کام نہیں لیتے ہو۔''

''ایک مصلحت ہی تو نہیں آتی مجھے، میں کیوں ایسے بندے کو پسند کروں جو مجھے اچھا نہیں لگتا اور جہاں تک وقت کی نزاکت کا خیال ہے نا شاہ زیب جو جملا آور میرے گھر پر چڑھ دوڑے تھے۔ انہیں اگر کوں کا وقت بھی دے دیتا نا تو وہ مجھے مار کر وہیں پھاٹک پر پھینک جاتا جہاں ابھی تک ان کی جیپ کھڑی ہوئی ہے۔''

''انہی بندوں کا تو پتا نہیں چل رہا کہ وہ کون تھے ہمیشہ ادھوری بات ہی الجھن پیدا کرتی ہے جمال! کوئی ایک بندہ بھی ان کا پکڑ لیتے نا تم تو آج یہاں آ کر تم سے بات نہ کرنا پڑتی۔ تجھ پر سارا کچھ خود بخود کھل جاتا۔ تیرے اندر جو شک کا ناگ پھنکارنے لگا ہے نا ایسا نا ہوتا......!'' وہ اس طرح تشویش سے بول رہا تھا کہ جیسے واقعتاً بہت بڑا نقصان ہو گیا ہو۔

''سوچنے والی بات یہ ہے میں نے تم سے کوئی بات نہیں کی، کوئی گلہ، کوئی شکوہ، نہ کوئی شکایت اور شاہ زیب یہ تم پہنچے ہوئے بابا ہو کہ میرے اندر بیٹھے شک کے ناگ کو پھنکارتے ہوئے دیکھ رہے ہو بات کیا ہے سردار ذرا کھل کے بولو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تجسس سے پوچھا تو وہ غصے سے بولا۔

''ساری کہانی مجھے پیرزادہ وقاص نے فون پر بتائی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ رات ہونے سے پہلے پہلے اس نے اپنا بدلہ لے لیا ہے۔ اس نے مجھے اس پوزیشن میں لا کھڑا کیا ہے کہ میں تجھے اپنی صفائی بھی نہیں دے سکتا اور نہ تجھے یہ باور کرا سکتا ہوں کہ یہ سارا کچھ اسی کا کیا دھرا ہے اس نے سازش کی ہے میرے خلاف تجھے بھڑکانے کے لیے۔ میں اعتراف کرتا ہوں جمال کہ وہ اس میں کامیاب ہے۔''

''ٹھیک ہے مان لیا سردار جی کہ ایسا ہی ہوگا لیکن اس وقت میرے لیے کیا حکم ہے۔'' میں نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

''صرف اتنا کہ میری طرف سے یا پھر حویلی والوں کی طرف سے اپنا دماغ مت خراب کرنا۔ سچ یہ ہے کہ اس نے اپنے غنڈے بھجوائے کامیاب ہو جاتے تو بھی وہ اپنا بدلہ لے لیتا کہ ہماری محفل سے لڑکی اٹھا کر لے جاتا اور اب ناکام ہوا تو ہم نے اپنے ہاتھوں سے لڑکی اسے دی اپنی حفاظت میں لڑکی کو شہر تک چھوڑا غور کرو اس کی سازش کامیاب ہے۔'' وہ تاسف سے بولا۔

''تمہیں معلوم ہے شاہ زیب کہ میں اپنے دماغ سے سوچتا ہوں۔ وہ میں نے سوچ لیا ہے ہاں اس کامیاب سازش کو اگر ناکام کرنا چاہتے ہو تو اب بھی وقت ہے کر سکتے ہو۔ ورنہ میں نے تو وہی کرنا ہے نا جو میں نے سوچا ہے۔''

''وہ کیا؟'' اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

''میرے گھر کے سامنے کھڑی ہوئی جیپ یہ پکی بات ہے کہ وہ چوری کی ہوگی سردار شاہ دین ایم این اے ہیں پارٹی میں بڑا اثر و رسوخ ہے پولیس والے ان کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ پتا کروالیں یہ کس نے چوری کی ہے۔ معاملہ صاف ہو جائے گا۔'' میں نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہ ایک دم سے تن گیا جیسے بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہو۔

''ٹھیک ہے اب مجھے صفائی دینے کی ضرورت نہیں، سارا معاملہ پولیس حل کر دے گی۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں روایتی طریقے سے دونوں ہاتھوں کے ساتھ اس کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اس نے ایک نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور واپس پلٹ گیا۔ میں اسے اس وقت تک دیکھتا رہا۔ جب تک وہ اپنے ساتھ آئے لوگوں کے ساتھ کچے راستے پر گاڑیاں دوڑاتے ہوئے نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ میں دھیرے سے ہنس دیا۔ مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنی انگلی پر نچانے والے اب خود ناچنے لگے تھے۔

مغرب سے ذرا قبل میں نے گھر لے جانے کے لیے دودھ کا برتن بائیک کے پیچھے رکھا اور چل دیا۔ گوالے کب کا دودھ لے جارہے تھے۔ ڈیرے سے گھر کا فاصلہ تقریباً اڑھائی کلومیٹر تھا جو سارے کا سارا کچا تھا۔ میں گاؤں میں داخل ہوکر چوک تک آیا تو فضل کمہار نے مجھے روک لیا پھر جلدی سے بولا۔

''ابھی اپنی گلی میں مت جاؤ' ادھر پولیس آئی ہوئی ہے۔ تیرے گھر کے سامنے کھڑی ہے ناوہ جیپ۔''

''پولیس مگر وہ کیوں؟'' میں نے تجسس سے پوچھا حالانکہ میرے لاشعور میں کہیں تھا کہ ایسا ہی ہونے والا ہے وہ جب میرے گلے میں پھندا بننے کی وجہ بنے گی اب وہ پھندا بنتی ہے یا نہیں لیکن اس سے یہ تصدیق ہوجاتی تھی کہ حملہ آوروں کا تعلق کن سے تھا پیرزادہ وقاص' یا سردار شاہ دین؟

''پتا نہیں وہ جیپ کو گھیرے کھڑے ہیں۔ چاچی تو نے تو کہا ہے کہ وہ آئے گا تو اس سے پوچھ لیں۔ وہ آنے والا ہی ہے۔ میں یہاں تیرے انتظار میں کھڑا تھا کہ تجھے بتادوں۔'' اس نے احسان جتانے والے انداز میں کہا تو میں نے اسے جواب نہیں دیا بلکہ آگے بڑھ گیا۔ میں بھی شدت سے یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ جیپ کس کی ہے۔''

گلی میں پولیس والے کھڑے تھے دو پولیس وین ایک جیپ اور جدید ماڈل کی دو کاریں بھی تھیں۔ میں نے بے دھڑک اپنی بائیک ان کے پاس روک دی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ الرٹ ہوگئے تھے۔ میں نے دودھ کا برتن اتارا ہی تھا کہ مجھے لگا جیسے وہ میرے گرد گھیرا تنگ کررہے ہیں۔ تبھی ایک ادھیڑ عمر ایس ایچ او نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ میں نے اس دوران اس کے سینے پر لگے بیج پر اس کا نام افضل رندھاوا پڑھ لیا تھا۔ اس کا لہجہ کرخت تھا۔

''تم جمال ہو اور یہ گھر تمہارا ہے۔''

''ہاں میں ہی جمال ہو اور یہ میرا ہی گھر ہے' خیریت......!''

''ہم تجھے گرفتار کرنے کے لیے آئے ہیں' چلو ہمارے ساتھ......!'' وہ بڑے رعب سے بولا۔

''کیوں؟ مجھے گرفتار کرنا ہے؟'' میں نے تجسس سے پوچھا ابھی لفظ میرے منہ میں ہی تھے کہ پشت سے میری گردن پر زوردار گھونسہ پڑا۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ میں ایک دم سے بھنا گیا۔ لاشعوری طور پر جو دودھ والا برتن میرے ہاتھ میں تھا میں نے گھما کر اندازے سے ایک بندے کے سر پر دے مارا۔ اگلے ہی لمحے گنیں اور رائفلیں میری طرف سیدھی ہوگئیں۔ افضل رندھاوا نے انتہائی سرعت سے اپنا ریوالور نکال لیا۔

''خبردار' حرکت مت کرنا۔ ورنہ گولی ماردوں گا۔''

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ کئی پولیس والے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ دودھ والا برتن میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کتنے لوگ تھے۔ میں مزاحمت میں فقط اتنا بچاؤ کررہا تھا کہ کوئی ضرب نازک جگہ پر لگے۔ پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا میں بے دم سا ہونے لگا۔ مجھے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسے میں مجھے کسی نے کمر سے پکڑ کر زمین سے اٹھایا۔ اگلے ہی لمحے کئی ہاتھ میری طرف بڑھے۔ انہوں نے کسی بوری کی مانند پولیس وین میں مجھے پھینک دیا۔ تب مجھے اپنے سر پر شدید چوٹ کا احساس ہوا۔ پھر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

مادھو مسجد

خان شفیق

مسلمانوں نے جب پہلے پہل بھارت کی سرزمین پر قدم رکھا تو انہیں ہر طرف سے نفرت اور برہمنوں کی مخالفت کا سامنا تھا۔ پھر اس دھرتی پر آنے والے اللہ کے نیک بندوں نے اپنی محبت اور کردار سے وہ مثالیں قائم کیں آج بھی ہندو تمام تر تعصب کے باوجود انہیں جھٹلا نہیں سکتے۔ ہندوئوں کے مقدس شہر بنارس میں ایک ہندو راجپوت کی قائم کردہ مسجد آج بھی اس کا ثبوت ہے۔

تاریخ کے جھروکوں سے دوسری مختصر سی سچی کہانی

جب مادھو راؤ کے گھر میں شکنتلا نے جنم لیا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا' برسوں وہ بھگوان سے پرارتھنا کرتا رہا تھا کہ اس کے گھر کے چمن میں کوئی تو پھول کھلے' لیکن برسوں اس کی یہ آشا آشا ہی رہی۔ کبھی وہ سوچتا کیا میری اس پھلواری میں کوئی پھول نہیں کھلے گا' پھر ایک سمے ایسا آیا کہ جے شری کا من متلانے لگا جو کچھ کھارہی تھی' پچ ہی نہیں رہا تھا۔

''کیا بات ہے جے شری کیا کچھ الٹا سیدھا بھوجن کرلیا۔'' ایک صبح ناشتے پر مادھو راؤ نے اپنی دھرم پتنی سے پوچھا۔

''آپ تو جانتے ہی ہیں' میں بھوجن اس لیے کرتی ہوں کہ میرے پران باقی رہیں اور میرا جیون' آپ کی سیوا کرتے ہوئے آپ کے چرنوں میں بیت جائے' ایک پتنی کے لیے اس کا پتی بھگوان کا ہی ایک روپ ہوتا ہے' یہ آپ کی داسی کھانے کے لیے زندہ نہیں رہنا چاہتی۔''

''یہ تو ٹھیک ہے جے شری پر ایک پتی کو بھی تو اپنے جیون ساتھی کا خیال رکھنا چاہیے' آج وید جی کو لے کر آتا ہوں وہ دیکھ لیں گے' کوئی جڑی بوٹی دے دیں گے من بہتر ہوجائے گا۔'' مادھو راؤ نے کہا اور وہ صبح ہی صبح وید جی کے پاس چلا گیا۔ وید جی آئے پورے وچار پورے دھیان کے ساتھ جے شری کو دیکھا۔

''ٹھاکر مادھو راؤ! خوش ہوجاؤ' تمہاری پھلواری میں پھول کھلنے والا ہے۔ تمہاری برسوں کی آشا پوری ہونے والی ہے' چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' مادھو راؤ کی شادی کو پورے پندرہ سال گزر گئے تھے' اس کی ماں اسی آسرے میں بھگوان کو پیاری ہوگئی کہ وہ بھی اپنے پوتے یا پوتی کو کھلانے پر اس کی یہ اچھا پوری نہ ہوئی' کبھی کبھی جب صبح کے سمے جے شری کرشن بھگوان کی پوجا کرتی تو اس سے رہا نہ جاتا اور نیر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلتے پر وہ تو بے بس تھی سو آشا کے دیپ جلائے' بھگوان کے چرنوں میں پرارتھنا کرتی۔

آخر وہ دن بھی آگیا جب مادھو راؤ کی حویلی میں شہنائیاں بجنے لگیں' شکنتلا نے جنم لیا' ایسی سندر ایسی خوب صورت' جیسے سیتا کی مورت ہو۔ ہندو جاتی کے لیے الگ کھانے پینے اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ دعوت کا انتظام ہوا۔ اورنگ زیب کا دور تھا' شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے'

WWW.PAKSOCIETY.COM

پہاڑی چوہے شیوا نے سر ابھارا تھا اور ہندو مسلمانوں کے دل میلے کرنے چاہے تھے لیکن چند سر پھرے مرہٹوں کے سوا کون اس سے خوش تھا، اورنگ زیب نے اپنے جنرل افضل خان کو اس کے پاس مرہٹوں کی اس شورش کو ختم کرنے کے لیے امن کا پیغام دے کر بھیجا لیکن اس دھوکے باز نے افضل خان سے گلے ملتے ہوئے بچھوا اس کے پیٹ میں اتار دیا، اس کے بعد اورنگ زیب نے اس پہاڑی چوہے کو چین نہ لینے دیا، پہاڑوں میں مارا مارا پھرتا تھا اور اسی عالم میں ایک دن موت نے اسے آ گھیرا، ہندو جاتی نے سکون کا سانس لیا، یہ لوگ اس بات سے واقف تھے کہ مسلمان حکمران انصاف کرنے کے سلسلے میں اپنا پرایا نہیں دیکھتے، جو مجرم ہوتا سزا پاتا۔

پھر ایک دن مادھوراؤ نے اپنی بیٹی شکنتلا کی جنم پتری نکلوانے کے لیے پنڈت دھرم داس کے دروازے پر دستک دی۔

''آیئے ٹھاکر صاحب! ہم تو سوچ میں تھے کہ مادھوراؤ جی اب تک کیوں نہیں آئے۔''

''مہاراج! میں تو خود بھی آپ کے درشن کے لیے بے چین تھا پر کچھ کاموں میں ایسا پھنسا کہ سر اٹھانے کا سمے ہی نہیں ملا، رام گڑھ کے کسانوں نے اب تک روکڑ نہیں بھجوایا تھا، اورنگ زیب مہاراج نے ان زمینوں پر منظوری کی مہر لگا دی تھی جو اکبر مہاراج نے ہمارے پرکھوں کو دی تھیں، بہرحال وہ مسئلہ حل ہو گیا دودھ کا دودھ، پانی کا پانی تو مسلمان ہی کرتے ہیں۔''

''ہاں یہ بات تو ہے پر بھارت کی ہندو اور مسلمان جنتا ایک جنتا نہیں بن سکتی، یہ بات تو راجہ مان سنگھ نے دوٹوک الفاظ میں اکبر مہاراج سے کہہ دی تھی۔'' مادھوراؤ نے کہا۔

''پر راجپوتوں کی آدھی قوم تو مسلمان ہو گئی ہے، یہ بڑے دکھ کی بات ہے۔''

''ہاں پنڈت مہاراج! پر ہم کریں تو کیا کریں، خیر چھوڑیں، اب مہاراج یہ بتائیں شکنتلا کی جنم پتری بنانے کے لیے آپ کب پدھار رہے ہیں۔''

''منگل وار، صبح کے سمے گنگا اشنان سے نمٹ کر ہم آجائیں گے۔''

''مہاراج میں رتھ جوت کر آپ کو لینے آجاؤں گا، برہمن جاتی برہما کی جاتی ہے۔ آپ کی سیوا تو جنم جنم سے ہم ٹھاکر کرتے رہے ہیں۔'' مادھوراؤ نے کہا۔

''پر ان مسلمانوں کو دیکھو دال دلیہ، پھول اور گھاس سب ایک کیے دیوے ہیں۔'' پنڈت دھرم داس نے مسلمانوں پر طنز کی۔

''ہاں مہاراج! یہ بات تو ہے پر اس اصول نے انہیں بڑا مضبوط بنا رکھا ہے، پورے سنسار پر چھائے ہوئے ہیں، ترکوں کی حکومت کو دیکھو پچھم کی عیسائی قومیں کانپ رہی ہیں ان سے، سماچار تو مل جاتے ہیں۔''

''اچھا اب یہ داس چلتا ہے مہاراج آ گیا دیں۔ منگل وار کو پہنچ رہا ہوں۔'' اتنا کہہ کر مادھو راؤ چلا گیا۔

❁ ...... ☆ ...... ❁

پنڈت دھرم داس بڑے گیان دھیان سے شکنتلا کی جنم پتری نکال رہے تھے اور بڑی سوچوں میں گم تھے اور مادھوراؤ سرکنڈے کے مونڈھے پر بیٹھا ہوا انتظار میں تھا کہ دیکھیں کیا

کچھ سامنے آتا ہے پھر پنڈت دھرم داس نے اپنا سر اٹھایا۔

''مادھوراؤ! سب کچھ ٹھیک ہے، شکنتلا جوان ہو گی تو اپنی سندرتا میں کنول کا پھول ہو گی، اپنے وچاروں میں یکتا اور بے مثال، دھرم کی سچی داسی پر اس کے جیون پر ایک سیاہ سایہ منڈلاتا نظر آتا ہے، جیسے بن باس میں ستیا دیوی پر راون کا سایہ بڑھا تھا یہ دھرم سے باہر کسی منش کو بھا جائے گی اور وہ اس کے چاندی جیسے شریر کو دیکھ کر اس کا متوالا ہو جائے گا، پر ایک برج یہ بتا رہا ہے کہ اگر اس کا ستارہ اس میں آجاتا ہے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور ایسا بھی لگتا ہے کہ یہ اپنے وچاروں کی شکتی سے اس بے دھرم منش کو ڈھا دے گی۔'' اتنا کہہ کر پنڈت دھرم داس چپ ہو گئے۔

''پر مہاراج ہم اس کی کاٹ کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔'' مادھوراؤ نے کہا۔

''دان دو، چوبے کھلاؤ، ہنومان جی کی پوجا کرو اور شکنتلا بجرنگ بلی کی پوجا کرنے میں ناغہ نہ کرے۔'' پنڈت نے کہا اور پھر وہ کھا پی کر اور کچھ روکڑ لے کر چلے گئے۔

❁ ...... ☆ ...... ❁

وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ شکنتلا کلی سے پھول بن گئی، اس کا حسن اس کی سندرتا، گلاب کے پھولوں کو شرماتی تھی، اس کے ہونٹ گلاب کی بند کلی تھے، اس کے دراز گیسو سیاہ گھٹا کی مانند تھے، اس کا قد سرو کا درخت تھا، اس کی چال میں ستار کی دھنیں لرزتی تھیں اور اس کا چہرہ پورے چاند کی رعنائی کی یاد دلاتا تھا، جس سے دھیمی دھیمی سنہری کرنیں پھوٹتی رہتی تھیں، وہ مسکراتی تو جیسے چاندنی کے سفید پھولوں میں بہار آجاتی۔

''بھگوان! میری شکنتلا کو بری نظر سے بچائے رکھے، اکثر جے شری اپنے چھوٹے سے مندر میں اس کے لیے پرارتھنا کرتی رہتی، مادھوراؤ بیٹی کو دیکھ کر پھولے نہ سماتا لیکن کبھی کبھی سوچوں میں بھی گم ہو جاتا۔

''چندرما، سندرتا کا دیوتا ہے پر اس میں بھی کالا دھبہ ہے، پر یہ بھی کبھی کبھی گہنا جاتا ہے، ہر خوشی کے ساتھ غم ہے، ہر مسکراہٹ کے ساتھ آنسو ہیں اور جب یہ کالے اور سفید رنگ ساتھ ساتھ ہوتے ہیں تو نظروں کو کیسے بھاتے ہیں۔'' ایک شام وہ گنگا کے کنارے بیٹھا ہوا تھا اور ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ دور فاصلے سے کسی کوئل کی پرسوز آواز ہوا کے دوش پر سوار اس کے کانوں سے ٹکرانے لگی۔

ان چودہ سالوں میں جوبن اس طرح بڑھتا جائے ہے
جیسے کہ چندرما دوجے کا بڑھتا جائے بڑھتا جائے ہے

شاعر یہ داستان گو یہ ہمارے سنسار کے بے کار لوگ تو نہیں ہیں، یہ تو ہمیں بہت کچھ دیتے ہیں، ان کے قلم سے نکلی ہوئی اداس کہانیاں، ہمیں زندگی کی حقیقتوں سے واقف کراتی ہیں، ہمارے وجود میں ایک ٹھہراؤ پیدا کر دیتی ہیں، ہم جان جاتے ہیں، زندگی صرف خوشیوں کا نام نہیں، زندگی غم بھی ہے، بہاروں کے ساتھ ساتھ خزاں بھی ہیں اور ہمیں یہ سوچ کر اپنے اندر ایک ٹھہراؤ پیدا کر لینا چاہیے۔'' مادھوراؤ اپنے آپ کو آنے والے کسی برے وقت کے لیے تیار کر رہا تھا پھر وہ گھر واپس لوٹ گیا۔

''کہاں چلے گئے تھے۔'' جے شری نے اسے

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیکھ کر کہا۔
"بس ذرا گنگا کنارے نکل گیا تھا۔ دو کوس لمبے گھاٹ' جگہ جگہ سنگ مرمر کے اشنان کے ٹھکانے۔"
"جیسے جیسے عمر بڑھتی جارہی ہے بڑی سوچوں میں گم رہنے لگے ہو۔"
"ہاں جے شری گنگا ماتا جب پہاڑوں سے نکلتی ہوگی تو کیسی اچھلتی کودتی نکلتی ہوگی اور اب بنارس کے ہموار میدان میں کیسے ٹھہراؤ کے ساتھ بہہ رہی ہے۔"
"گیانی ہوتے جارہے ہو۔" جے شری نے کہا۔
"جے شری! شکنتلا جوان ہوگئی ہے کبھی کبھی مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔"
"چنتا نہ کریں پتی دیو! ہم نے کسی کے ساتھ برا نہیں کیا ہمارے ساتھ بھی برا نہیں ہوگا۔"
"رام نے بھی برا نہیں کیا تھا پھر راون سیتا میا کو کیوں لے گیا؟"
"اور پھر راون کے ساتھ کیا ہوا' کیا اس بات کو بھول گئے؟" جے شری ہر صبح والمیک رشی کی رامائین پڑھتی تھی اور بڑے امن میں رہتی تھی۔ سچائیاں' صداقتیں تو ہر مذہب کی مقدس کتابوں میں موجود ہیں' یہ اور بات ہے کہ لوگوں نے اپنی غرض کے لیے ان سچائیوں کو دھندلا دیا۔

❁......☆......❁
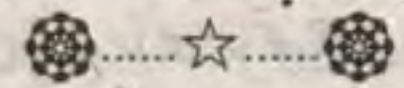
صبح بنارس اور شام اودھ مشہور ہے' آخر اس کی وجہ کیا ہے اس کی وجہ دو تہذیبوں کے نکھار کا اظہار ہے اور اس میں نسوانی حسن کی کارفرمائیاں شامل ہیں' اورنگ زیب کے عہد میں گنگا کے دونوں کناروں پر سنگ مرمر کے اشنان کے ٹھکانے بنے ہوئے تھے اور وہ آج بھی موجود ہوں گے' صبح صبح ہندو جاتی یہاں اشنان کے لیے آتی ہے' کہا جاتا ہے کچھ ٹھکانے ہندو ناریوں کے لیے مخصوص تھے اور وہ ذرا فاصلے پر واقع تھے۔ اورنگ زیب کے وقت میں اس جانب نہ تو کوئی ہندو مرد نہا سکتا تھا اور نہ ہی کوئی ناؤ یا کشتی میں بیٹھ کر تقریباً گیارہ بجے تک وہاں سے گزر سکتا تھا۔ وقت ختم ہونے کا باقاعدہ گجر بجایا جاتا تھا پھر وہاں سے گزر جانے کی اجازت تھی۔ انہیں دنوں سہسرام کے سوری خاندان کا ایک تیس پینتیس سالہ شخص ابراہیم بنارس کا کوتوال (قاضی کہا جاتا تھا اور بڑے اختیارات ہوتے تھے) ہو کر آیا اور چند ہی دنوں میں اس نے ایک شاندار حویلی وہاں تعمیر کرالی اور داد عیش دینے لگا۔ تھا بھی کچھ منچلے مزاج کا مالک' راتوں میں اکثر محفلیں سجاتا اور خوب رام رنگی کا دور چلتا' اگرچہ اورنگ زیب کے وقت میں' محفل سماع پر بھی پابندی تھی اور مے خواری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن ہر دور اور ہر زمانے میں صاحب اقتدار لوگ من مانی کرتے رہے ہیں' زیادہ یا کم۔ ابراہیم خان نے ایک خوب صورت کشتی بھی بنوائی تھی اور ایک کشتی بان کو بھی ملازم رکھا تھا' اکثر صبح کے وقت کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کو نکل جاتا اور ہندو لوگوں کو ہاتھوں میں پیتل کی لٹیا میں گنگا کا پانی بھر بھر کر نہاتے ہوئے دیکھتا۔
"ہے رام رام رام......" وہ سفید دھوتیاں اور گلے میں جینو ڈالے ہوئے نہاتے رہتے ابراہیم خان جہاں تک مردوں کے ٹھکانے تھے وہاں تک جاتا اور پھر کشتی بان کشتی موڑ کر واپس ہو جاتا کیونکہ آگے جانے کی گیارہ بجے تک سرکاری طور

پر پابندی تھی' ایک صبح ابراہیم خان جانے کس خمار میں تھا کہ جس وقت جیون کشتی موڑنے لگا تو اس نے کہا۔
"جیون آج تو کچھ آگے کی بھی سیر کرنے دو۔"
"سرکار! ناریوں کے ٹھکانے آگئے ہیں۔"
"چپو چلاؤ جیون! ہم شہر کے کوتوال ہیں' تمہیں حکم دے رہے ہیں۔" ابراہیم خان نے بے پروائی سے کہا' جیون سوچ میں پڑ گیا لیکن مجبور تھا اس نے کشتی عورتوں کے ٹھکانوں کی طرف بڑھادی' ابھی یہ لوگ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ابراہیم خان کی نظر ایک ہندو دوشیزہ پر پڑی اور وہ اسے دیکھتا رہ گیا' نفس کا ابلیس اس کے وجود میں کلبلانے لگا۔
"یہ کون ہے جیون!" اس نے پوچھا۔
"کوتوال جی! پتا نہیں کون ہے؟" اس دوران ہندو دوشیزہ کی نظر اچانک کشتی پر پڑی' لٹیا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی' ابٹن بدن پر لگا رہ گیا اور وہ تیزی سے اپنی سفید ساڑھی لپیٹ کر ایک جانب دوڑ گئی اور ابراہیم خان کی بدنگاہیں اس کا پیچھا کرتی رہ گئیں۔
"بتا جیون یہ کون ہے؟ تجھے معلوم ہوگا تو چھپا رہا ہے' تیری کھال ادھیڑ دوں گا اور اگر ٹھیک ٹھیک بتادیا تو انعام پائے گا۔"
"ایسا جانت پڑے ہے کہ یہ ٹھاکر مادھوراؤ کی پتری شکنتلا ہے۔ پر مہاراج کسی کو پتا نہ چلے' ہم نچلی جاتی کے لوگ ہمیں ویسے بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔"
"یہ لے اپنا انعام اور یہ ہمارا وعدہ ہے کہ کانوں کان کسی کو پتا نہیں چلے گا۔" ابراہیم خان نے دو اشرفیاں اس کی مٹھی میں دبادیں۔

❁......☆......❁
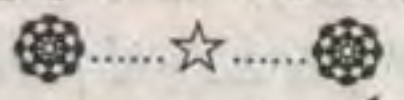
مادھوراؤ ابھی اپنی زمینوں سے واپس ہی آیا تھا کہ جے شری نے کھانا کھلانے کے بعد کہا۔
"آج صبح سے ابراہیم کوتوال کا آدمی دوبار آچکا ہے۔"
"ابراہیم کوتوال کا آدمی کیوں؟"
"یہ تو پتا نہیں پر ہے کوئی بات ضرور' میں نے کہہ دیا کہ آپ زمینوں پر گئے ہوئے ہیں۔"
"پھر۔"
"کہنے لگا آج اگر آجائیں تو کل صبح ضرور ضرور مل لیں' کیا بات ہے جی!" جے شری نے کہا۔
"جے شری! مجھے خود معلوم نہیں پر ہے کوئی خاص بات' ٹھیک ہے کل صبح مل لوں گا۔"
"مجھے کچھ خوف سا محسوس ہورہا ہے۔" جے شری نے فکرمند لہجے میں کہا۔
"ارے نہیں جے شری! چنتا کرنے کی ضرورت نہیں' ایسا لگتا ہے جیسے وہ مجھے کسی سرکاری کام سے بلانا چاہتا ہے کیونکہ ان لوگوں کی نظروں میں ہم راجپوتوں کی بڑی قدر ہے۔ اورنگ زیب مہاراج کی فوجوں میں راجپوت بڑی جگہوں پر ہیں اور پھر ہماری آدھی جاتی تو مسلمان ہوچکی ہے۔" مادھوراؤ نے اپنی پتنی کی فکر دور کرنا چاہی لیکن اسے بھی فکر لاحق ہوگئی تھی۔
دوسرے دن تقریباً دس بجے کے قریب کوتوال کا آدمی اسے بلانے آگیا اور وہ اس کے ساتھ روانہ ہوگیا۔
"آیئے مادھوراؤ جی! کل سے اپنا ملازم بھیج رہا ہوں لیکن شری مادھوراؤ جی تو اپنی زمینوں پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

گئے ہوئے تھے' بڑے سروں کے بڑے سودے۔" ابراہیم خان نے بڑی خندہ پیشانی سے مادھوراؤ کا استقبال کیا۔

"یہ شخص مجھے اونچی جگہ لے جا کر زمین پر گرا دینا چاہتا ہے۔" مادھو راؤ نے سوچا اور اسی دوران ایک ملازم نے پھلوں کا نقرئی طشت لا کر میز پر رکھ دیا۔

"مادھوراؤ جی بنارس کا لنگڑا آم بس یہ سمجھ لیں آپ ہی کے لیے منگوایا ہے۔" ابراہیم نے شوخ نگاہوں سے مادھوراؤ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بات کچھ گہری معلوم ہوتی ہے۔" مادھوراؤ سوچنے لگا۔

"اور بتائیں زمینوں کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہی ہے کوتوال جی! تھوڑا بہت مل ہی جاتا ہے۔"

"آپ کا بنارس میں کوئی مسئلہ تو نہیں' اگر کوئی ہو تو بتائیں۔"

"کیا مسئلہ ہوگا جی! نہ کسی کے ساتھ انیائے کیا نہ کوئی چھتا ہے۔"

"یہ کچھ پھلوں میں سے تو لیں اور یہ خشک میوہ۔"

"کھا پی کر ہی چلا ہوں آپ نے کچھ زیادہ ہی منگوالیا۔" مادھوراؤ نے نمک لگے چند پستے منہ میں ڈال لیے۔

"ان میں کوئی چیز ہاتھوں کی بنی ہوئی نہیں ہے۔"

"وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔" مادھوراؤ نے کہا۔

"دوسرے کے دھرم اور کیش کا لحاظ ہونا چاہیے۔" ابراہیم کوتوال نے کہا۔

"ہاں دھرم کا......" مادھوراؤ نے کہا۔

"بات یہ ہے مادھوراؤ جی......!" اتنا کہتے کہتے ابراہیم خان چپ ہوگیا۔

"ہاں...... ہاں! بتائیں کوتوال جی رُک کیوں گئے۔" مادھوراؤ کے سینے میں بے چینی کا ایک لاوا ابل رہا تھا۔

"بات یہ ہے مادھوراؤ جی! ہم چاہتے ہیں آپ اپنی شکنتلا کا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں دے دیں۔" ابراہیم خان کی زبان سے ابھی یہ الفاظ ادا ہی ہوئے تھے کہ مادھوراؤ کو محسوس ہوا جیسے اس کے سر پر چھت میں لٹکا ہوا جھاڑ آ گرا ہو' اسے یوں لگا جیسے زمین ابھر کر اوپر آ رہی ہو اور آسمان نیچے کی جانب گھومتا ہوا آ رہا ہو' وہ بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔

"آپ نے کوئی جواب نہیں دیا مادھوراؤ جی!" مادھوراؤ کو ابراہیم کا چہرہ ایک راکھشس کا چہرہ لگا۔

"آپ نے کوئی جواب نہیں دیا مادھوراؤ جی!" ابراہیم نے اپنا جملہ دہرایا۔

"آپ نے ابھی کہا تھا دوسرے کے دھرم اور کیش کا لحاظ ہونا چاہیے پر آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔" مادھوراؤ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"لیکن مادھوراؤ جی ایسا ہوتا رہا ہے کیا اکبر بادشاہ اور جودھابائی کا سنجوگ نہیں ہوا۔"

"وہ ایک سیاسی وواہ تھا' اس میں راجہ مان سنگھ کی مرضی شامل تھی۔"

"اور روپ متی اور باز بہادر کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"کوتوال جی وچار لوگوں کی کثرت پر کیا جاتا ہے یہ تو چند ایک مثالیں ہیں۔"

"تو ایک مثال اور قائم ہونے دیں۔"

"یہ تو جی من کا سودا ہوتا ہے اگر میری کنیا آپ کو نہ چاہے تو زور زبردستی تو کسی بھی دھرم میں مناسب نہیں۔"

"دیکھ لیں مادھوراؤ جی! ہماری کچھ ایسی عادت ہے جو کرنا ہوتا ہے کر ڈالتے ہیں۔" ابراہیم نے گہری نگاہوں سے مادھوراؤ کو دیکھا۔

"کوتوال مجھے دھمکی دے رہا ہے' مجھے بات کو بنائے رکھنا ہے' کچھ سوچنا ہوگا۔" مادھوراؤ نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ وہ ہی بھیانک سایہ ہے جس کے بارے میں پنڈت دھرم داس نے بتایا تھا۔ مادھوراؤ کا ذہن ماضی میں چلا گیا۔

"کیا کوتوال جی آپ اتنی مہلت نہیں دیں گے کہ میں اپنی پتنی کو راضی کرلوں۔"

"ہاں' ہاں! مادھوراؤ جی بصد شوق' ایسی جلدی بھی نہیں ہے لیکن کوئی فریب' کوئی دھوکا نہیں ہونا چاہیے پھر دیکھیں ہم اگر ایسی مثالیں قائم نہیں کریں گے تو ہندو اور مسلمان کیسے ایک قوم بنیں گے۔"

"دھوکا' فریب' مکاری یہ راجپوتوں کی عادت نہیں ہے۔ مجھے دو دن کی مہلت دیں' شکروار کو میں آپ کو جواب دوں گا۔"

"ٹھیک ہے' میں انتظار کروں گا۔" ابراہیم خان نے کہا اور پھر مادھوراؤ چلا گیا۔

✿......☆......✿

وہ بجھا بجھا' خیالوں میں ڈوبا اپنے گھر آیا' دروازے پر اوم لکھا ہوا تھا۔

"اوم! ہماری سہایتا کر' ہم بڑے بھنور میں ہیں۔" وہ ایک دو لمحات کے لیے دروازے پر ٹھہر گیا اور پھر اندر داخل ہوا جے شری بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی' جوں جوں دیر ہو رہی تھی اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی' انتظار موت سے بھی زیادہ شدید ہوتا ہے اور جیسے ہی مادھوراؤ اندر داخل ہوا وہ اس کی جانب لپکی پھر اس کا اداس چہرہ دیکھ کر ٹھہر گئی۔

"سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو ہے۔" اس نے بے چینی سے سوال کیا۔

"جس سائے کی بات پنڈت دھرم داس نے کی تھی وہ سامنے آ گیا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں' کھل کے بتائیں۔" جے شری نے بے چینی سے پوچھا۔

"ابراہیم کوتوال نے شکنتلا کا ہاتھ مانگا ہے۔" مادھوراؤ نے فکرمند لہجے میں کہا۔

"کیا...... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"جو کچھ کہہ رہا ہوں' سچ ہی کہہ رہا ہوں۔ بولو اب کیا کریں۔"

"میں اپنی کنیا کو اپنے ہاتھوں ستی کردوں گی پر ایسا نہ ہونے دوں گی۔"

"شانتی جے شری شانتی! کچھ سوچتے ہیں انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے کچھ وچار کرتے ہیں۔"

"آپ نے دوٹوک انداز میں کہہ کیوں نہیں دیا' یہ نہیں ہوسکتا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"انت پر وچار کرنے سے پہلے ایسی بات نہیں کہی جاتی' چانکیہ نے کہا تھا کسی بڑے پیڑ کو جڑ سے اکھیڑنا ہو تو اس کی جڑھ میں چونا ڈالو وہ خود ہی گر جائے گا' پر تھوڑا رکنا پڑے گا۔"

"کیا ہے آپ کے من میں؟"

"ایسی ہی کوئی ترکیب جو ابھی تمہیں بتائی ہے پر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا' اس نے شکنتلا کو دیکھ کہاں لیا؟" مادھوراؤ نے پوچھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”میں بتاتی ہوں‘ شکنتلا کو اشنان کرتے ہوئے ناریوں کے ٹھکانے پر اس نے دیکھ لیا تھا۔“

”پر ناریوں کے گھاٹ کی جانب تو گیارہ کے سمے تک کوئی ناؤ نہیں جاتی۔“ مادھوراؤ نے کہا۔

”چلا گیا ہوگا رام رنگی کے نشے میں‘ پر شکنتلا کو یہ نہیں معلوم کہ وہ کوتوال ابراہیم خان تھا۔“ جے شری نے کہا۔ ماتا پتا کی ان باتوں کو شکنتلا نے بھی سن لیا اور وہ سوچ میں ڈوب گئی‘ رات بھر اپنے کمرے میں سوچتی رہی کہ کیا کیا جائے اور صبح ہونے تک آخر اس نے اس مسئلے کا حل نکال ہی لیا۔ وہ صبح ہی صبح اپنے پتا کے کمرے میں پہنچ گئی‘ مادھوراؤ اس کو دیکھ کر چونکا‘ اس لیے کہ اس طرح صبح کے وقت کبھی اس کے کمرے میں نہیں آئی تھی بلکہ اشنان کرکے پوجا سے فارغ ہوکر رسوئی کا رخ کرتی تھی۔

”صبح صبح‘ شکنتلا کیسے آنا ہوا؟“

”پتا جی! میں آپ سے کچھ بات کرنے آئی ہوں؟“

”ہاں کہو۔“ مادھوراؤ نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

”پتا جی! مجھے ساری کتھا پتا لگ گئی ہے‘ آپ کے پاس دو دن کا سمے ہے اور تیسرے دن آپ کو جواب دینا ہے۔“

”کیا...... کیا کہہ رہی ہو شکنتلا! کیا تم ابراہیم خان سے پریم کرتی ہو؟“ مادھوراؤ سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

”پتا جی! میں پدمنی کی طرح ستی تو ہو جاؤں گی پر ابراہیم خان کو اپنا شریر چھونے نہیں دوں گی۔“ شکنتلا نے کہا۔

”کیا سوچا ہے تم نے؟“

”میرے لیے مسلمانوں جیسا مردوں کا لباس لادیں‘ ایک گھوڑے کا بندوبست کردیں۔“

”کیا کہہ رہی ہو شکنتلا!“ پھر اسے پنڈت دھرم داس کے الفاظ یاد آئے ”ایسا لگتا ہے کہ یہ اپنے وچار کی شکتی سے اس بے دھرم منش کو ڈھا دے گی۔“

”آخر تم نے سوچا کیا ہے؟“

”مسلمان جو کچھ بھی ہیں پر انصاف کے ترازو کا ایمان نہیں ہونے دیتے۔“

”تم کہاں جاؤ گی؟“

”دہلی‘ بھارت کے مہاراج اورنگ زیب کے پاس۔“

”مہاراج اورنگ زیب کے پاس‘ وہ تمہیں کہاں ملیں گے؟“

”پتا جی! صبح کی نماز وہ بڑی مسجد دہلی میں پڑھتے ہیں‘ مسجد کی سیڑھیوں پر فریادی کھڑے ہوتے ہیں‘ ہر ایک کے ہاتھ میں کاغذ کے ٹکڑے پر اس کی فریاد لکھی ہوتی ہے اور ہر ایک کو انصاف ملتا ہے۔“

”تمہیں یہ بات کس نے بتائی؟“

”شنکرراؤ کی پتنی نے‘ شنکرراؤ کی زمین پر کسی نے قبضہ کرلیا تھا‘ اس نے درخواست دی اور اس کو انصاف مل گیا۔ میں بھی دہلی جانا چاہتی ہوں۔“

”تمہیں اس بات کا وشواس ہے کہ مسلمان کوتوال کے خلاف وہ تمہاری بات سنے گا۔“ مادھوراؤ نے کہا۔

”پورا پورا۔“ شکنتلا نے جواب دیا۔

”اور اگر ایسا نہ ہوا؟“

”پتا جی! میں نے اس کے لیے بھی سوچ لیا ہے۔“

”کیا سوچ لیا ہے؟“

”جو بھی سوچا ہے اس پر وشواس رکھیں‘ نہ آپ کا بال بیکا ہوگا اور نہ ہی آپ کی شکنتلا کو کچھ ہوگا۔ ہاں ایک داستان تاریخ کا حصہ بن جائے گی۔“ شکنتلا نے ایک عزم ایک ارادے سے کہا اور مادھوراؤ اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھنے لگا۔

✿......☆......✿
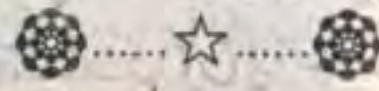
ایک سوار بنارس سے دہلی جانے والی سڑک پر دوڑا چلا جارہا تھا۔ بنارس سے دہلی کا فاصلہ کوئی معمولی نہیں تھا لیکن عزم اور ارادوں کے سامنے تمام فاصلے طے ہوجاتے ہیں پھر شاہراہ اعظم پر مسافروں کے ٹھہرنے کے معقول انتظامات تھے‘ منزل بہ منزل یہ سوار دہلی کی جانب بڑھتا رہا‘ سفر کٹھن تو ضرور تھا لیکن حکومت کے محافظ دستے بھی جگہ جگہ گردش کرتے نظر آتے تھے‘ آخر وہ وقت بھی آگیا جب دہلی کی مسجدوں کے مینار نظر آنے لگے اور مندروں کی مخروطی عمارتوں کی چوٹیاں بھی دکھائی دینے لگیں۔ لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان ایک کشادہ میدان تھا جہاں ایک وسیع و عریض سرائے واقع تھی‘ گھوڑوں کے اصطبل بھی تھے اور ان کا چارا خریدنے اور ڈالنے کا بندوبست بھی تھا‘ اجنبی سوار یہ فیصلہ کرکے سویا کہ وہ اذان کے وقت اٹھ جائے گا لیکن یہاں تو مسلمانوں کو نماز سے پہلے اٹھانے کا بھی بندوبست تھا‘ کشادہ غسل خانے بھی دور تک بنے ہوئے تھے ایک کونے کے غسل خانے میں سوار نے اپنی حالت کو سنبھالا اور ایک تھیلے سے کچھ نکال کر کھایا پھر وہ تیار ہوکر جامع مسجد کی جانب روانہ ہوگیا‘ نماز ختم ہوئی مسافر نے مسجد کے سامنے کے میدان میں ایک درخت کے ساتھ گھوڑے کو باندھ دیا اور سیڑھیوں پر جاکر کھڑا ہوگیا‘ نماز ختم ہونے کے بعد بادشاہ سلامت مسجد کے وسیع و عریض صحن سے گزر کر سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگے۔ ہر ایک سے اس کی درخواست لیتے گئے پھر اس اجنبی نوجوان کے پاس آکر ٹھہر گئے۔ اس کا جائزہ لیا اور اپنی عباہ سے دستمالی نکال کر دونوں ہاتھوں میں پھیلا دیا۔ ”یہ درخواست! اس دستمالی میں ڈال دو‘ تم مرد نہیں ایک خاتون ہو۔“ شکنتلا جس نے مردانہ بھیس بدل رکھا تھا حیرت سے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ ”ہاں تم ایک خاتون ہو۔“ اورنگ زیب نے کہا اور پھر عرض داشت کو انہماک سے پڑھنے کے بعد ایک گہرا سانس لیا۔

”یہیں سیڑھیوں کے قریب کھڑی رہنا‘ میرا خادم آئے گا اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر اس کے پیچھے چلی آنا‘ ہم لال قلعے کی موتی مسجد میں تمہارے منتظر ہوں گے۔“ اورنگ زیب نے باقی درخواستیں اپنے ایک خادم کے حوالے کیں اور کہا۔

”یہ درخواست فوری اقدام کا تقاضا کررہی ہے ہم اس کو اپنے ساتھ لے کر جارہے ہیں۔“ اورنگ زیب اتنا کہہ کر رخصت ہوگئے اور شکنتلا خادم کے انتظار میں کھڑی ہوگئی۔ کچھ ہی دیر بعد اورنگ زیب کا خادم آیا اور اسے لے کر چلا گیا۔

......☆☆☆......
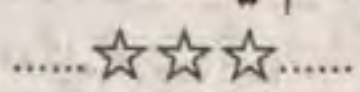
”نقاب پہنے رہنا دوشیزہ! نامحرم کا چہرہ دیکھنا مناسب نہیں۔“

”آپ نے مہاراج! میری درخواست پڑھ لی۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

”ہاں پورے انہماک سے‘ یہ بتاؤ تم پر دباؤ ڈالا جارہا ہے۔“

”میرے پتا کو ایک طرح سے دھمکی بھی دی گئی ہے۔“

”تم اس شادی پر رضامند تو نہیں۔“

”یہاں کیوں آتی اگر رضامند ہوتی۔“

”بات صاف ہوگئی ہم یہ ہی معلوم کرنا چاہتے تھے کیونکہ اکثر والدین تیار نہیں ہوتے لیکن لڑکی چاہتی ہے۔“ اس کے بعد شکنتلا نے تمام واقعہ بیان کردیا۔

”ایک مہینے کی مہلت اور دن اور تاریخ شادی کے لیے دے دی۔“

”جی مہاراج! صرف اس لیے کہ ہم پر سختی شروع ہوجاتی۔“

”ٹھیک ہے ایک آدھ دن ہماری مہمان رہ کر رخصت ہوجاؤ‘ ہم کچھ کرتے ہیں۔“ اورنگ زیب نے کہا اور شکنتلا کو مہمان خانے بھجوادیا۔

”یہ مہمان خانہ ہندو رعایا کے لیے ہے سب کچھ ہندو کائستوں کے ہاتھوں ملے گا“ اورنگ زیب نے اسے جاتے جاتے کہا۔ شکنتلا مہمان خانے چلی گئی اور اورنگ زیب بھی مسجد سے رخصت ہوگئے۔

❁......☆......❁

شکنتلا طویل سفر کے بعد بنارس پہنچی اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر بادشاہ کی جانب سے قدم نہ اٹھایا گیا تو وہ حجلہ عروسی میں ابراہیم خان کو شراب پلا کر قتل کردے گی اور یہ بانگ دہل باہر نکل کر اس واقعہ کو والم نشرح کردے گی اور مغل بادشاہ اس کے حق میں فیصلہ دینے پر آمادہ ہوجائے گا اور صرف مغل حکومت کو بدنامی سے بچانے کے لیے اور وہ راجپوتوں کی آنکھ کا تارا بن جائے گی۔ آخر شادی کا دن آ گیا‘ مادھوراؤ اور جے شری سکتے میں آئے ہوئے تھے‘ ہندو جاتی کے ماتھے پر بھی شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور ابراہیم خان بڑی دھوم دھام سے بارات لے کر آ گیا تھا‘ مسلمان خاموش تھے اور سوچ رہے تھے کہ فساد کی آگ نہ بھڑک اٹھے اور ہندو جاتی خاص طور پر ہندو راجپوت بھی تو آدھی آدھی تلواریں میان سے نکالتے اور پھر کچھ سوچ کر اندر کرلیتے لیکن ابراہیم خان شکنتلا کے تصور میں کھویا ہوا تھا۔ شادیانے بج رہے تھے اور ابراہیم خان کے ملازم آتش بازی میں مصروف تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ ڈولی اٹھی اور مادھوراؤ اور جے شری کا دل ڈوب کر رہ گیا تھا‘ ابراہیم خان نے ڈولی پر نچھاور کرنے کے لیے چاندی کے سکے لٹانے شروع کردیئے۔

”کچھ سکے مجھے بھی دے۔“ ایک فقیر آگے بڑھا۔

”اٹھالے زمین سے۔“ ابراہیم خان نے کہا۔

”نہیں‘ اپنی جیب سے نکال کردے۔“ فقیر نے کہا اور جیسے ہی گردن موڑ کر ابراہیم خان نے جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا ایک زوردار تمانچہ اس کے چہرے پر پڑا‘ ابراہیم نے طیش میں آ کر منہ پھیرا اور پھر کانپ کر رہ گیا۔

”تو سمجھتا ہے مغل حکمراں اتنے غافل ہیں کہ اس کے اہلکار جو چاہیں من مانی کرتے رہیں۔“ ابراہیم خان کے سامنے فقیر نہیں اورنگ زیب کھڑا تھا۔

”اب بھگت اپنی سزا۔“ ہندوستان کا شہنشاہ غیظ و غضب میں آیا ہوا تھا‘ اب جہاں شادیانے بج رہے تھے‘ وہاں گہری خاموشی تھی۔ اب جہاں راجپوتوں کی تلواریں آدھی آدھی میان سے باہر آرہی تھیں اب وہ ہی پہلوؤں میں لٹکی ہوئی تھیں اور ہاتھ پرسکون انداز میں لٹکے ہوئے تھے اور گردنیں جھکی ہوئی تھیں‘ مسلمان اطمینان کا سانس لے رہے تھے‘ مادھوراؤ اور جے شری جو بے بسی کی تصویر بنے ہوئے تھے اور جن کی آنکھوں کے آنسو خشک ہوگئے تھے اور جو ملامتوں کا شکار تھے اور جو طنز کے تیروں کو سہہ رہے تھے‘ حیران اور پریشان تھے یہ ایک آن میں کیا ہوگیا تھا۔

”ڈال دو اس نابکار کے پیروں میں زنجیریں اور ان زنجیروں کو ہاتھیوں کے پیروں میں پھنسا کر انہیں مختلف سمتوں میں دوڑا دو۔“ اورنگ زیب نے حکم دیا۔ اورنگ زیب جس نے دین کی خاطر اپنے بھائیوں کو ہاتھیوں سے پائمال کرادیا تھا وہ ابراہیم خان کو کیا چھوڑتا‘ مادھوراؤ اور جے شری اس کے قدموں میں گر گئے۔

”اٹھیں! انسان انسان کے پیروں میں نہیں گرتا‘ یہ انسانیت کی توہین ہے۔“ اورنگ زیب نے کہا۔

”یہاں جس جگہ انصاف کا تقاضا پورا ہوا ہے ایک مسجد تعمیر کی جائے۔“ بادشاہ نے حکم دیا۔

”مہاراج‘ مہاراج!“ مادھوراؤ ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا۔

”کہو‘ کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”مہاراج! اپنی ایک کامنا ہے‘ اس مسجد کے منارے مادھوراؤ اپنے پیسے سے بنوائے گا۔“

”ہمیں منظور ہے اور یہ اتحاد کی علامت ہوگی اور ہم اس مسجد کا نام مادھوراؤ کی مسجد تجویز کرتے ہیں تاکہ یہ احساس ہمیشہ زندہ رہے کہ مسلمان حکمرانوں نے اپنی ہندو اور مسلمان رعایا کے ساتھ برابری کا سلوک کیا ہے۔“ بنارس کی جنتا اس کو احترام کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”ہوشیار!“ مغل افسر کی آواز بلند ہوئی اور فوجی دستے ترتیب میں آگئے اس دوران شکنتلا ڈولی سے باہر آ گئی۔

”شکنتلا کیا تم نے یہ سمجھا تھا کہ اورنگ زیب اپنے اہلکار کی خاطر اس واقعہ کو التواء میں ڈال دے گا‘ کوئی قدم نہیں اٹھائے گا‘ جب سے تم ہم سے رخصت ہوکر گئی ہو ایک لمحہ کے لیے بھی ہمارا قرار کا نہیں گزرا اور پھر دستوں پر نظر ڈالی ”روانگی ہو“ ایک مغل افسر نے حکم دیا اور مغل شہسوار حرکت میں آگئے‘ مغل پرچم لہراتا ہوا آگے بڑھا اور پھر لوگوں کی نگاہیں اس جانب اٹھ گئیں۔

سورج نصف النہار سے گزر چکا تھا دور فاصلے پر دھول اٹھ رہی تھی‘ مغل دستے آنکھوں سے اوجھل ہوچکے تھے۔

”ہم ان مسلمان حکمرانوں کو کیوں برا جانتے ہیں‘ جو انصاف کا دامن ہاتھوں سے جانے نہیں دیتے۔“ شکنتلا کچھ ایسا ہی سوچ رہی تھی۔

داستان گو یہ کہہ کر ٹھہر گیا۔

میں نے خود بنارس جا کر مادھوراؤ کی اس مسجد کو دیکھا ہے اس کے ایک مینار کو مخدوش ہونے کی بنا پر گرادیا گیا ہے‘ میں ایک مینار پر چڑھا ہوں‘ اس کی اسی سیڑھیاں تھیں لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ لوگ اب اس مسجد کو مادھوراؤ کی مسجد کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔

✦

WWW.PAKSOCIETY.COM

خانقاہ درویش

محترم ایڈیٹر نئے افق'
السّلام علیکم!
اللہ تعالیٰ آپ کو معہ اسٹاف کے سلامت رکھے۔ آپ جس طرح نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اسی نے مجھے مہمیز دی کہ میں بھی کچھ نہ کچھ تحریر کر کے آپ کو ارسال کروں۔ آج کا دور انٹرنیٹ اور موبائل فون پر محبت کا دور ہے۔ مغربی اور انڈین کلچر نے محبت اور عشق کے معنی ہی تبدیل کردیے ہیں۔ یہ کہانی بھی بھارت (سابقہ ہندوستان) کے ایک دور افتادہ قصبے میں پھوٹنے والی عشق کی پاکیزہ کلیوں کی ہے ہوسکتا ہے یہ ہماری آج کی نسل کے ذہنوں پر پوری نہ اترے۔ جو سیکس اور دو جسموں کے ملاپ کو ہی عشق کی انتہا سمجھتی ہے۔ لیکن یہی عشق حقیقی ہے۔ جو انسان کو اپنے محبوب سے ہی نہیں اپنے رب سے ملا دیتا ہے امید ہے کہ آپ کو یہ کہانی ضرور پسند آئے گی۔
والسّلام
محمد حنیف قادری

اندھیری رات قبرستان جھینگروں کی آواز اور ہُو کا عالم تھا' ہم دونوں' دو قبروں کے درمیان بیٹھے ہم کلام تھے کوئی رات کے اس پہر ادھر آ نکلے تو ڈر کے مارے بھاگ جائے مگر وہ تو اپنی باتوں میں یوں گم تھی کہ شاید اسے اپنی ذات کا بھی ہوش نہ تھا گاؤں جو کہ تقریباً دو ایکڑ دور تھا اور آج سردی بھی زیادہ تھی پورا علاقہ دھند کی شدید لپیٹ میں تھا آشا نے گرم شال اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی وہ میرے قدموں پر سر رکھے روئے جا رہی تھی اور میں اسے چپ کرانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

''آشا صبر سے کام لو شاید ہمارا ملن خدا کو منظور نہیں تھا اور میں اسے رضائے الٰہی کہتا ہوں تم بھی اسے سمجھو اور اپنے گھر لوٹ جاؤ۔''

''نہیں میری جان شاہ جی! اب میں مر تو سکتی ہوں مگر واپس نہیں جا سکتی میں نے اپنا جیون آپ کے نام کردیا ہے۔''

''آشا پیار دو جسموں کا نہیں دو روحوں کا ملاپ ہوتا ہے۔''

''شاہ جی میرے لیے صرف اور صرف آپ کی ذات ہے میں اپنے من میں آپ کے سوا کسی کا خیال بھی پاپ سمجھتی ہوں' رہی جسم اور روح کی بات، تو میرا جسم اور روح بھی آپ کی ذات ہے اور یہ جو میرے سانسوں کی ڈور ہے ناں یہ صرف اور صرف آپ کی ذات ہی سے منسلک ہے۔''

''پگلی میں جانتا ہوں سب مگر میرا مذہب نکاح کے بغیر ان باتوں کی اجازت نہیں دیتا اور تم کیا سمجھتی ہو کہ میرے سینے میں دل نہیں' تمہارے اس بے لوث پیار نے تو مجھے بھی تڑپا کے رکھ دیا ہے تیرے بن زندگی کا تصور تو میرے لیے بھی محال ہو رہا ہے مگر یہ جو سامنے شاہ صاحب کا مزار ہے ناں اس کا تقدس مجھے یہ سب کرنے کی اجازت نہیں دیتا شاہ صاحب اپنی گدی میرے حوالے کر گئے ہیں' لوگ کیا کہیں گے کہ شاہ صاحب کا گدی نشین ایسا نکلا اور تم جانتی ہو اس پورے علاقے میں میرے مرشد سائیں کو دنیا مانتی ہے اور لوگ یہاں آ کر منتیں مانتے ہیں ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی لوگ ان کے در سے فیض پاتے ہیں ان کی ذات سبھی کے لیے امید کی کرن ہے۔ آشی یہ سب سفید چادر کی مانند ہے اس پر لگا ہوا داغ دور سے نظر آجائے گا اور میں شاہ صاحب کی امانتوں کا امین ہوں میں اپنے مرشد کی سفید چادر پر کوئی داغ لگانا تو محال ایسا سوچ بھی نہیں سکتا اور پھر تم ایک پنڈت کی بیٹی ہو اور جانتی ہو تمہارے اس فیصلے سے کتنا خون خرابہ ہوگا۔''

''جانتی ہوں شاہ جی، جانتی ہوں مگر میں اس دل کا کیا کروں جس پر میں نے اپنا اختیار کھو دیا ہے۔''

''جانتی ہو ایک وقت تھا یہ اختیار میں نے بھی کھو دیا تھا اس وقت میری حالت بھی بن پانی کے مچھلی جیسی تھی مگر مچھلی پانی کے بغیر مر کر اپنی جان چھڑا لیتی ہے اور مجھے اس پر بھی اختیار نہ تھا یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے سانس کے بن جینا اور جانتی ہو یہ سب کیسے ہوا...... یوں کہ جب بے اختیاری کی کیفیت نے مجھ پر غلبہ پایا تو میرے قدم خود بخود اپنے مرشد کے مزار کی طرف اٹھ گئے اور میں نے اپنا سر اپنے مرشد کے قدموں میں رکھا اور زار و قطار رونے لگا اور جانے کب تک میں روتا رہا، روتا رہا اور پھر جانے کب مجھ پر نیند کی سی کیفیت طاری ہوئی یہ نیند تھی یا کچھ اور' میں نے اپنے مرشد کو دیکھا، ہاتھ میں عصا لیے سر پر دستار پہنے' میں ان کے قدموں سے لپٹ کر سسکیاں لینے لگا میرا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اچانک مرشد فرمانے لگے۔''

''حق کی راہ پر چلے ہو تو مصیبتوں کو گلے لگانا سیکھو آگ پر یوں چلو کہ تمہارے پاؤں میں ایک بھی چھالا نہ ہو' سمندر میں کود و مگر تمہارا جسم سوکھا رہے' کوئلے کی کان میں داخل ہو کے یوں نکلو کہ تمہارے جسم پر ایک بھی داغ نہ ہو' کیچڑ میں چھلانگ لگاؤ مگر تمہارے دامن پر ایک بھی چھینٹا نہ ہو۔''

''مگر یہ سب کیسے ممکن ہے مرشد سائیں؟''

''یہ سب ممکن ہے بس نظر کرم کی دیر ہے' یہ کہہ کر مرشد پاک نے مجھے اٹھایا اور اپنے سینے سے لگایا اور وہ سب ہوگیا جسے بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں۔''

''شاہ جی آپ کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔''

''یہ سچ ہے یہ باتیں پریکٹیکل کی ہیں تھیوری کی نہیں۔''

''شاہ جی کیا میں مسلمان ہو کر آپ سے نکاح کر سکتی ہوں پھر تو کوئی رکاوٹ نہ ہوگی؟''

''کیا میرے لیے...... یا اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر؟''

''صرف اور صرف آپ کے لیے۔''

''آشی اسلام کو جو اس کی حقانیت کے ساتھ تسلیم کرے اصل مسلمان وہی ہوتا ہے' اصل مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان بننے کے قریب ہے' یہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے یہ لازماً پاکستان میں شامل ہوگا' ملکی حالات عنقریب انتہائی خراب ہونے کا خدشہ ہے میری نظریں کافی دور تک دیکھ رہی ہیں اگر آج تم گھر واپس نہ گئیں اور تمہارے گھر والوں کو تمہارے فرار کا علم ہوگیا تو قیامت سے پہلے قیامت کا سماں ہوگا کیا تم چاہتی ہو کہ ہمارا تمہارا ملاپ کئی خاندانوں کو اجاڑ دے کئی بچے یتیم ہو جائیں عورتیں بیوہ ہو جائیں اور نہ جانے کیا کچھ اس آگ میں جل کر راکھ ہو جائے' اس میں سب سے زیادہ نقصان تمہارے گھر والوں کا ہوگا کیونکہ ہمارے گاؤں میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں کافی کم ہے اور آس پاس دور تک ہندوؤں کا کوئی ایسا گاؤں نہیں جہاں سے تمہارے گھر والوں کو مدد مل سکے۔

''مسلمانوں کو اگر بھنک بھی مل گئی کہ تم مسلمان ہو کر مجھ سے نکاح کی خواہش مند ہو تو وہ تمہیں کبھی گھر واپس نہ جانے دیں گے اور شاید وہ مجھے بھی مجبور کر دیں گے اور ہندو تمہیں واپس لے جانے کے لیے جان لڑا دیں گے اس دوران کتنے گھر اجڑیں گے تمہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کا احساس ہے۔ وہ میرے سچے مرشد کے بارے میں ہزار باتیں بنائیں گے اور کم از کم میں ایسی باتیں کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا' لوگوں کا ان آستانوں' مزاروں خانقاہوں اور درویشوں پر جو مان ہے وہ ٹوٹ جائے گا تمہارے ہجر کے دوزخ میں ہزار بار جلوں اور جلتا ہی رہوں یہ مجھے آسان لگتا ہے اس کی نسبت کہ کوئی میرے مرشد کی سفید چادر کو داغ لگائے۔"

"شاہ جی آپ کیا چاہتے ہیں، یہی کہ میں اپنے گھر واپس چلی جاؤں"

ہاں آشی یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا اس کا صلہ میں نہیں تمہیں میرا رب دے گا۔"

"شاہ جی اگر آپ میرے گھر جانے پر ہی راضی ہیں تو پھر میں گھر واپس چلی جاتی ہوں' اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو۔"

"وہ مزار سے لپٹ کر رونے لگی۔ "ہم آپ سے کیے گئے تمام وعدے پورے کریں گے' ہر قیمت پر ہر حال میں۔"

یہ کہہ کر آشا نے اپنی گرم شال کے پلو سے آنسو پونچھے اور پائیں مزار گر کر الوداعی بوسہ لیا اور چلنے کے لیے تیار ہو گئی ہم مزار سے باہر نکلے سردی بہت زیادہ بڑھ چکی تھی رات کا کوئی دو بجے کا عمل تھا آشا کا گھر گاؤں کے وسط میں تھا اور میں اپنے خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ خدا کرے ابھی تک آشا کے گھر سے باہر جانے کا علم گھر والوں کو نہ ہوا ہو اور میرے خدا نے میری آواز سن لی تھی تمام راستے میں شدید دھند نے ہمیں بہترین کور فراہم کیا اور ہم کسی بھی شخص کی نظروں میں آئے بغیر خیر خیریت سے آشا کے گھر پہنچ گئے۔

آشا کے اندر کی دنیا اب یکسر بدل چکی تھی اس کا مجھ سے پیار اب کسی اور ہی رنگ میں بدل چکا تھا گھر کی دہلیز پر آ کر وہ ایک بار پھر رونے لگی اس نے کہا آپ ایک منٹ رکیے میں گھر کے حالات کا جائزہ لے کر آتی ہوں۔" اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا وہ گھر کے اندر داخل ہو چکی تھی کیونکہ دروازے کے پٹ تو بھڑے ہوئے تھے دروازہ اندر سے بند نہ تھا یہ اسی پوزیشن میں تھا جس میں آشا اسے چھوڑ کر گئی تھی ٹھیک دو منٹ بعد آشا نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور مجھے بیٹھک میں بلا لیا اس نے دیا سلائی روشن کی۔ مجھے چارپائی پر بٹھایا اور خود ایک بار پھر میرے قدموں سے لپٹ کر رونے لگی۔

"آشا اب مجھے اجازت دیں کوئی آ گیا تو ہماری ساری محنت اکارت جائے گی۔"

☆☆☆

میرے والد گاؤں کے نمبردار تھے پچاس مربع زمین کے مالک تھے انہیں ایک زمانے میں خود بھی پہلوانی کا شوق تھا اور وہ یہی چیز مجھ میں بھی دیکھنا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے اکھاڑا بھی بنوا رکھا تھا جس میں پہلوانی سکھانے والے استاد بھی موجود تھے جنہیں میرے والد صاحب مناسب معاوضے کے علاوہ جیب خرچ بھی دیا کرتے تھے اور کھانے پینے کے تمام اخراجات بھی انہی کے ذمے تھے' ویسے بھی والد صاحب ایک سخی اور فیاض انسان تھے وہ ہر ضرورت مند کی حتی المقدور مدد کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے والد صاحب اور دوسرے لوگ بتاتے ہیں کہ ہمارے علاقے میں اسلام بہت تیزی سے پھل پھول رہا تھا، مگر گاؤں میں اسلام کی آمد شاہ صاحب کی آمد کے ساتھ ہوئی۔

ہمارا گاؤں جو کہ ہندوازم کا گڑھ تھا آس پاس کے علاقوں میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے کی وجہ سے ہمارے گاؤں کے ہندو بہت کڑھتے تھے میرے دادا جی جوان دنوں کٹر ہندو تھے اپنے گاؤں کے ہندوؤں کو

بھی مسلمانوں سے زیادہ میل ملاپ رکھنے سے منع کرتے تھے دادا جی اکثر غریب و نادار ہندوؤں کی مدد کرتے رہتے تھے ان کی حیثیت ہمارے گاؤں میں راجا جیسی تھی اور لوگوں میں ان کا کافی اثر و رسوخ تھا۔

دادا جی کے پاس ویسے تو کسی شے کی کمی نہ تھی مگر پچاس سال کی عمر ہونے کے باوجود ان کے ہاں ابھی تک اولاد نہ تھی اس کے لیے انہوں نے لاکھ جتن کیے وید، حکیم اور ڈاکٹروں سے لے کر دیوی دیوتاؤں کو بھینٹ دینے اور ہزاروں منتیں ماننے پر بھی ان کی یہ دلی خواہش پوری نہ ہو سکی۔

ایک دن میرے دادا جی کو چند ہندوؤں نے آ کر بتایا کہ گاؤں کے باہر کسی مسلمان درویش نے ڈیرہ ڈالا ہوا ہے یہ سرکاری زمین تھی اور اس میں جھاڑ جھنکار اور سرکنڈے اُگے ہوئے تھے ہمارے گاؤں کے ہندو ادھر کا رخ کم ہی کیا کرتے تھے یہ علاقہ کچھ مافوق الفطرت باتوں کی وجہ سے مشہور تھا اور جو بندہ بھی ادھر گیا وہ کوئی انوکھی کہانی ہی لے کر واپس آیا اس لیے لوگ ادھر جانے سے کتراتے تھے۔

دادا جی نے جب یہ سنا تو لوگوں کو تسلی دی کہ یہ درویش جو بھی ہے دو چار دنوں میں یہاں سے چلا جائے گا کیونکہ یہاں تو لوگ دن میں جانے سے گھبراتے ہیں کجا یہ کہ کسی کو رات یہاں گزارنی پڑے صدیوں سے اس زمین پر جو مخلوق آباد ہے وہ اسے یہاں کبھی ٹکنے نہ دے گی آپ بے فکر ہو کر اپنے گھروں کو جائیں مگر یہ میرے دادا جی اور ہمارے گاؤں والوں کی بھول تھی' آہستہ آہستہ جانے کہاں کہاں سے لوگ آتے اور اس درویش سے من کی مرادیں پا کر جاتے۔ ہر جمعرات کو وہاں لنگر پکنے لگا لوگ جمع ہونے لگے شروع میں تو ہمارے گاؤں کے ہندو اس طرف کا رخ کرنے سے کتراتے تھے اور اپنے بچوں کو بھی وہاں جانے سے منع کرتے تھے مگر بچے اکثر چھپ چھپا کر جمعرات کو وہاں جمع ہونے لگے کیونکہ انہیں کھانے کو پیٹ بھر کر کھانا ملتا بچے اکثر آ کر اپنی ماؤں سے اس درویش کا ذکر کرتے پھر ایک دن یوں ہوا کہ ایک ہندو عورت جس کا بیٹا پیدائشی گونگا اور بہرا تھا اس کا خاوند بھی فوت ہو چکا تھا اور وہ بچہ ہی اس کا واحد سہارا تھا وہ عورت بیچاری اپنی مامتا سے مجبور ہو کر چھپ چھپا کر اس درویش کی کٹیا میں جا پہنچی' کٹیا کیا تھی گھاس پھونس کی ایک جھونپڑی تھی عورت نے بڑی عاجزی سے اپنا مسئلہ بیان کیا درویش نے سننے کے بعد پیار سے لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "بی بی اللہ کرم کرے گا انہوں نے پانی دم کر کے دیا کہ اسے روز صبح شام یہی پانی پلانا ہے انشاء اللہ گیارہ دنوں کے بعد یہ لڑکا بولنے اور سننے لگے گا۔"

وہ عورت واپس آ گئی' جانے کیسے کسی کٹر قسم کے ہندو نے اسے درویش کے ہاں سے اسے آتے دیکھ لیا اس نے کافی تلخی سے اس سے پوچھ گچھ کی' مگر اس عورت نے اسے نہ بتایا اس نے اس عورت کو بالوں سے پکڑا اور کافی مار پٹائی بھی کی مگر وہ عورت نہ مانی اس دوران کافی لوگ جمع ہو چکے تھے لوگوں نے کہا کہ اسے نمبردار یا پنڈت کے پاس لے جانا چاہیے' آخرکار وہ لوگ اس عورت اور اس کے لڑکے کو میرے دادا جی کے پاس لے گئے وہ عورت دادا جی کا بہت احترام کرتی تھی جب دادا جی نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا۔

"سرکار میں آپ کو بتائے دیتی ہوں مگر آپ کو ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"ہاں بملا ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہاری ہر جائز بنتی کو پورا کیا جائے گا۔"

"میرے بچے اور مجھے کچھ نہ کہا جائے اور ہمیں چین سے اپنے گھر میں رہنے دیا جائے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ٹھیک ہے ہم وعدہ کرتے ہیں۔"

بملا نے سارا قصہ کہہ سنایا ہندوؤں نے سنا تو وہ لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے اور دادا جی سے کہا کہ اسے سخت سے سخت سزا دی جائے اس کا پورے گاؤں کو بائیکاٹ کر دینا چاہیے دادا جی نے تمام لوگوں کی باتیں سنیں اور کہا۔

"ہم بملا کو جان کی امان دے چکے ہیں رہی اسے سزا دینے کی بات تو اس کا فیصلہ ہم گیارہ دنوں کے بعد کریں گے ہم بھی دیکھتے ہیں کہ کس میں ایسی شکتی ہے جو پیدائشی گونگوں اور بہروں کو بھی ٹھیک کر سکتا ہے اگر بملا کا بیٹا ٹھیک ہو گیا تو پھر یہ اسی گاؤں میں رہے گی اور بھگوان نے چاہا تو ایسا ہوگا ہی نہیں اور جب ایسا ہوگا ہی نہیں تو بملا کو یہ گاؤں چھوڑ کر جانا پڑے گا۔"

پھر گیارہ دن ہمارے گاؤں میں اس موضوع پر بحث ہوتی رہی اور گاؤں والے گیارہ دنوں کے بعد اس عورت سمیت درویش کے پاس گئے اور درویش جس کو خدا نے بے شمار کرامتوں سے نوازا تھا اپنی کٹیا سے باہر نکلا اور ایک جم غفیر کو دیکھا تو انہوں نے عورت کے گونگے بہرے بچے کو اپنے پاس بلا کر دم کیا اور فرمایا بول اس کے حکم سے جس کے حکم سے ساری کائنات کا نظام چلتا ہے اور پھر جب لوگوں نے ایک گونگے اور بہرے کو نارمل انسانوں کی طرح بولتے ہوئے دیکھا تو بے اختیاری کی کیفیت میں وہاں موجود اکثر ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا اس بات کا میرے دادا جی پر بھی کافی اثر ہوا۔

دادا جی بھی اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لیے چوری چھپے ایک دن درویش کی کٹیا میں جا پہنچے اور اپنا مدعا بیان کیا اور ٹھیک نو ماہ بعد جب میرے والد صاحب کی پیدائش ہوئی تو میرے دادا جی نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ درویش کو منت سماجت کر کے اپنے گھر بھی لائے اور ایک بڑی دعوت کا اہتمام بھی کیا اس کے بعد اس درویش کی کٹیا پر ہمارے گاؤں کے مسلمانوں اور حاجت مند ہندوؤں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میرے دادا جی تو اس درویش کے ایسے مرید ہوئے کہ بقیہ تمام زندگی انہوں نے اس درویش کے ساتھ گزار دی زمینوں کے معاملات اب منشی سنبھالتا تھا اکثر دادا جی درویش کی کٹیا میں پائے جاتے تھے دادا جی نے بہت کوشش کی کہ درویش کے لیے وہاں ایک اچھا سا آستانہ بنوا دیا جائے مگر درویش نہ مانے۔

دادا جی نے دو مربع زمین پنڈت اور اس سے متعلق لوگوں کو دے رکھی تھی تاکہ وہ مندر کا انتظام و انصرام چلا سکیں جب دادا جی مسلمان ہوئے تو انہوں نے وہ زمین ان سے واپس لینی چاہی مگر جب درویش کو پتا چلا تو انہوں نے دادا جی کو ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ اسلام جبر سے نہیں حسن اخلاق سے پھیلا ہے مندر اور اس سے متعلقہ لوگوں کو اسی طرح رہنے دو بلکہ ان سے پہلے سے بھی زیادہ اچھے طریقے سے پیش آؤ تاکہ انہیں اسلام اور ہندوازم کا فرق محسوس ہو سکے جب یہ باتیں پنڈت اور اس کے متعلق لوگوں کو معلوم ہوئیں تو وہ بھی متاثر ہوئے آہستہ آہستہ گاؤں میں بسنے والے ہندو مسلمان ہو رہے تھے مگر کچھ لوگ اب بھی اپنے عقائد پر قائم تھے اور اسلام کے تیزی سے پھیلاؤ سے کڑھتے تھے مگر اب گاؤں میں ان کی تعداد اتنی کم تھی کہ وہ لوگ کھلم کھلا مسلمانوں کی مخالفت کرنے سے گریز کرتے تھے۔

اس درویش کی کٹیا کے ساتھ ہی دادا جی کی زمینیں تھیں درویش نے اپنی کٹیا میں تو کوئی تبدیلی نہ کرنے دی البتہ انہوں نے وہاں کنواں کھودنے کی اجازت دے دی، لوگ دور دراز سے آتے اور اکثر ان کے لیے رہائش کا مسئلہ بنتا اور اب مسلمان بچوں اور نو مسلم لوگوں کے لیے درس و تدریس کا مسئلہ بھی تھا اس لیے دادا جی نے گاؤں کے قریب ہی اپنی زمینوں پر ایک مسجد اور درسگاہ کی بنیاد رکھی اور درویش کے پاس آنے جانے والے دور دراز کے لوگوں کے لیے درسگاہ کے ساتھ ہی کافی کمرے بنوائے اور لنگر خانے اور لنگر کا انتظام بھی کیا۔

یہ درویش بھی اپنی ذات میں باکمال تھے بس سادہ پانی پہ دم کر کے دیتے اور لوگوں کو فیض ہو جاتا تھا ان کی ذات سے کئی کرامات منسوب تھیں لوگوں کا ان کے در آنا جانا لگا رہتا تھا کٹیا سے نکلے وضو کیا اور نماز پڑھی صبح دس بجے کے قریب وہ تمام سائلوں کو بلاتے ان کے مسائل سنتے انہیں تسلی دیتے ظہر کی نماز کے بعد عصر کی نماز تک پھر وہ لوگوں کے درمیان رہتے اور دین کی تبلیغ کرتے پھر شام کی نماز پڑھتے لوگوں کو الوداع کر دیتے اس کے بعد دور سے آنے والے لوگ درسگاہ کے ساتھ بنے کمروں میں چلے جاتے اور وہیں ان کے لیے لنگر کا انتظام ہوتا تھا گاؤں والے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے ایک دادا تھے جنہیں رات کو درویش کے ساتھ رہنے کی اجازت تھی اپنی زندگی کے آخری ایام بھی دادا نے درویش کی کٹیا میں ہی گزارے ابھی والد صاحب کی عمر دس سال بھی نہ تھی جب میرے دادا اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ مگر جاتے جاتے وہ درویش سے ابو کو پالنے اور زمینوں کا تمام انتظام سنبھالنے کا وعدہ لے گئے کیونکہ میری دادی ابو کی پیدائش کے دو سال بعد ہی انتقال کر گئی تھیں اور کوئی قریبی عزیز بھی نہ تھا، ابو کی پرورش ایک عورت جو کہ ہماری خاندانی ملازم تھی اور وہ بھی مسلمان ہو چکی تھی اس کے ذمے تھی دادا کی وفات کے بعد درویش نے درسگاہ میں رہائش اختیار کر لی اور وہیں پہ انہوں نے زمینوں کا سارا انتظام سنبھال لیا ابو کو وہ گھر سے لے آئے اور اپنے ساتھ درسگاہ میں رکھا اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے امام مسجد کو پابند کیا اور اسکول تو وہ پہلے جا ہی رہے تھے پھر بھی انہوں نے ایک ٹیچر کو شام کے وقت درسگاہ میں آ کر پڑھانے پر راضی کر لیا ابو کو درویش نے سگے بیٹوں کی طرح پالا، ابو کو بچپن ہی سے پہلوانی کا شوق تھا اس کے لیے بھی درویش نے مناسب انتظام کیا اور انہیں ایک اکھاڑا بنا کر دیا اور انہوں نے سترہ سال کی عمر میں ابو کی شادی کروا دی یہ لوگ ہمارے رشتہ دار تو نہ تھے مگر ہماری برادری کے تھے۔

میری امی جو کہ خود بھی ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں ان کا خاندان بھی اس درویش کا بہت زیادہ عقیدت مند تھا ابو کی پرورش اور زمینوں کے تمام انتظام و انصرام سنبھالنے کی وجہ سے لوگ ابو کو بھی شاہ جی کہا کرتے تھے اور جب میری پیدائش ہوئی تو لوگ مجھے بھی شاہ جی ہی کہا کرتے تھے درویش کمال شاہ سے کسی نے پوچھا شاہ جی گستاخی معاف، آپ تو سیّد ہو آپ کو شاہ جی کہنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر لوگ صابر اور اس کی اولاد کو بھی شاہ جی کہتے ہیں کیا یہ درست ہے۔"

"یہ سب اس کی رضا ہے وہ جسے چاہے عزت دے اور جسے ذلت، اور رہی شاہ جی والی بات تو کسی کو شاہ کہنے سے کوئی سید نہیں ہوتا شاہ ایک عزت اور احترام کا لفظ ہے جیسے بادشاہ، شہنشاہ۔"

اس کے بعد کسی نے کبھی اس بارے میں کوئی سوال نہ کیا بلکہ لوگ ہمیں اور سید کمال شاہ کو ایک ہی خاندان سمجھتے تھے مگر ابو سے جب بھی کسی نے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے اپنے آپ کو سید کمال شاہ کا غلام اور نوکر کہنے میں ہی فخر محسوس کیا اب زمینوں کا تمام انتظام ابو ہی سنبھالتے تھے مگر جب انہیں کوئی مسئلہ ہوتا تھا تو وہ سید کمال شاہ سے ہی مشورہ کرتے تھے اور سید کمال شاہ تو ابو کو بیٹا ہی کہا کرتے تھے اور مجھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں تو ان کی جان تھی دادا زندہ رہتے تو شاید اتنا پیار تو وہ بھی نہ کرتے جتنا سید کمال شاہ کو مجھ سے تھا۔

سید کمال شاہ جب ہمارے علاقے میں آئے تو ان کی عمر سترہ سال کے قریب تھی اور یہ عین عالم جوانی تھا شاہ صاحب چاہتے تو ان کے لیے رشتوں کی کمی نہ تھی ایک عالم ان کا دیوانہ تھا جانے کیوں انہوں نے شادی نہ کی' شاید اس لیے کہ اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر اور تبلیغ اسلام نے انہیں یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا دور دور سے لوگ ان سے اسلام سے متعلقہ مسائل کے حل کے لیے آتے اور مطمئن ہو کر جاتے بیماروں کو شفا تو عام سی بات تھی لوگ ایسے ایسے مسائل لے کر آتے جن کا کہیں سے کوئی حل نہ ہوتا مگر وہ لوگ بھی یہاں سے فیض پا کر جاتے۔

مگر میری عمر ابھی سات سال تھی کہ ان کا وصال ہو گیا میرا اور ان کا اتنا پیار تھا کہ وہ تو جیسے میری زندگی تھے میں ان کی چارپائی سے لپٹ کر خوب رویا ابو اور امی مجھے چپ کروانے کی کوشش کرتے مگر رونا تھا کہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا اور آنسو تھے ساون بھادوں کی طرح برسنے لگتے سینے سے اک ہوک سی اٹھتی تھی جو میرے وجود کو جھنجوڑ ڈالتی تھی۔

سید کمال شاہ تو مجھے پیار سے بیٹا ہی کہتے تھے مگر میں نے انہیں مرشد سائیں کے نام ہی سے پکارا کیونکہ ابو اور امی ان سے ایسے ہی مخاطب ہوتے تھے اور مجھے بھی وہ یہی سمجھایا کرتے تھے بچپن ہی سے ان کا اور میرا رشتہ محبت اور محبوب کا سا تھا درسگاہ کے ساتھ ہی ان کا مزار تعمیر کر دیا گیا میں صبح اٹھتا وضو کرتا اور نماز پڑھنے کے بعد ان کے مزار پر حاضری دیتا۔

☆☆☆

میری پہلوانی کے چرچے عام تھے آج تک کوئی بھی مجھے شکست نہ دے سکا تھا گو کہ میرا وجود روایتی پہلوانوں کی طرح نہ تھا مگر کشتی کے دوران جانے کہاں سے مجھ میں اتنی طاقت آجاتی تھی کہ کوئی بھی پہلوان میرے آگے تھوڑی دیر سے زیادہ نہ ٹکتا تھا اور یہ سب میرے مرشد سائیں کمال شاہ کا کمال تھا۔

ہمارے گاؤں میں میلہ لگتا تھا اور دور دور سے لوگ اس میلے میں شرکت کرتے تھے یہ تہوار تو ہندوؤں کا تھا مگر مسلمان بھی اس میں شریک ہوتے تھے اس سلسلے میں کبڈی' کشتی اور رسہ کشی کے علاوہ اور بھی کئی کھیل ہوتے تھے اور اس دفعہ بھی جیت نے ہمیشہ کی طرح میرے قدم چومے مگر مجھے وہ خوشی نہ ہوئی جو ہمیشہ مجھے جیتنے پر ہوا کرتی تھی آج کل میرے دل کی حالت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی اک عجب سی بے کلی اور بے چینی نے مجھے گھیر رکھا تھا اپنے دل کی یہ کیفیت میری سمجھ سے بالاتر تھی میرے وہ دوست جو میلے میں میرے ساتھ تھے میں نے ان سے اجازت چاہی اور گھر کی طرف ہو لیا' مزار' مسجد اور درسگاہ کا سارا انتظام اب ابو سنبھال رہے تھے وہ اب اشد ضرورت کے تحت ہی کہیں باہر نکلتے تھے اب انہوں نے اپنا گاؤں والا مکان چھوڑ کر مزار کے ساتھ ہی گھر بنا لیا تھا اور وہیں پہ اب ہماری رہائش تھی مزار پہ آنے جانے والوں کا اب بھی تانتا بندھا رہتا تھا اور اب مرشد سائیں کی ڈیوٹی ابو نے سنبھال رکھی تھی ہر سال بڑی دھوم دھام سے مرشد سائیں کا عرس ہوتا تھا اور لوگ دور دراز سے پیدل قافلوں کی شکل میں چل کر عرس میں آنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔

گندم کی فصل تیار ہو چکی تھی میں بے دھیانی کے عالم میں پگڈنڈی پہ چلتا ہوا گھر کی طرف جا رہا تھا یہ راستہ میلے میں آنے جانے والوں کے لیے بہترین تھا لوگ اس راستے پر آجا رہے تھے اس میلے میں ہندو مرد عورت' بچے بوڑھے بھی حاضری دیتے تھے اور مندر میں دیوی دیوتاؤں کے چرن چھوتے تھے اور اپنی طرف سے چڑھاوے چڑھاتے تھے ہمارے گاؤں کے ہندو مسلمانوں سے دب کر رہنے پر مجبور تھے کیونکہ نہ صرف ہمارے گاؤں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی بلکہ ہمارے گاؤں کے آس پاس کے تمام گاؤں اسلام کی روشنی سے منور ہو چکے تھے بلاشبہ ہمارا علاقہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا اس کے علاوہ ایک بات جو ہندو پنڈت اور دوسرے ہندو بہت اچھی طرح جانتے تھے وہ یہ تھی کہ مندر اور اس سے متعلقہ لوگوں کی آمدنی کا ذریعہ ہماری زمینیں تھیں، جو کہ ابھی تک ہمارے ہی نام تھیں اور خدا کے فضل و کرم سے ہم مسلمان ہو چکے تھے۔

ہمارے گاؤں میں ہندو ازم کی کمر تو میرے دادا کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ہی ٹوٹ چکی تھی' کیونکہ وہی اس گاؤں کے نمبردار اور کرتا دھرتا تھے ان کے مسلمان ہونے کے بعد کسی ہندو میں اتنی جرأت نہ تھی کہ کھلم کھلا اسلام کے خلاف بول سکے اور دادا ان کے بعد میرے والد کی تربیت سید کمال شاہ صاحب نے جن اسلامی خطوط پر کی وہ بھی اپنی مثال آپ تھے۔ انہیں پہلا سبق ہی حسن اخلاق کا دیا، شاید یہی وجوہات تھیں کہ ہمارے گاؤں کے ہندو اور مسلمان امن سے رہ رہے تھے پنڈت رام دیال اب بھی کبھی کبھار میرے والد اور شاہ صاحب ملتا رہتا تھا اور سید کمال شاہ صاحب ان سے بڑے تپاک سے ملا کرتے تھے اور انہیں اپنے حجرے میں لے جاتے اور اس دوران کسی اور کو حجرے میں جانے کی اجازت نہ تھی اور جب پنڈت رام دیال جاتے تو شاہ صاحب خود انہیں درسگاہ سے باہر تک الوداع کرنے جاتے۔ شاہ صاحب اور پنڈت رام دیال کی حجرے میں کیا باتیں ہوئیں اس بارے میں نہ تو پنڈت رام دیال نے کبھی ذکر کیا اور نہ ہی شاہ صاحب نے، کبھی شاہ صاحب سے کسی نے پوچھا بھی تو وہ ہنس کر ٹال دیا کرتے تھے۔

سید کمال شاہ کے مزار پر ہر وقت میلے کا سماں ہوتا تھا میرے والد کو شاہ صاحب خود اپنی گدی پر بٹھا کر گئے تھے شاہ صاحب کی دنیاوی تعلیم کا تو کسی کو پتہ نہ تھا مگر بڑے بڑے عالم فاضل ان سے اپنے مسائل کا حل پا کر جاتے اور یہی حال میرے والد کا تھا ان کی ظاہری تعلیم بھی واجبی سی تھی مگر جب سے وہ شاہ صاحب کی گدی پر بیٹھے تو یوں لگتا تھا کہ جیسے شاہ صاحب خود بیٹھے ہوں جب لوگوں کے سامنے وہ اسلام کی تبلیغ کرتے تو لوگ ان کی بات سننے میں یوں محو ہوتے کہ اپنا آپ بھلا بیٹھتے۔

جب بھی والد صاحب گھر سے باہر کہیں کسی دعوت پر گئے ہوتے تو لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے میرے پاس آتے اور خدا کا شکر ہے کہ کبھی مایوس ہو کر نہیں لوٹے اور آج بھی والد صاحب کسی تبلیغی دورے کے سلسلے میں کہیں باہر گئے ہوئے تھے میں تمام سائلین کو فارغ کر کے گھر پہنچا' ماں کو سلام کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو ماں جی نے کہا۔

''بیٹا تمہاری آپی مدیحہ کی سہیلی پنڈت رام دیال کی بیٹی آشا آئی ہوئی ہے اور وہ کہتی ہے کہ اسے آپ سے بات کرنی ہے' وہ مجھے تو کچھ بتاتی ہی نہیں بس روئے جاتی ہے بیٹا ان کا مسئلہ سن لے اور ہاں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ پنڈت رام دیال کی بیٹی ہمارے گھر آئی تھی ورنہ ہو سکتا ہے ہندو برادری اس سے بھڑک جائے اور اس سے بھی زیادہ ہمیں پنڈت رام دیال کی عزت عزیز ہے میں نہیں چاہتی لوگ پنڈت پر اس کی بیٹی کی وجہ سے انگلیاں اٹھائیں اور تمہارے ابو نے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ کوئی ہندو عورت سائل بن کر آئے تو اس کے بارے میں کسی کو نہ بتایا جائے۔''

''میں نے کہا ٹھیک ہے ماں جی نہیں بتاؤں گا

WWW.PAKSOCIETY.COM

مدیحہ آپی ساتھ ہیں نا۔“

”ہاں ہیں۔“ ماں جی نے کہا۔

”تو پھر آپ انہیں بھیج دیں میں اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔“

مدیحہ آپی ہمارے مزارع کی بیٹی تھیں اور وہ اکثر ہمارے گھر میں آتی جاتی رہتی تھیں ان کے اور ہمارے خاندان میں کافی پرانے مراسم تھے اور یہ وہ لوگ تھے جو کہ میرے دادا ابو کے ساتھ ہی مسلمان ہوگئے تھے۔

”السلام علیکم۔“ مدیحہ آپی نے مجھے دیکھتے کہا۔

”وعلیکم السلام مدیحہ آپی۔“

اس کے ساتھ ہی کوئی برقع پوش لڑکی میرے قدموں کی طرف بڑھی‘ میں نے جلدی سے اپنے پاؤں کو پیچھے کھینچنا چاہا مگر اس نے مضبوطی سے میرے پاؤں پکڑ لیے اور بے اختیار انہیں چومنے لگی اور ساتھ ساتھ ہی وہ روتی بھی جارہی تھی میں نے مدیحہ آپی کی طرف دیکھا تو وہ بھی مجھے آبدیدہ نظر آئیں میں نے مدیحہ آپی سے کہا کہ وہ اپنی سہیلی کو منع کرے کہ وہ ایسا نہ کرے مگر بجا یہ کہ وہ اسے منع کرتی وہ خود بھی رونے لگیں۔

ایسے مناظر سے اکثر میرا واسطہ پڑتا رہتا تھا لوگ دنیا کے ستائے ہوئے‘ مسائل میں گھرے ہوئے آتے اور انہیں جب کہیں آسرا ملتا تو وہ اپنے اندر کی بھڑاس نکال لیتے تھے مگر اس ہندو لڑکی کا انداز ان سب سے جدا تھا اس کے رونے میں کچھ نیا پن تھا یہ رونا کوئی عام رونا نہیں لگتا تھا اس میں اتنا درد تھا کہ شاید پتھروں کو بھی پگھلا دے اور اس درد سے مجھ سے زیادہ واقف کون ہو سکتا تھا‘ اور پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا بے اختیاری میں پنڈت رام دیال کی بیٹی کے چہرے سے نقاب اتر گیا اور اسی کیفیت میں وہ ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی اور روتے روتے کہنے لگی۔

”حضور معاف کردیں مجھ ناچیز سے گستاخی ہوگئی میں تو آپ جیسے پوتر دیوتا کے بارے میں سوچنے کے قابل بھی نہیں مگر کیا کروں آپ کو دیکھ کر مجھے اپنے آپ پر اختیار ہی نہیں رہا اس کے بعد وہ جانے کیا کیا کہتی رہی مگر مجھے کچھ سنائی نہ دیا میں قدرت کے اس حسین شاہکار کو دیکھنے میں اتنا محو ہوا کہ مجھے اپنی ذات بھی گم ہوتی نظر آئی‘ اس کے چہرے پر اتنی معصومیت اور سادگی تھی کہ اسے دیکھتے ہی خدا کی قدرت اور صناعی پر عش عش کرنے کو دل چاہتا تھا اس کا حسن ایسا پاکیزہ تھا کہ جسے دیکھتے ہی من کے سارے پاپ دھل جائیں ایسا مبہوت کردینے والا حسن میں نے ظاہری شکل میں کبھی نہ دیکھا تھا اور شاید میری تربیت بھی مختلف ماحول میں ہوئی تھی‘ عورت کے بارے میں ایسا کوئی تصور میرے ذہن میں موجود نہ تھا میرے والد اور مرشد سائیں ایسی باتوں کے سخت خلاف تھے۔

مگر شاید یہ سب فطرت کا حصہ ہے اور یہ بھی رنگ فطرت کے تابع ہیں۔

”شاہ جی‘ یہ لڑکی آپ کے لیے پاگل ہوچکی ہے شاہ صاحب کے مزار پر بھی کئی دفعہ حاضری دے چکی ہے اور ہزاروں منتیں بھی مان چکی ہے یہ شاید جنون کی حد سے بھی زیادہ آپ کو چاہتی ہے اس کے والد پنڈت رام دیال اور گھر والوں کو شاید ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ یہ شاہ سائیں کے مزار پر جاتی ہے میں اسے کئی بار سمجھا چکی ہوں کہ یہ سب ناممکن ہے مگر جانے کیوں یہ مانتی ہی نہیں شاید یہ آپ کی محبت میں اپنے آپ پر اختیار کھو چکی ہے ابھی ان لوگوں کو اصل حقیقت کا پتہ نہیں چلا جس دن انہیں پتہ چل گیا وہ لوگ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے آج میں مجبور ہو کر آپ کے پاس آئی ہوں شاید اس پہ آپ کی باتوں کا کوئی اثر ہوجائے۔“

مدیحہ آپی نے سارا قصہ کہہ سنایا اور میری طرف

امید بھری نظروں سے دیکھنے لگی میں جو آشا کے قدرتی حسن سے وقتی طور پر مبہوت ہوگیا تھا اب سنبھل چکا تھا کیونکہ میری تربیت ہی ایسی ہوئی تھی آشا کے حسن اور عشق نے مجھے متاثر ضرور کیا تھا مگر اس کے لیے میں اپنے بزرگوں کے اصولوں کی قربانی نہیں دے سکتا تھا میرے مرشد کا مزار جس پر کبھی مذاہب کے لوگ حاضری دینا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے یہ وہ آستانہ تھا جو کہ لوگوں کی عزتوں کا رکھوالا تھا اور دنیا جانتی ہے اسلام جبر کے زور پر نہیں مسلمانوں کے حسن اخلاق سے دنیا میں روشن ہوا ہے

آشا کے عشق کے اخلاص نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا حکمت و دانائی سے مجھے اس مسئلے کو حل کرنا تھا اور مجھے امید تھی کہ میرا سوہنا رب میری مدد کرے گا میں نے اپنا رخ آشا کی طرف کیا اور کہا ”جی فرمایئے آپ کیا چاہتی ہیں۔“

”میں آپ کو چاہتی ہوں شاہ جی آپ اور صرف آپ اس کے لیے میں نے شاہ جی کے مزار پر ہزاروں منتیں بھی مان رکھی ہیں میں نے ان سے بارہا آپ کو مانگا ہے راتوں کو اٹھ کر رو رو کر مانگا ہے میں نے پہلی بار آپ کو بیساکھی کے میلے میں دیکھا تھا تب سے آپ کی صورت میری آنکھوں میرے دل اور میری روح میں بسی ہوئی ہے آپ کے بن میرا کہیں بھی دل نہیں لگتا اور شاید آج کے بعد میں آپ کو مل پاؤں یا ناں‘ آپ کو آپ کے پیاروں کا واسطہ ہے میرے پیار کی لاج رکھنا۔“

”آشا آپ کے پیار کی میں دل و جان سے قدر کرتا ہوں مگر میرے نزدیک یہ سب...... اچھا خیر چھوڑو میں تم سے صرف اور صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تم بہت اچھی ہو بہت ہی اچھی تمہارا دل معصوم ہے اور اسے معصوم ہی رہنا چاہیے یہ دنیا بہت ظالم ہے یہاں سچ کو ہمیشہ سولی پر لٹکایا گیا یہ الگ بات ہے کہ اس سے سچ امر ہوگیا مگر دنیا اور دنیا والوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، رہی میری بات تو میرا ایمان ہے کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں

”آشا دیوی میرے لیے آپ اور آپ کا گھرانہ انتہائی قابل احترام ہے کیونکہ یہ میرے بزرگوں کا حکم ہے ایک عرصہ انہوں نے اکٹھے گزارا ہے اور میں کم از کم ان کی عزت نیلام نہیں کرسکتا۔“

”شاہ جی میرے لیے عزت آپ کا وصل ہے اور بے عزتی آپ سے جدائی کا نام ہے۔“

”صبر سے کام لو میں آپ کو جواب نہیں دے رہا مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔“

”شاہ جی اگر یہ آپ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر اور اگر کچھ عرض کرنے کی گنجائش ہے تو......“

”ہاں کیوں نہیں کہیے۔“

”میرے لیے وقت کی نہیں آپ اور آپ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی اہمیت ہے سرکار شاید مجھے دوبارہ یہ موقع ملے یا نہ ملے آج میں کم از کم اپنے دل کی حالت آپ سے بیان کردینا چاہتی ہوں میری محبت بے لوث ہے اور مجھے آج تک یہ سمجھ نہیں آسکی کہ یہ سب ہوا کیسے مسلمانوں سے سخت نفرت میرا بچپن سے شیوہ تھا دیوی دیوتاؤں سے پیار میری زندگی تھا میری زبان پر ہمیشہ دیوی دیوتاؤں کے بھجن جاری رہتے تھے ہندو جاتی میں مجھے ہمیشہ انتہائی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا گیا ایک دن پتا جی بڑے دھیمے سروں میں سید کمال شاہ کے بارے میں بتا رہے تھے اور میری ان سے بحث ہوگئی میرے پتا جی مجھ پر جان چھڑکتے تھے مگر اس دن جانے کیا ہوا کہ وہ مجھ سے سخت ناراض ہوئے شاید وہ اپنے من سے شاہ صاحب سے متاثر تھے اور مسلمان بھی ہونا چاہتے تھے مگر ان میں دنیا سے لڑنے کا حوصلہ نہ تھا۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ہماری پرانی خدمت گار نوراں بی بی چائے لے کر آ گئی۔

چائے پینے کے بعد آشا نے اور بہت سی باتیں کیں جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں' مگر ایک بات سچی تھی کہ اس کے پیار میں سچائی تھی' شاید یہ میرا امتحان تھا اور مجھے اس امتحان میں ہر حال میں کامیاب ہونا تھا مگر اس سے پہلے کہ یہ سلسلہ تادیر جاری رہتا اور مجھے مزید آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا پاکستان کی تحریک ان دنوں زوروں پر تھی ہمارا علاقہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ یہ علاقہ پاکستان میں شامل ہوگا ہمارے گاؤں میں ہندوؤں کی تعداد ویسے ہی کم رہ گئی تھی اس لیے بچے کھچے ہندوؤں نے ہندو اکثریت کے علاقوں کی طرف رخ کیا ہمارے گاؤں سے ہندو ایک ایک دو دو کر کے جا رہے تھے وہ اپنی زمین مسلمانوں کو بیچ کر جا رہے تھے اور تمام سرمایہ اپنے ساتھ لے کر جا رہے تھے۔

اسی طرح آشا بھی ایک دن اپنے گھر والوں کے ساتھ ہندوستان چلی گئی۔ بعد میں اس کے کافی عرصہ تک خطوط آتے رہے جن کے مطابق اس نے گھر والوں کے پرزور اصرار کے باوجود شادی نہیں کی اس نے مجھ سے جو وعدہ کیا پورا کیا اس نے ہندو گھرانے میں رہتے ہوئے بھی اپنے ایمان کو قائم رکھا' شروع شروع میں اس کے گھر والوں اور اس کی ہندو برادری نے اس پر کافی مظالم کیے آخر کار ایک دن اس کے وجود سے کچھ مافوق الفطرت باتوں کا ظہور ہوا تو وہی لوگ اسے آشا دیوی ماننے لگے آہستہ آہستہ ظلم کے اندھیروں میں سچائی کی روشنی چمکنے لگی لوگ دھڑا دھڑ اس کے گرد جمع ہونے لگے دنیا اپنے مطلب کے لیے اس کے در پر حاضری دینے لگی اب اس کے ماں باپ اور دونوں بھائی بھی مسلمان ہو چکے تھے۔

ہندوستان میں آج بھی اس کا مزار موجود ہے اور سبھی مذاہب کے لوگ اس کے در پر حاضری دینے جاتے ہیں۔

منیب الدین تو میرا پوتا ہی نہیں اب اس گدی کا وارث بھی ہے میں نے یہ سب کچھ تمہیں اس لیے بتایا ہے کہ میرا وقت اب قریب آچکا ہے اب یہ سب کچھ تمہیں ہی سنبھالنا ہے یہ کمپیوٹر اور موبائل کا دور ہے اب ایمان کو بچانا پہلے سے بھی کافی مشکل ہو چکا ہے میرا دل دکھتا ہے جب میں کسی سے کسی پیر فقیر کے بارے میں سنتا ہوں کہ ان کا گدی نشین یا پیر صاحب بذات خود مریدنی بھگا کر لے گئے یا نذرانوں کی شکل میں مرید سے اس کی جمع پونجی بھی لوٹ لی۔

مجھے قسم ہے اس کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے یہ لوگ قطعی اس قابل نہیں کہ ایسے لوگوں کو پیر فقیر مانا جائے' بچے میں چاہتا تو آشا سے شادی میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا حالات ایسے تھے کہ ان دنوں ہندو میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے مگر اس سے میری ہی نہیں تمام درویشوں کی بدنامی ہوتی یہ درویشوں کے آستانے تو لوگوں کے لیے پناہ گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں میرے بیٹے انہیں پناہ گاہ ہی رہنے دو شکارگاہ نہ بناؤ اور اس در پہ آنے والے مرید تمہارے نہیں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مرید ہیں اور ہماری اوقات اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ ہم ان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں اور اگر دنیا میں خوش قسمتی نام کی کوئی چیز ہے تو بس یہی کہ کسی کو ان کے در کی غلامی نصیب ہو جائے اور یہ وہ غلامی ہے جس کے آگے دنیا کی تمام آزادیاں بے معنی ہیں۔

□

ندامت

محترم بھائی عمران احمد

السلام علیکم!

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے' پرچہ بغیر وقفہ کے مل رہا ہے' ایک طویل کہانی لکھ چکی ہوں جلد ہی کاٹ چھانٹ کر ارسال کروں گی' فی الحال ایک مختصر سی کہانی ندامت حاضر ہے۔ یہ کہانی ہماری آج کی نئی نسل کے حوالے سے ہے جو ہر راہ چلتی خاتون کو بکاؤ مال سمجھ کر خریدنے اور لوٹنے کو تیار رہتے ہیں۔ مجھے امید ہے اس کہانی کو پڑھ کر بہت سے بھائیوں کو اپنی سوچ اور کردار پر ندامت ہوگی' اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔

آپ کی مخلص بہن

سلمیٰ غزل

کراچی

ہماری گاڑی جیسے ہی گلی سے نکلی سامنے ایک سائیکل سے ٹکراتے ٹکراتے بچی' سہیل نے حسب عادت ایک موٹی سی گالی دی' ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ فوراً گاڑی آگے لے جاتا لیکن اس نے رفتار اور آہستہ کرلی' اتنی دھیمی کہ سائیکل کے پیچھے بیٹھی لڑکی ہمیں صاف نظر آرہی تھی۔ سانولی سلونی' شاید جنید جمشید نے کسی ایسی ہی لڑکی کے لیے گانا گایا ہوگا کیونکہ اس کی ذات میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ چہرے کے نقوش بے حد جاذب نظر اور دلکش تھے۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں اور بے داغ جلد وہ بے حد پُرکشش اور خوب صورت تھی نمکین نمکین سی۔ اس نے معمولی سے کپڑے پہن رکھے تھے جس میں اس کا حسن پھوٹا پڑ رہا تھا اس کی ناک میں موٹی سی لونگ' ہاتھوں میں معمولی موٹے موٹے کڑے اور کانوں میں نقلی بالیاں تھیں۔ اس پر غضب یہ کہ وہ ہمیں دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ اس کے سفید دانتوں کی قطار اس کے گلابی ہونٹوں پر بے حد بھلی لگ رہی تھی۔

''یار قیامت ہے قیامت! میں تو اس کا پیچھا کروں گا۔'' سہیل نے اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر تبصرہ کیا۔

''بکواس نہ کرو' سیدھے کالج چلو' کلاس کیا تمہارے ابا جان لیں گے۔'' طلحہ ہماری کلاس کا مولوی تھا اور ہم لوگ اس کا خوب مذاق بناتے تھے مگر پھر بھی ہماری دوستی چل رہی تھی۔

''او بھائی ہم تمہیں تو نہیں کہہ رہے ساتھ چلنے کو' ابھی تو تمہارے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے' یہ کام تمہارے بس کا نہیں' کالج جاؤ تو ہماری اٹینڈنس لگا دینا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''یار یہ سائیکل چلا کون رہا ہے؟'' راحیل نے سوال کیا۔

''مجھے کیا پتا تم جا کر پوچھ لو۔'' سہیل جل کر بولا۔ پھر کہنے لگا ''اس کا باپ یا بھائی ہوسکتا ہے؟''

''شوہر بھی تو ہوسکتا ہے۔'' میں ہنس کر بولا۔

''لو کر لو گل...... یہ موٹا بڈھا کھوسٹ موٹی توند والا اس کا شوہر تو ہرگز نہیں ہوسکتا۔'' طلحہ کو بالکل اچھا نہیں لگا۔

''دیکھا دیکھا ابھی سالا مولوی بن رہا تھا اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

معصوم فرشتہ کیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا ہے۔'' سہیل نے بلند و بانگ قہقہہ لگایا تو طلحہ جھینپ گیا پھر غصے سے بولا۔

''دیکھو وقت برباد مت کرو' کالج چلو کیوں اس بے چاری کے پیچھے پڑے ہو۔'' وہ لڑکی اب باقاعدہ ہنس رہی تھی۔

''جو بھی ہو دیکھو وہ ہمیں دیکھ کر مسلسل ہنس رہی ہے۔'' میں نے اشارہ کیا۔

''اور ہنسی کا مطلب ہے پھنسی۔'' سہیل نے مہارت سے گاڑی سیکنڈ گیئر میں ڈالتے ہوئے کہا اس دوران کالج پر ہم نے طلحہ کو اتارا اور مایوسی کے عالم میں مین روڈ پر آئے تو کافی دور وہ سائیکل جاتی نظر آئی۔

سہیل نے اسپیڈ پکڑی اور ایک منٹ میں ہم نے اسے جالیا' لڑکی جو اُداس لگ رہی تھی' ہمیں آتا دیکھ کر اس کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ خوب صورت دانت ایک مرتبہ پھر نمایاں ہوگئے۔ راحیل نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا تو وہ شرماتے ہوئے کھنکھار کر ہنس پڑی شاید سائیکل ڈگمگائی اور چلانے والے نے سرزنش کی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئی' ہماری گاڑی جوں کی رفتار سے اس کے پیچھے تھی جب سائیکل ایک تنگ گلی میں داخل ہوئی تو ہم بے بسی سے ہاتھ ملتے رہ گئے۔ گاڑی اندر نہیں جاسکتی تھی۔ سب کے چہروں پر مایوسی پھیل گئی۔

''چلو یار گلی تو دیکھ ہی لی ہے' آج نہیں تو کل چڑیا جال میں پھنس ہی جائے گی۔'' میں نے دوستوں کو تسلی دی۔

❀ ......☆...... ❀

میں یعنی جنید' سہیل اور راحیل بڑے باپ کے بگڑے ہوئے بچے تھے جن میں طلحہ ہم سے بالکل میل نہیں کھاتا تھا کہ اس کا سوشل اسٹیٹس بہت معمولی تھا مگر چونکہ وہ ذہانت میں ہم سب سے آگے تھا اس لیے اس سے دوستی ہماری مجبوری تھی اس کے نوٹس ہمارے کام آتے تھے' ہم تینوں دوستوں کی مختلف لڑکیوں سے دوستی تھی اور ہمیں کوئی روکنے ٹوکنے اور پوچھنے والا نہیں تھا کیونکہ ہم ان موڈرن والدین کے سپوت تھے جو پیسے ہی کو اپنا دین ایمان سمجھتے ہیں ان کی سوشل ایکٹیویٹیز اتنی زیادہ تھیں کہ ہماری ان سے تفصیلی ملاقات بھی ''ہیلو' ہائے'' سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کا بچہ کیا کررہا ہے' اس کی صحبت کیسی ہے' اخلاقی معیار کیا ہے' مذہبی اقدار کی پاسداری کتنی کرتا ہے' کن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے' چنانچہ میں اور میرے دوست بگڑے ہوئے رئیس زادے تھے میں چونکہ والدین کی اکلوتی اولاد تھا اس لیے ''لاڈلا پوت کٹوری میں موت'' کی مثال مجھ پر صادق آتی تھی اور دیگر دوستوں کے مقابلے میں میری یہ اضافی خوبی تھی گاڑی بھی چونکہ میرے پاس نئی نکور تھی اس لیے زیادہ تر میرے دوست میرے ہی ساتھ آتے جاتے تھے' ہم سب ایک بہت ہی اعلیٰ اور مہنگے اسکول میں اے لیول کررہے تھے اور تمام اخلاقی گراوٹ ہم میں موجود تھی۔

❀ ......☆...... ❀

میری صبح' چھٹی کے دن عموماً بارہ ایک بجے ہوتی تھی میں اٹھا تو گھر میں کوئی نہیں تھا' ممی ڈیڈی کہیں گئے ہوئے تھے مگر اس لڑکی کو اپنے گھر میں کام کرتے دیکھ کر میں حیران رہ گیا' چھٹی کے دن عموماً صرف خانساماں ہی گھر میں ہوتا تھا اور باقی

نوکروں کی چھٹی ہوتی تھی' میرے دوست بھی آنے والے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی چونک گئی' جیسے پہچاننے کی کوشش کررہی ہو۔

''تمہارا نام؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''وہ جی نازک۔'' وہ شرما کر بولی' اس کے ہاتھ بدستور ڈسٹنگ میں لگے تھے۔

''کمال ہے اچھی خاصی موٹی ہو یہ نام کس نے رکھ دیا۔'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا کیونکہ اس کا سراپا کسی طرح سے بھی اس کے نام سے میل نہیں کھاتا تھا' اسی دوران سہیل اور راحیل بھی آگئے اور گہری نظروں سے نازک کو دیکھتے ہوئے سیٹی بجانے لگے۔

''اسے کہتے ہیں بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا' یار مزے آگئے تمہارے تو۔'' سہیل قہقہہ مار کر ہنسنے لگا تو نازک نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا پھر اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

''آپ سب بچے کون سی کلاس میں پڑھتے ہیں۔''

''بچے......'' راحیل نے سہیل کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے آنکھ ماری پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں تینوں اشارے کرنے لگے' نازک اپنا کام ختم کرکے باہر نکلنے لگی تھی تب سب سے پہلے میں آگے بڑھا کہ اس پر پہلا حق میرا تھا کیونکہ میرا اندازہ تھا مچھلی جال میں پھنسنے کو تیار ہے' بس چارہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔

''نازک سنو۔'' میں نے اسے آواز دی تو وہ جاتے جاتے رک گئی اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''میرے ساتھ دوسرے کمرے میں چلو' خوش کردوں گا۔'' میں نے اس کے قریب آتے ہوئے سرگوشی کی تو یکایک نازک کے چمکتے چہرے پر خزاں نے بسیرا کرلیا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی' ہم سب اس کے جواب کے منتظر اور ایک طرح سے اپنی باری کے انتظار میں تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے نازک کے چہرے کی زردی سرخی میں بدل گئی' غصے اور نفرت کی سرخی۔

''تم بڑے بُرے بچے ہو۔'' دکھ اس کی آواز سے چھلکنے لگا۔

''میں نے سوچا تھا اسے تمہارے جیسا بناؤں گی' تمہارے جیسے کپڑے پہناؤں گی' اسکول سے پڑھ لکھ کر تمہارے جیسا بڑا آدمی بنے گا مگر......'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''میں اسے کبھی نہیں پڑھاؤں گی' اپنی طرح جاہل رکھوں گی' ایک اچھا انسان بناؤں گی' تم جیسے بچوں سے تو وہ جاہل ہی اچھا رہے گا۔ میں اسے کبھی تم جیسا نہیں بناؤں گی۔'' وہ روتے روتے چیخ کر بولی۔ ''تف ہے تم پر آخ تھو......'' اس نے منہ پھیرتے ہوئے زمین پر تھوک دیا اور روتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی اور اس وقت ہم نے دیکھا اس کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں آنے والی روح جھانک رہی تھی۔ وہ ماں بننے والی تھی جب وہ واپس جارہی تھی تو ہماری نظریں اس کے قدموں میں لوٹ رہی تھی شرم اور ندامت سے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شارٹ کٹ

برادرم عمران احمد قریشی صاحب!
تسلیمات! ایک اور کورٹ کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ اخبارات میں کورٹ رپورٹنگ اور کرائم رپورٹنگ کرنے والے بھی کام کرتے کرتے تفتیش کار بن جاتے ہیں اور بعض کیس کس طرح حل کرتے ہیں اس کا اندازہ آپ کو یہ کہانی پڑھ کر ہوگا۔ اس کہانی کے اہم کردار میں خود اور میرے ساتھی رپورٹر ہیں کیونکہ ہم سب نے مل کر معاشرے کے ایک منفی کردار کو انجام تک پہنچایا۔ امید ہے قارئین کو ہماری یہ کاوش ضرور پسند آئے گی۔

والسلام
خلیل جبار
پنجرہ پول، حیدر آباد

آج میں بڑی تاخیر سے کورٹ پہنچا تھا' میرا معمول تھا کہ میں رپورٹنگ کے لیے صبح دس گیارہ کے درمیان کورٹ پہنچ جاتا تھا۔ صبح جلدی جانے کا یہ فائدہ ہوتا کہ کبھی کبھی اچھوتی خبریں مل جاتی تھیں۔ آپ بھی حیران ہو رہے ہوں گے کہ یہ اچھوتی خبریں کون سی ہوتی ہیں' دراصل مقدمات کی سماعت کے دوران اکثر بڑے عجیب وغریب واقعات رونما ہوجاتے ہیں کبھی سماعت پر آئے ہوئے قیدی آپس میں لڑ پڑتے ہیں' کبھی کوئی قیدی فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے اکثر خواتین آپس میں الجھ جاتی ہیں۔ خلع کے مقدمے میں آئے ہوئے میاں بیوی آپس میں لڑ پڑتے ہیں' ایسے واقعات نہ صرف کورٹ میں آئے ہوئے لوگوں کی دلچسپی کا باعث بن جاتے ہیں بلکہ اخبارات کے قارئین کے لیے بھی دلچسپی رکھتے ہیں اور ہم ان واقعات میں خوب مرچ مسالا لگا کر خبر بناتے ہیں تاکہ قاری خبر کی سرخی پڑھتے ہی پوری خبر پڑھے بغیر نہ رہ سکے۔

میں کورٹ کی کینٹین میں بیٹھا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ استاد پیارے اور نعیم قریشی کو کہاں تلاش کیا جائے کہ وہ خود ہی کینٹین میں چلے آئے۔

''خلیل جبار تم نے بھی باہر ہی باہر پیدا شروع کردی ہے۔ آج نعیم بھائی صبح جلدی چلے آئے تھے ہم دونوں نے تمہیں سول کورٹ' ہائی کورٹ اور سیشن کورٹ حتیٰ کہ کینٹین تک میں دیکھ لیا لیکن تم کہیں نظر نہ آئے۔'' استاد پیارے چہکتے ہوئے بولے۔

''بھئی میں یہ کیا سن رہا ہوں تم نے بھی استاد پیارے کی طرح باہر ہی باہر پیدا شروع کردی ہے۔'' نعیم قریشی نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''نعیم بھائی غداری نہیں چلے گی۔'' استاد پیارے چونکے۔

''کیوں میں نے کیا کردیا۔'' نعیم قریشی نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

''یعنی جیسے یہ بات ہی نہیں ہے تم نے مجھ پر باہر ہی باہر پیدا کرنے کا الزام لگا دیا حالانکہ میں صبح سے تمہارے ساتھ کورٹ میں گھوم رہا ہوں۔'' استاد پیارے نے برا سا منہ بنایا۔

''ارے بھئی جیسے تم خلیل جبار سے مذاق کررہے ہو میں نے بھی تم سے دل لگی کرنے کو یہ بات کہہ دی۔'' نعیم قریشی نے بات بنائی۔

''میں یہ بات بالکل گوارا نہیں کروں گا کہ نعیم

قریشی مجھ سے غداری کریں۔''

''اچھا بھئی آئندہ ایسا نہیں ہوگا اب خوش۔'' نعیم قریشی نے بات بنائی۔

''یہ خلیل جبار آج اتنا خاموش کیوں ہے۔''

''ارے ہاں آج یہ بڑا فکرمند اور اداس دکھائی دے رہا ہے۔'' استاد پیارے نے میری طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''استاد پیارے بات ہی ایسی ہے گزشتہ دنوں تم نے اخبارات میں ایک خبر پڑھی ہوگی کہ ایک لاش پولیس کو ملی تھی جو کئی ٹکڑوں پر مشتمل تھی اور لاش کا ہر ٹکڑا مختلف مقامات سے ملا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں ہاں ان دنوں ہر زبان پہ یہی بات ہے لیکن تم اس خبر پر اس قدر پریشان کیوں ہو؟'' استاد پیارے نے کہا۔

''مرنے والا میرا ہم جماعت رہ چکا ہے۔ پولیس نے لاش کے ٹکڑے مکمل ہوجانے پر اس کا پوسٹ مارٹم کرکے کل ورثاء کے حوالے کردی تھی اور آج صبح ہی صبح اس لاش کی تدفین کردی گئی ہے' میں بھی اس جنازے میں موجود تھا' مرنے والے کلیم کی والدہ دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھی مجھ سے ان کا رونا دیکھا نہیں جارہا تھا۔'' میں نے بتایا۔

''ہاں واقعی بوڑھی ماں کے لیے جوان اولاد کا یوں چلے جانا بڑی تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔'' نعیم قریشی نے کہا۔

''تمہارا دوست کیا کرتا تھا' کیا کسی شادی شدہ عورت سے موبائل پر دوستی وغیرہ تو نہیں تھی۔'' استاد پیارے نے پوچھا۔

''وہ بے چارہ بہت شریف انسان تھا' ان چکروں سے بہت دور تھا۔'' میں نے کہا۔

''پھر اس کا قتل کیوں ہوگیا' تمہارے دوست کا قتل اپنے پیچھے کئی سوال چھوڑ گیا ہے۔ جب تک ان سوالوں کے جواب کی تہہ تک ہم پہنچ نہیں جاتے معاملہ جوں کا توں رہے گا۔''

''میرے دوست کا بچپن سے ایک ہی شوق تھا' اس نے پیدا ہوتے ہی غربت بہت دیکھی تھی' وہ اپنے بوڑھے والدین کے لیے خوشیاں خریدنا چاہتا تھا' کئی بار اس نے باہر ممالک میں جاکر دولت کمانے کی بھرپور کوشش کی لیکن کوئی ایسا شخص نہیں مل سکا جو کلیم کی یہ خواہش پوری کرسکے۔ بڑی مشکل سے وہ ایجوکیشن میں پرائمری ٹیچر بن گیا تھا مگر وہ اس نوکری سے مطمئن نہیں تھا امیر بننے کے لیے شارٹ کٹ کی تلاش میں رہتا تھا۔''

''شارٹ کٹ کے چکر میں تمہارے دوست نے بڑے دھوکے کھائے ہوں گے' میرا کزن فرشاد بھی انہی چکروں میں رہتا ہے اکثر وہ دھوکے کھانے کے باوجود ان چکروں سے نجات حاصل نہیں کرسکا' ابھی تازہ ترین اس کا واقعہ تمہیں سناتا ہوں' فرشاد کا ایک دوست عبدالغفور شیخ ہے' جس کی نیو کلاتھ مارکیٹ میں کپڑے کی دکان ہے۔ اس نے فرشاد کو یہ لالچ دیا کہ وہ اپنی تنخواہ ایڈوانس لے کر اسے دے دے۔ عید کا موسم ہے' دو لاکھ کے چار لاکھ روپے بن جائیں گے۔ دونوں بھائی آدھا آدھا منافع آپس میں تقسیم کرلیں گے' اس نے عبدالغفور شیخ کی باتوں میں آکر اپنی پندرہ ماہ کی ایڈوانس تنخواہ بینک سے نکلوا کر دے دی' چاند رات کے بعد عید بھی گزر گئی' بقر عید بھی چلی گئی لیکن وہ پیسے دینے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ جب میں نے اسے سخت رویہ اپنانے کو کہا تو فرشاد نے وہی کیا' جس پر عبدالغفور شیخ گھبراتے ہوئے بولا۔

''یار میں نے اس امید پر اپنی دکان میں مال اسٹاک کیا تھا کہ خوب کام چلے گا اور خوب دولت

WWW.PAKSOCIETY.COM

آئے گا لیکن مال ہی نہیں بکا' میں تمہیں کہاں سے رقم اور منافع دوں۔ سوچ رہا ہوں کسی طرح یہ مال بک جائے تو کم از کم تمہاری اصل رقم ہی دے دوں۔''

''میں نے تمہارے کہنے پر بینک سے ایڈوانس تنخواہ نکلوا کر دو لاکھ روپے دیئے تھے۔ اس رقم پر سود بھی ہر ماہ میری تنخواہ سے کٹ رہا ہے۔ اس کام میں مجھے نقصان ہی ہو رہا ہے' فائدہ کچھ بھی نہیں ہوا۔'' فرشاد نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے تم جس اذیت سے گزر رہے ہو' ہر ماہ تنخواہ سے کٹوتی ہونے پر گھر کے خرچ میں تکلیف ہو رہی ہوگی' تنخواہ میں پورا نہ ہونے پر بیگم کے طعنے بھی سننے کو ملتے ہوں گے' میں بھی مجبور ہوں ہم دکان دار اس آسرے پر دکان میں مال بھر لیتے ہیں کہ کچھ آمدنی ہو تو اپنے بیوی بچوں کے لیے پیسے لے کر جائیں۔ ایک طرح سے یہ ایک رسک ہوتا ہے' دیکھ لو تمہارے پیسوں سے خریدا ہوا مال ایسا کا ایسا ہی پڑا ہے۔ دعا کرو کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ یہ مال فروخت ہو جائے۔''

''مال تم نے خریدا ہے سزا مجھے مل رہی ہے' یہ کون سی بات ہے۔'' فرشاد نے جھلاتے ہوئے کہا۔

فرشاد کے شور کرنے پر ارد گرد کے دکان دار بھی جمع ہو گئے۔

''اچھا اب ایسی باتیں ہوں گی اگر یہ مال بک جاتا تو تم کون سا منافع مجھ پر چھوڑ دیتے' زیادہ شور شرابہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' دکانداروں کو جمع ہوتا دیکھ کر عبدالغفور شیخ بھی زبان درازی پر اتر آیا۔

''میں کچھ نہیں جانتا مجھے پیسے چاہئیں۔'' فرشاد نے کہا۔

''میاں اپنا لہجہ درست کرو ورنہ کچھ بھی نہیں ملے گا۔''

''ایسے کیسے نہیں ملے گا حرام کے پیسے نہیں تھے میرے۔'' فرشاد بھی اسی کے انداز میں بات کر رہا تھا۔

''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تم نے مجھے رقم دی ہے۔'' اس نے کہا۔

فرشاد کو اس سے ایسی قطعی امید نہ تھی کہ وہ بدل جائے گا۔ انہیں دکان داروں میں فرشاد کا ایک دوست عبدالرشید بھی تھا۔ وہ بات بڑھتی دیکھ کر اسے اپنی دکان پر لے گیا اور فرشاد کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

''تم عبدالغفور کو نہیں جانتے' اسے کوئی بھی دکان دار ادھار مال نہیں دیتا کیونکہ یہ نیت کا اچھا آدمی نہیں ہے' اس لیے جب بھی دکان میں مال کی ضرورت پڑتی ہے مختلف لوگوں کو منافع کا لالچ دے کر رقم لے کر دکان میں مال بھر لیتا ہے۔''

''یہ منافع کا لالچ کیوں دیتا ہے انسان ویسے ہی رقم ادھار مانگ لے۔'' فرشاد نے کہا۔

''اس طرح کون اتنی بڑی رقم دے گا تمہیں اس نے لالچ دیا اور تم نے رقم دے دی' ایمان داری سے بتاؤ کہ تم اتنی بڑی رقم منافع کے لالچ کے بغیر عبدالغفور شیخ کو دے سکتے تھے۔'' عبدالرشید نے کہا۔

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن اب اس کا حل کیا ہوگا' یہ میرے شور کرنے پر رقم لینے سے انکاری ہو رہا ہے۔'' فرشاد نے کہا۔

''ہم مارکیٹ میں بیٹھے ہیں ہم اس کی ساری کمزوریوں سے واقف ہیں' یہ یک مشت تمہیں رقم نہیں دے گا' ہم دکان داروں کے درمیان میں آنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ وہ تمہاری اصل رقم ہر ماہ قسط کی صورت میں دیتا رہے گا۔ منافع کو تمہیں بھولنا پڑے گا۔''

''عبدالغفور کے پاس چکر لگا کر مجھے اندازہ ہو گیا

تھا وہ میری رقم سے خریدے مال کا منافع اکیلے ہی ہڑپ کرے گا۔ اس لیے مال بیچنے کی بجائے ایک طرف رکھا ہوا ہے' تم میری اصل رقم کی قسط بندھوا دو۔'' فرشاد نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

فرشاد کی آمادگی پر دکان داروں نے بیچ میں پڑ کر قسط بندی کرادی' دو ماہ کی فرشاد کو اصل رقم کی قسطیں مل چکی ہیں۔ درمیان میں وقفے وقفے سے دو قسطوں میں گیپ بھی آ گیا لیکن اصل رقم مل ہی جائے گی۔'' نعیم قریشی نے بتایا۔

''نعیم بھائی تم بالکل درست کہہ رہے ہو' میرے کزن تسلیم کے ساتھ بھی ایسا ہو چکا ہے۔ اسے بھی نثار پرنٹنگ پریس والے کے برادر نسبتی عبدالقیوم نے مختلف لوگوں سے مرغی کے کاروبار میں پیسہ لگانے کے لیے رقمیں لیں اور کئی لوگوں کو منافع بھی دیا۔ تسلیم بھی ان کے چکر میں آ گیا' اس نے اپنی ریٹائرمنٹ کی رقم زیادہ منافع کے چکر میں اسے دے دی۔ عبدالقیوم ٹھیک ٹھاک رقم جمع ہونے پر فرار ہو گیا۔ لوگ نثار پرنٹنگ والے کو آخر پکڑ رہے ہیں کہ ہمیں پیسے دلاؤ عبدالقیوم تمہارا برادر نسبتی ہے۔ وہ بے چارہ مفت میں لوگوں کی دھمکیاں سن کر بھی خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے کیوں کہ لوگوں نے اپنی رقمیں عبدالقیوم کو اس کے پریس پر دی تھیں۔

''جو لوگ محنت سے جی چرانے کے عادی ہوتے ہیں وہ اس طرح کے شارٹ کٹ تلاش کرتے اور زیادہ منافع حاصل کرنے میں اپنی اصل رقم بھی گنوا بیٹھتے ہیں' بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اصل رقم مل جائے۔'' نعیم قریشی نے کہا۔

''میں آپ دونوں کی بات سے اتفاق کرتا ہوں واقعی یہی بات تھی' میرا دوست اس طرح کے چکر میں اپنی رقمیں پھنساتا رہتا تھا۔ محنت کرنے کی اسے عادت نہیں تھی۔ اسکول سے آ کر وہ سارا دن گھر میں پڑا رہتا تھا' اس کا جسم بھی گیند کی طرح پھولتا جا رہا تھا لیکن اسے اپنی صحت کی بالکل بھی فکر نہیں تھی۔''

''خلیل جبار اس طرح اداس ہونے سے کام نہیں چلے گا۔'' استاد پیارے کی رگ ظرافت پھڑکی۔

''پھر کیسے کام چلے گا۔'' میں نا سمجھتے ہوئے بولا۔

''ہر کام طریقے سے ہوگا' تمہارا دوست دنیا سے چلا گیا ہے اور اس کا قاتل یوں دنیا میں دندناتا پھرے یہ استاد پیارے سے برداشت نہیں ہوگا۔''

''میں کیا کروں؟''

''تم بہت کچھ کر سکتے ہو' یہ استاد پیارے ہی تمہیں بتائیں گے۔'' نعیم قریشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نعیم بھائی میں بہت سنجیدہ ہوں۔''

''میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم غیر سنجیدہ ہو۔'' نعیم قریشی نے کہا۔

''خلیل جبار تم سب سے پہلے یہ کرو کہ اپنے دوست کے گھر جا کر اس کے والدین سے ملاقات کرو اور بات چیت کر کے یہ سراغ لگاؤ کہ ان دنوں وہ کیا کام کر رہا تھا۔ کن کن لوگوں سے اس کی ملاقاتیں ہو رہی تھیں' ان کی باتوں سے ہی کچھ سراغ مل سکتا ہے اور ہم قاتل تک پہنچ سکتے ہیں۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں کل صبح ان سے ملاقات کرتے ہوئے کورٹ آؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''بات چیت کرنا پولیس کی طرح تفتیش مت کرنا' مجھے تمہارے بارے میں بڑی شکائتیں موصول ہو رہی ہیں۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''کیا...... میرے بارے میں شکائتیں موصول ہو رہی ہیں؟'' میں چونکا۔

''خلیل جبار یہ استاد پیارے تمہارے بارے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیا کہہ رہے ہیں۔" نعیم قریشی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کس نے شکایت کی ہے میرے بارے میں؟" میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"تمہارے علاقے پنجرہ پول کے کچھ لوگ مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے کہ یہ بندہ کون ہے، جو مشکوک انداز میں چلتا رہتا ہے اور لوگوں کو دیکھتا ہے، میں نے انہیں بڑے پیار سے سمجھایا کہ خلیل جبار بڑا شریف انسان ہے ہمارا صحافی بھائی ہے۔ جس پر وہ خاموش ہوگئے۔" استاد پیارے نے کہا۔

"استاد پیارے سے اور کچھ نہ پوچھنا ورنہ پھر کوئی کہانی سنادے گا۔" نعیم قریشی نے میرے قریب ہوتے ہوئے کان میں کہا۔

استاد پیارے سے نعیم قریشی کی یہ حرکت چھپی نہ رہ سکی۔

"نعیم بھائی یہ مجھے یہ عورتوں کی طرح کانا پھوسی بالکل بھی پسند نہیں ہے، میرے ہوتے ہوئے ایسی حرکت مت کیا کرو۔" استاد پیارے نے کہا۔

نعیم قریشی نے بہتری اسی میں جانی کہ خاموش رہا جائے ورنہ استاد پیارے کی زبان چلتی ہے تو پھر اسے روکنا مشکل ہوجاتا ہے۔

اگلے دن سوئم میں میری کلیم کے والد سلیم سے ملاقات ہوئی۔ کلیم کے بارے میں معلومات کرنے پر وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر ادھر اُدھر دیکھنے پر کوئی ان کے قریب ہے، مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"تم سے کیا چھپانا بیٹا! تمہارے دوست کلیم کو ان دنوں نا جانے کیا ہوگیا تھا کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ رات رات بھر موبائل پر کسی لڑکی سے باتیں کرتا رہتا تھا، ہمارے سمجھانے پر غصہ ہوجاتا تھا کئی کئی دن بات نہیں کرتا تھا۔ زمانہ خراب چل رہا ہے والدین اپنی اولاد کو سمجھاتے مگر کلیم کو ہمارا سمجھانا بہت بُرا لگتا تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی نے اس خوف سے جوان اولاد ہے ہمارے سمجھانے پر کہیں ناراض ہوکر گھر سے نہ چلا جائے خاموشی اختیار کرلی تھی، گھر سے غائب ہونے سے چند دن قبل وہ اپنی ماں سے بڑی عجیب عجیب باتیں کررہا تھا۔"

"کس قسم کی باتیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنی ماں سے یہی کہتا تھا کہ ماں تجھے اب گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، تُو نے بہت غربت کے دن گزار لیے، ہم اب اس گندے اور بدبودار علاقے میں نہیں رہیں گے، یہ علاقہ ہم جیسے لوگوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔"

"کلیم بیٹے پھر ہم کہاں رہیں گے۔" ماں نے پوچھا۔

"ڈیفنس...... ڈیفنس کے علاقے میں کسی خوب صورت بنگلے میں رہیں گے۔"

"اتنے پیسے ہم کہاں سے لائیں گے؟" ماں نے پوچھا۔

"تمہاری آنے والی بہو بھی ڈیفنس میں رہتی ہے۔ ڈیفنس والوں سے رشتہ داری کرنے کے لیے ہمارا ڈیفنس میں رہنا بہت ضروری ہے۔"

"یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کررہے ہو، میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"تیری سمجھ میں یہ بات کیسے آئے گی تُو نے ساری زندگی غربت میں گزاری ہے۔ ابا نے بھی تجھے کوئی سکھ نہیں دیا لیکن میرا تجھ سے وعدہ ہے میں تجھے سکھ دوں گا، محل نما بنگلے میں رکھوں گا، تیری ہونے والی بہو نے مجھے ترقی کا راستہ دکھایا ہے۔ اسی نے مجھے ایک ایسے عامل کا پتا دیا تھا جو رقم کو اپنے عمل سے دوگنا

کردیتا ہے، یہ دیکھ میں پچاس ہزار روپے کی رقم لے کر گیا تھا، اس نے ڈبل کرکے ایک لاکھ روپے کردی ہے۔ کل میں جب اس کے پاس جاؤں گا وہ ایک لاکھ روپے کے دو لاکھ روپے کردے گا اور ہاں اس عامل نے مجھے بتایا ہے کہ اگر میں پرائز بانڈ لے کر جاؤں تو وہ ان پرائز بانڈ پر ایسی پڑھائی کرے گا کہ بیٹھے بٹھائے میرا پہلا انعام نکل آئے گا اور میں کروڑ پتی بن جاؤں گا۔" کلیم نے کہا۔

"میرے بیٹے تجھے کیا ہوگیا ہے ہوش سے کام لے اس طرح لوگ جعلی عاملوں کے پاس جانے سے کروڑ پتی ہونے لگیں تو پھر انہیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے، ایسے ہی پرائز بانڈ پر دم کراکے رقم حاصل کرتے رہیں اور اس لڑکی سے ہوشیار رہ کہیں تجھے پھنسا نہ دے۔" ماں نے کہا۔

"یہ کیسی باتیں کررہی ہے ماں! یہ دیکھ پچاس ہزار کے ایک لاکھ روپے کردیئے ہیں عامل بابا نے۔" کلیم نے نوٹوں کی گڈی دکھاتے ہوئے کہا۔

ماں کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسے اسے سمجھائے اور بیٹا بھی کسی صورت سمجھنے کو تیار نہ تھا، اس لیے وہ خاموش ہوگئی۔

گھر سے غائب ہونے والے دن کلیم کے پاس تین لاکھ روپے مالیت کے کئی بانڈ تھے جو وہ عامل بابا کے پاس دم کرانے گیا لیکن رات گئے تک کلیم گھر نہ لوٹا۔ تھانے میں بھی اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوائی گئی اس کا رزلٹ نہیں نکلا۔ لاش بھی اس طرح ملی کہ جسم کا دھڑ کہیں، سر کہیں، ہاتھ پیر کہیں سے ملے۔" یہ کہتے ہوئے وہ رو پڑے۔

"انکل حوصلے سے کام لیں جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔" میں نے انہیں سمجھایا۔

"کس طرح حوصلہ کروں میرا اکلوتا بیٹا قتل ہوگیا ہے اب کس کی خاطر ہم بوڑھے میاں بیوی جئیں گے۔"

"کلیم کا قاتل ابھی زندہ ہے اسے سزا دلانی ہے تاکہ دوسروں کے بیٹے قتل ہونے سے بچ جائیں۔" میں نے کہا۔

"کلیم کے قاتل کو پولیس ہی گرفتار نہ کرسکی پھر ہم اسے کیسے سزا دلا سکتے ہیں۔"

"کلیم جس لڑکی سے موبائل پر بات کرتا تھا اس لڑکی اور عامل تک پہنچنا ہے، جبھی ہم قاتل تک پہنچ سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہم نے کبھی ان کے بارے میں پوچھا ہی نہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"کلیم جس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرتا تھا ہمیں شک تھا کہ وہ کچھ کچھ پاگل پن کی حد تک پہنچ گیا ہے جبھی اسی طرح کی باتیں کرتا ہے اس کی باتوں کو سنجیدگی سے لیتے تو ہم ان کے نام اور پتے ضرور معلوم کرتے۔" انکل نے بتایا۔

"انکل ہوسکتا ہے کہ کلیم نے عامل بابا یا اس لڑکی کا نمبر کسی کتاب یا کاپی پر لکھ رکھا ہو۔" میں نے کہا۔

"بیٹا سچ پوچھو ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے تم خود ہی گھر میں اس کی کاپی کتابیں چیک کرلو۔" انکل نے کہا۔

میں کلیم کے ساتھ اکثر اس کے کمرے میں ہی بیٹھتا تھا۔ اس لیے مجھے اندازہ تھا کہ وہ اپنی کون سی چیز کہاں رکھتا ہے، کچھ دیر تلاش کرنے پر مجھے وہ ڈائری مل گئی جس میں وہ نمبر لکھتا تھا۔ اس میں صرف ایک نائلہ نامی لڑکی کا نام اور نمبر مل سکا۔ باقی سب اس کے دوستوں کے نمبر تھے جنہیں میں جانتا تھا، میں نے نمبر اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا اور چلا آیا۔ استاد پیارے اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

نعیم قریشی کورٹ میں میرے منتظر تھے‘ جب میں نے انہیں یہ باتیں بتائیں‘ استاد پیارے کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔
”اس لڑکی کے نمبر سے ہی ہم اس جعلی عامل تک پہنچ سکتے ہیں یہ کام اتنا آسان نہیں کیونکہ......“
”ہر کام طریقے سے ہوگا۔“ میں نے ان کا جملہ پورا کردیا۔
”میرا مطلب ہے تمہیں ایک عاشق بن کر اس لڑکی سے بات کرنا ہوگی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو نمبر لڑکی کا ہے وہ کوئی اور لڑکی بھی ہوسکتی ہے‘ ہمیں طریقے سے کلیم کے متعلق راز اگلوانا ہے۔“ استاد پیارے نے کہا۔
”جیسا آپ کہیں‘ ہم وہی کریں گے۔“ میں نے کہا۔
کورٹ رپورٹنگ سے فارغ ہوکر میں نے خبریں بنائیں اور دفتر جاکر دے دیں پھر میں نے استاد پیارے کی ہدایت پر عمل کیا اور ایک ویران سے ہوٹل میں جاکر بیٹھ گیا۔ ہوٹل میں اِکا دُکا گاہک بیٹھے نظر آرہے تھے‘ میں ان سے دور ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ ہوٹل آنے سے پہلے میں نے چند محبت بھرے ایس ایم ایس کردیئے تھے۔ ان کا مجھے ابھی رسپانس نہیں ملا تھا لیکن اتنا مجھے یقین تھا کہ وہ میری کال ضرور اٹینڈ کرلے گی۔ میری پہلی کوشش میں ہی اس نے کال اٹینڈ کرلی۔
”جی فرمائیے۔“ اس کی شوخ آواز میری کانوں کی سماعت سے ٹکرائی۔
”میں نے کچھ......“
”ایس ایم ایس بھیجے تھے وہ پڑھ لیے یہی کہنا چاہ رہے ہیں نا۔“ اس نے مجھ سے پہلے ہی جملہ مکمل کردیا۔
”ہاں یہی کہنا چاہ رہا تھا۔“ میں نے کہا۔
”کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ میرا نمبر کس نے دیا ہے۔“ اس نے پوچھا۔
”یہ نمبر کسی نے مجھے دیا نہیں ہے ایسے ہی اندازے سے کیا تھا۔“ میں نے بات بنائی۔
”یہ نمبر کسی مرد کا بھی ہوسکتا تھا پھر تم کیا کرتے۔“ وہ شوخی سے بولی۔
”میں معذرت کرلیتا کہ نمبر غلطی سے مل گیا ہے۔“
”تمہاری باتوں سے اندازہ ہورہا ہے تم پورے کھلاڑی ہو۔“
”ہم کھلاڑی کہاں جس لڑکی سے بھی دوستی ہوتی ہے اس کی کہیں شادی ہوجاتی ہے۔“ میں نے ایک سرد آہ بھرنے کی ایکٹنگ کی۔
”پھر میں بھی امید رکھوں۔“
”کس بات کی؟“ میں چونکا۔
”تم نے مجھ سے دوستی کے لیے پہل کردی ہے تم سے دوستی ہونے کا مطلب یہی ہے کہ میری بھی کہیں شادی ہونے والی ہے۔“ وہ زور سے قہقہہ مارتے ہوئے بولی۔
”ایسا غضب نہ کریں‘ آج ہی بات ہوئی ہے اور شادی کسی اور سے کرنے کی بات کررہی ہو۔“
”یہ بات میں نہیں تم ہی کہہ رہے ہو‘ جس لڑکی سے بھی تمہاری دوستی ہوتی ہے‘ اس کی شادی ہوجاتی ہے۔“
”تم شادی سے انکار بھی کرسکتی ہو‘ پہلے مجھ سے ملاقات کرلو پھر فیصلہ کرلینا کہ تمہاری شادی کس سے بہتر رہے گی۔“ میں نے کہا۔
”کیا تمہارے خاندان یا برادری میں کوئی ایسی لڑکی نہیں ہے جو تم سے شادی پر آمادہ ہوجائے۔“ وہ

ہنستے ہوئے بولی۔
”یہ کیا بات کردی تم نے ہمارے خاندان میں سب ہی لڑکیوں کی شادی ہوچکی ہے‘ میں برادری میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔ دراصل میں چاہتا ہوں جس لڑکی سے میری ذہنی ہم آہنگی ہو اس سے شادی کروں۔“ میں نے کہا۔
”اچھا یہ بات ہے یہ ہمارے نوجوانوں کا بڑا المیہ ہے کہ وہ اپنی شادی اس سے کرنا چاہتے ہیں جو ان کی ہم ذہن ہو لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ دولت کے سامنے کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے‘ دولت کی ریل پیل مسائل کو جنم لینے سے پہلے ہی ختم کردیتی ہے۔“
”میں سمجھا نہیں ذہنی ہم آہنگی سے دولت کا کیا تعلق۔“ میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔
”بہت گہرا تعلق ہے جہاں غربت ہوتی ہے وہاں میاں بیوی میں بہت لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں اور جن گھروں میں دولت ہوتی ہے وہاں میاں بیوی میں جھگڑے نہیں ہوتے۔ بیویاں خوش خوش شوہر کے ساتھ زندگیاں گزار دیتی ہیں۔“ وہ بولی۔
نائلہ کی باتوں سے اندازہ ہورہا تھا۔ یہ وہی لڑکی ہے لیکن میں اس پر فوری طور پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے استاد پیارے کی ہدایت پر پورا عمل کرنا تھا۔ میں اصل موضوع پر فوری نہیں آنا چاہتا تھا‘ دو چار ملاقاتیں کرکے ہی اصل بات پر آنا تھا۔ ورنہ وہ ہوشیار ہوجاتی‘ میں نے ادھر اُدھر کی باتیں کرکے کال ڈس کنیکٹ کردی۔ دوسرے روز استاد پیارے کو میں نے پوری بات بتادی جس پر وہ خوش ہوگیا۔
”خلیل جبار تمہیں چند دن اور اس سے باتیں کرنا ہیں اور ضد کرنی ہے کہ ایک بار مجھ سے ملاقات کرکے مجھے دیکھ لو‘ تم نے مجھے پسند کرلیا تو میرے دل کو قرار آجائے گا۔“
”ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔“ میں نے کہا۔
ایک ہفتہ نائلہ سے گفتگو کرنے سے وہ مجھ سے ملاقات کرنے پر تیار ہوگئی۔ اس نے مجھے اپنا نام ثریا بتایا تھا۔ ہوٹل چائنیز میں ملاقات کا پروگرام طے ہوا۔ میں مقررہ وقت پر چائنیز ہوٹل میں موجود تھا‘ استاد پیارے بھی مقررہ وقت سے پہلے ہی ہوٹل میں موجود تھے۔ میں ان سے ذرا ہٹ کر ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا‘ کچھ دیر بعد ایک خوب صورت دوشیزہ جو میک اپ میں بالکل گڑیا سی لگ رہی تھی‘ میرے نزدیک آکر اس نے میرے موبائل پر کال دی‘ میرے موبائل کی بیل بجتے پر وہ مسکراتے ہوئے میری ٹیبل پر چلی آئی۔
”تم ندیم ہی ہونا۔“
میں نے اسے اصلی نام کی بجائے فرضی نام بتایا تھا۔
”جی ہاں تمہاری کال بھی میرے موبائل پر آگئی ہے۔“ میں نے اپنا موبائل اسے دکھایا۔
میرے موبائل پر اسی نمبر جگمگا رہا تھا۔ وہ مطمئن ہوکر بیٹھ گئی‘ میں نے اس کے لیے کولڈ ڈرنک کا آرڈر دے دیا۔
”کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی یہاں پہنچنے میں۔“
”نہیں اپنا شہر ہے یہاں آنے میں مجھے پریشانی کیوں ہوگی۔“ وہ بولی۔
”ہاں یہ بات تو ہے اپنا شہر ہے یہاں کیا پریشانی ہوگی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
کولڈ ڈرنک آچکی تھی‘ وہ کولڈ ڈرنک پیتی جارہی تھی اور مسکراتے ہوئے مجھے دیکھتی جارہی تھی۔
”کیسا لگ رہا ہوں۔“
”غنیمت ہو۔“ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔
”بس غنیمت؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیکھا۔
"اگر تم لڑکی ہوتے تو میں تمہاری شان میں شاعری میں بہت کچھ کہہ جاتی۔"
"کیا خواتین مردوں کی تعریف میں کچھ نہیں کہہ سکتیں اتنی کنجوسی بھی اچھی نہیں ہوتی کسی کا دل رکھنے کے لیے دو چار شعر کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں۔" میں نے کہا۔
"کاش میں ایسا کرسکتی....." یہ کہتے ہوئے وہ خاموش ہوگئی۔
"کاش کیوں؟"
"اس لیے کہ مجھے شاعری نہیں آتی۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔
"اچھا یہ بات ہے چلیں چھوڑیں شاعری کو یہ بتائیں کہ مجھ سے شادی کروگی۔"
"بہت جلدی میں ہو ابھی ہماری دوستی کو ایک ہفتہ ہی ہوا ہے ذرا ایک دوسرے کو سمجھ لیں پھر شادی کا بھی سوچ لیں گے۔" ثریا نے کہا۔
"میں اپنی قسمت سے بہت ڈرتا ہوں اس لیے جلدی کررہا ہوں شادی کی بات پکی ہوجائے پھر ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جان لیں گے۔"
"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے موبائل پر تم نے مجھ سے کہا تھا کہ جس کے ساتھ تمہاری ہم آہنگی ہوگی اس سے شادی کروگے اور اب شادی کی بات پکی کرنے کی بات کررہے ہو ذرا حوصلے سے کام لو۔ شادی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں پھر شادی کی بات بھی طے ہوجائے گی۔" ثریا نے کہا۔
"اچھا جیسے تمہاری مرضی تم جیسا کہو گی وہی ہوگا۔" میں نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
"ندیم دیکھو میری بات کا برا نہیں ماننا۔ تم مجھ سے شادی کی خواہش رکھتے ہوئے یہ اچھی بات ہے شادی کرلینا آسان ہوتا ہے شادی نبھانا بہت مشکل کام ہے۔"
"ہاں میں یہ بات بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"
"تم نے مجھے بتایا ہے کہ تمہاری پرائیوٹ ادارے میں نوکری ہے جہاں سے تمہیں پانچ ہزار روپے ماہانہ ملتے ہیں کیا ہمارا اتنا روپوں میں گزارا ہوجائے گا۔"
"اس مہنگائی کے دور میں واقعی پانچ ہزار کی رقم کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ہم اپنی فیملی کے ساتھ رہ کر گزارا کرسکتے ہیں۔ میرے بھائیوں کی آمدنی بہت ہے۔" میں نے کہا۔
"کیا تمہارے بھائیوں کی بیویاں یہ گوارہ کریں گی کہ تم گھر میں کم رقم دو وہ زیادہ دیں کم آمدنی ہونے پر لازمی گھر میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر عورتیں جھگڑا کرتی ہیں۔ لڑنے کو گویا انہیں بہانے چاہیے ہوتے ہیں۔"
"میں مانتا ہوں ایسا ہوتا ہے میں شادی کے بعد الگ سے پارٹ ٹائم بھی کچھ کرتا رہوں گا۔ کوشش کروں گا کہ میرے آمدنی کے ذرائع زیادہ ہوجائیں بھائیوں کے برابر نہیں تو کم از کم ان کی آمدنی کے قریب قریب ہوجائے۔"
"ندیم تم بہت ہی بھولے ہو جو تم کہہ رہے ہو یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اس میں بہت وقت لگے گا شادی کے بعد ویسے ہی خرچے بڑھ جاتے ہیں تمہیں جو کچھ کرنا ہے شادی سے پہلے کرنا ہے تاکہ وہ مسائل نہ ہوں جو شادی کے بعد شروع ہوجاتے ہیں۔" ثریا نے کہا۔
"پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔
"تم مرد ہو یہ باتیں سوچنا مردوں کا کام ہے۔"

"میں ایک عرصے سے آمدنی کے ذرائع بڑھانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"
"سوچنے سے نہیں عمل کرنے سے آمدنی کے ذرائع بڑھتے ہیں اپنے دوستوں سے مشورے کرو۔" ثریا نے کہا۔
"اپنے دوستوں سے مشورے کروں وہ خود بے چارے شادی کرکے پھنس گئے ہیں۔"
"اور تم بھی ان بے چاروں کی صف میں شامل ہونا چاہتے ہو۔" وہ ہنستے ہوئے بولی اسے مسکراتا دیکھ کر میں بھی مسکرادیا۔
"تم بھی اس بات پر غور کرو اور میں بھی غور کرتی ہوں کیونکہ غور وفکر سے راستے نکلتے ہیں۔" ثریا نے کہا۔
وہ بہت ہوشیار تھی اس لیے اصل موضوع پر نہیں آرہی تھی۔ مجھ سے کہلوانا چاہتی تھی اور میں یہ تہیہ کرچکا تھا کہ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہوں گا ورنہ اصل حقیقت کی طرف آنا مشکل ہوسکتا تھا وہ مجھ سے ہوشیار ہوجاتی اور رابطہ منقطع کردیتی۔
میں نے ٹیبل سے اٹھنے سے قبل استاد پیارے کو سگنل دے دیا تھا۔ اس لیے وہ ہم سے پہلے ہی ہوٹل سے نکل گیا تھا۔ باہر نکل کر میں نے ثریا کو رکشہ میں بٹھا کر رخصت کردیا۔ میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں استاد پیارے کا نام ونشان نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا استاد پیارے اس وقت حیدر چوک کے نزدیک شاہ دربار ہوٹل میں ہوگا۔ اس لیے میں وہیں چل دیا لیکن وہاں بھی وہ موجود نہ تھے میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ موبائل پر کال کرکے استاد پیارے سے پوچھوں وہ اس وقت کہاں ہے میرے موبائل پر ان کی کال آگئی۔
"استاد پیارے تم کہاں ہو؟"
"میں رکشہ میں ہوں اور نائلہ عرف ثریا کے رکشہ کا پیچھا کررہا ہوں تمہارے پاس اگر وقت ہے تو شاہ دربار ہوٹل پر میرا انتظار کرو اور اگر وقت نہیں ہے تو بے شک چلے جاؤ کل کورٹ میں ملاقات کرلیں گے۔" استاد پیارے نے کہا۔
"ٹھیک ہے کل کورٹ میں ملاقات ہوگی۔" میں نے یہ کہتے ہوئے کال آف کردی۔
دوسرے دن ملاقات پر استاد پیارے نے مجھے بتایا کہ وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے فلیٹ دیکھ آیا ہے دو چار دن میں وہاں رہنے والوں سے نائلہ عرف ثریا کے بارے میں معلومات حاصل کرلے گا۔
دو ہفتے اور گزر گئے وہ اپنے اصل موضوع پر نہیں آرہی تھی۔ موبائل پر روزانہ رابطہ تھا ہر دو دن چھوڑ کر ہماری ملاقاتیں بھی ہورہی تھیں۔ ایک ماہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر ایک دن وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے یہ کام مشکل بھی نہیں ہے تم ایسا کیوں نہیں کرلیتے کہ پرائز بانڈ خریدلو۔"
"یہ کام میں بہت کرچکا ہوں میری قسمت ایسی نہیں کہ بانڈ لگ جائے اس لیے میں نے بانڈ خریدنا ہی ختم کردیئے۔" میں نے کہا۔
"جس طرح میں کہہ رہی ہوں وہ کرو تمہاری قسمت کھل جائے گی۔"
"کیا واقعی؟" میں نے چونکنے کی ایکٹنگ کی۔
"تم ایسا کرو کہیں سے دو لاکھ روپے کا انتظام کرلو پھر میرے ساتھ چلنا میں تمہیں ایک بابا کے پاس لے چلوں گی وہ ان بانڈز پر کچھ عمل کرے گا تو ان پرائز بونڈ کا کھل جانا یقینی ہوگا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ٹھیک ہے میں تمہارے کہنے پر ایسا کرلیتا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے کہ پہلے میں بابا سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں تم اپنی تسلی کرلینا' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں دوسو روپے کی بانڈ والی گڈی خرید لوں تاکہ کم پیسے میں کام بن جائے۔"

"کیا ساری زندگی غریب رہنے کا ہی سوچا ہوا ہے۔" ثریا نے کہا۔

"کیوں اس میں غریب والی کون سی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"زیادہ رقم والی بانڈ کی گڈی لینے میں یہ فائدہ ہے کہ وہ زیادہ رقم کا انعام کھلے گا۔ تم اس رقم سے ذاتی مکان خرید سکتے ہو' اپنا کاروبار بھی شروع کرسکتے ہو۔" ثریا نے کہا۔

"اوہ! میرا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔" میں نے کہا۔

"انسان کو ہمیشہ اونچی سوچ رکھنی چاہیے ورنہ انسان پستی کی طرف جاتا ہے۔" ثریا نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم میری بابا سے کب ملاقات کرا رہی ہو؟"

"کل ملاقات کرلیتے ہیں صبح کے وقت۔ کیا تم صبح میں فارغ ہو؟"

"ہاں ہاں......" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے' ہم کل صبح گیارہ بجے بابا سے ملاقات کرنے چلیں گے۔" ثریا نے کہا۔

میں نائلہ عرف ثریا سے ملاقات کرکے استاد پیارے کے پاس شاہ دربار ہوٹل چلا گیا اور ملاقات کے بارے میں بتایا۔ استاد پیارے کی باچھیں کھل اٹھی تھیں۔

"تم نے بہت اچھا کام کردیا ہے جو کام استاد پیارے کو کرنا تھا وہ تم نے کردیا ہے۔ تم کل ضرور اس بابے کے پاس جانا میں تمہارا کچھ فاصلے سے پیچھا کرتا رہوں گا۔ ویسے میں نے نائلہ عرف ثریا کے بارے میں معلوم کرلیا ہے وہ فلیٹ میں اکیلی ہی رہتی ہے۔ کچھ مشکوک لوگ بھی اس کے پاس آتے جاتے ہیں۔" استاد پیارے نے کہا۔

دوسرے دن میں ثریا کے ساتھ اس بابا کے پاس پہنچ گیا۔ بابا فاروق کے چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی تھی مگر اس کے چہرے پر شیطانیت جھلک رہی تھی۔

"بابا میں نے آپ کی تعریف بہت سنی ہے کہ اپنے عمل سے لوگوں کو غریب سے امیر بنا دیتے ہو۔" میں نے اس کی تعریف کی۔

"مجھ میں اتنی طاقت کہاں ہے سب کام موکل اور پڑھائی سے ہوتا ہے۔" فاروق بابا نے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"میں پڑھائی کرتا ہوں جس سے موکل میرے قابو میں آ کر وہی کرتے ہیں جو میں کہتا ہوں۔ وہ بانڈ کے وہی نمبر مشین سے نکلواتے ہیں جو میں چاہتا ہوں۔"

"بابا کیا میرے علاوہ بھی کسی اور کے بونڈ نکلے ہیں؟"

"ہاں جبھی لوگ میرے پاس آتے ہیں کام نہ ہوتو پھر کون میرے پاس آئے گا۔" بابا مسکراتے ہوئے بولے۔

"بابا آپ اس طرح مشہور نہیں ہیں جیسے دوسرے اشتہارات دے کر شہرت حاصل کرلیتے ہیں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اشتہارات کی آڑ وہ لیتے ہیں جو جعلی عامل ہوتے ہیں اور لوگوں کو لوٹتے ہیں' میں یہ کام شہرت

کے لیے نہیں کرتا' اس آستانے کا کسی کو بھی نہیں پتا پھر بھی لوگ کسی نہ کسی حوالے سے میرے پاس کام کے سلسلے میں آتے رہتے ہیں اور وہ اس لیے آتے ہیں کہ ان کے کام ہوتے ہیں اور مجھے یہ شوق نہیں کہ لوگوں کی میرے آستانے پر بھیڑ لگی رہے۔"

"کلیم بھی تمہارے پاس بونڈ لے کر آیا تھا اس کی قسمت نہ کھل سکی۔ موت ضرور اسے آ گئی تھی کہیں تمہاری پڑھائی میں کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی تھی۔" میں نے کہا۔

کلیم کا نام سن کر فاروق بابا اور ثریا کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔

"کک...... کک...... کون کلیم؟" وہ بولے۔

"وہی کلیم جس کی لاش کئی ٹکڑوں میں پولیس کو ملی ہے۔"

"کون ہو تم؟" فاروق بابا غصے سے دہاڑے۔

"میں کون ہوں یہ سب تفصیل سے بتادوں گا' پہلے تم بتاؤ آخر کلیم کا کیا قصور تھا جو تم نے اسے قتل کرکے ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھینکا۔" میں نے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

"تم یہ سب باتیں کیسے جانتے ہو' کلیم تمہارا کیا لگتا ہے؟" فاروق بابا مسلسل غصے سے مجھے گھور رہے تھے۔

"کلیم میرا دوست تھا' اس نے ہی مجھے یہ سب کچھ بتایا تھا کہ تم نے اسے امیر بنانے کے لیے بانڈ منگوائے ہیں۔"

"نوجوان تمہاری قسمت اچھی نہیں ہے' مجھے تمہیں بھی تمہارے دوست کے پاس پہنچانا پڑے گا۔ وہ تمہارا انتظار کررہا ہوگا۔" فاروق بابا نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "بہت ہوشیار سمجھتا ہے اپنے آپ کو خود ہی اپنے جال میں پھنس گیا ہے۔"

فاروق بابا اس سے قبل کچھ کرتا میں موبائل سے کھیلنے کے بہانے پہلے ہی مس کال دے چکا تھا۔ پولیس استاد پیارے کے ساتھ آستانے میں داخل ہوگئی اور ان دونوں کو گرفتار کرلیا۔ بابا کے دو شاگرد بھی تھے جو اسی وقت گرفتار کرلیے گئے تھے۔

فاروق بابا اور ثریا نے بہت واویلا مچایا۔ سنگین نتائج کی دھمکیاں بھی دیں لیکن پولیس نے ان کی ایک نہ سنی اور انہیں لاک اپ کردیا۔

دوسرے دن ان کا چالان پیش کرکے ریمانڈ بھی حاصل کرلیا گیا۔ دوران ریمانڈ پولیس کے سامنے دونوں نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا اور پولیس کو بتایا کہ وہ اس طرح کی وارداتیں پہلے بھی کرچکے ہیں۔ نائلہ عرف ثریا جس کا اصل نام نازش ہے۔ وہ موبائل پر نوجوان سے دوستیاں کرکے پھنساتی ہے اور انہیں سنہرے خواب دکھا کر فاروق بابا کے پاس لے جاتی تھی۔ فاروق بابا پرائز بونڈ نوجوان کے آگے رکھ کر آنکھ بند کرنے کو کہتا تھا۔ وہ جیسے ہی آنکھ بند کرتا۔ چند منٹ کے بعد وہ تیز دھار آلے سے وار کرکے نوجوان کو ہلاک کردیتا تھا اور پھر اس کی لاش ٹھکانے لگادی جاتی تھی۔ یہ کام بڑی رازداری سے ہوتا تھا کہ کسی اور کو خبر نہیں ہوتی۔ اسی لیے وہ دونوں یہ جرم کرکے بھی بچے ہوئے تھے' ان کے آستانے کے بارے میں کسی کو بھی خبر نہیں تھی' جو پکڑے جاتے۔

میں استاد پیارے اور نعیم قریشی بہت خوش تھے کہ میرے دوست کلیم کے قاتل پکڑے گئے تھے۔ بابا فاروق سزا سے بچ نہیں سکتے تھے۔ انہیں پھانسی یا عمر قید کی سزا عدالت سے ضرور ملتی تھی۔ ہمارا ذرا سی کوشش سے قاتل پکڑے گئے تھے۔

⌘

WWW.PAKSOCIETY.COM

روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

شہلا گل......سمن آباد

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ رشتہ کے لیے۔

بعد نماز عشا سورۃ عبس 3 مرتبہ تصور رکھیں کہ جو رکاوٹ ہے وہ ختم ہو جائے۔

راحیل......فیصل آباد

جواب:۔ "یا ھادی یا اللہ" روزانہ 1000 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

راحیل کے لیے دعا کریں راہ ہدایت کے لیے نیت رکھیں پڑھتے وقت کہ اس کے دل میں اس کی نفرت پیدا ہو رہی ہے۔ "سورۃ العصر" ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ اولاد کی فرمانبرداری کے لیے۔

رابعہ......ہری پور ہزارہ

جواب:۔ سورۃ یسین شریف کی آیت نمبر 65 روزانہ 3 تسبیح پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر بیٹی بیٹے کو پلائیں۔

عائشہ ظفر......شیخوپورہ

جواب:۔ ماں مقدم ہے، چچا وغیرہ سب بعد میں۔ ہوسکتا ہے والد آپ کے جائیداد چھوڑ گئے ہوں۔ چچا اور پھوپو کو ناراض کیا جاسکتا ہے۔ والدہ کو نہیں۔ "اللھم انا نجعلک فی نحور ھم و نعوذبک من شرور ھم."

پھوپو کے بیٹے کا تصور کر کے پڑھیں ہر نماز کے بعد 11 بار۔

حنا......پشاور صدر

جواب:۔ بعد نماز فجر:۔ سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ روزانہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

بیٹی ہر نماز کے بعد سورۃ الفلق، سورۃ الناس 9'9 مرتبہ پڑھے۔

اسماء......سرگودھا

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔

انیلہ......بحریہ ٹاؤن

جواب:۔ 1:۔ بچے کی ماں بنیں بچے کا باپ نہ بنیں تربیت کرنا سیکھیں۔

2:۔ اپنا دودھ چمچ میں ڈال کر پلائیں۔ نکالتے اور پلاتے وقت بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتی رہیں اور یہی کلمہ 121 بار ہر فرض نماز کے بعد پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر میاں اور بچوں کو پلائیں۔

م۔ن......گجرات

جواب:۔ سورۃ یسین 3 مرتبہ پڑھ کر چینی پر دم کر لیں جب بھی گھر میں آئے۔ اول وآخر 3'3 مرتبہ درود شریف۔

فاطمہ شبیر......نامعلوم

جواب:۔ "یا بدیع العجائب با الخیر یا بدیع" رزق کے لیے 1000 بار روزانہ پڑھیں۔

پڑھائی کے لیے:۔ ہر نماز کے بعد 21 بار رات سوتے وقت ایک تسبیح "یا علیم علمنی"

مریم......یحییٰ حسن

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ "یا مقیت" رات بستر پر 41 مرتبہ سورۃ الفاتحہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ ہاتھوں پر دم کر کے پورے جسم پر پھیر لیں۔ سر پر تیل بھی لگائیں۔

دونوں وظائف زیادہ مشکل نہیں مستقل طور پر ہمیشہ کرتی رہیں۔ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا اور آگے بھی کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔

رضیہ بیگم......لاہور

جواب:۔ جادو ہے۔ بعد نماز فجر سورۃ یسین اور سورۃ مزمل 1-1 مرتبہ۔

ہر نماز کے بعد سورۃ القریش 7 مرتبہ

سورۃ عبس 3 مرتبہ روزانہ عشا کی نماز کے بعد پڑھیں۔ 1 بوتل پر دم کر لیں وہ پانی پورا گھر استعمال کرے۔ دوسری رات دوبارہ یہ عمل کریں اور پورا دن پانی استعمال میں آئے۔ یہ عمل کم از کم 3 ماہ کرنا ہے۔ باقی دو وظائف مستقل کرتی رہیں۔

یہ معلوم کریں کہ عاصم علی کی دلچسپی کون سے کاروبار میں ہے وہ کروائیں استخارہ کر کے۔

ح۔ر۔مرزا......گجرات

جواب:۔ داخلہ کے لیے ابھی سے شروع کر دیجیے۔

جن کے بارے میں شک ہے "اللھم انا نجعلک فی نحور ھم ونعوذ بک من شرور ھم" پڑھیں (اے اللہ مجھے/ہمیں نجات دے ان کی نحوست اور ہر فرض نماز کے بعد دعا سے پہلے ہاتھ اٹھائے بغیر 11 بار ہر فرد بھی پڑھ سکتا ہے۔

کرن......ملتان

جواب:۔ سورۃ عبس بعد نماز عشا 3 مرتبہ روزانہ اپنے ہاتھوں پر دم کریں سر سمیت پورے جسم پر پھیر لیں۔ تیل پر بھی اور اسی طرح دم کریں۔ روزانہ سر پر لگائیں یہ آپ کے تمام جسمانی امراض کے لیے ہے۔

تعلیم کے لیے جس میں دلچسپی ہے اسی میں وقت لگائیں ہر نماز کے بعد "یا فتاح" 11 مرتبہ پڑھیں۔ کامیابی کے لیے ہمیشہ

استخارہ آپ خود کریں۔ فیضان کے لیے والدہ سورۃ العصر پڑھیں۔ 1 تسبیح روزانہ اور دعا کریں۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

انیلا......راولپنڈی

جواب:۔ جواب دیا جا چکا ہے۔

زبیدہ خانم......لاہور

جواب:۔ سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74، 70 بار بعد فجر اول وآخر 3'3 بار درود شریف پڑھیں۔ رشتے کے لیے دعا کریں۔ عرصہ 3 ماہ۔

محمد شہادت حسین......راولپنڈی

جواب:۔ ہر نماز کے بعد سورۃ الفاتحہ آیتہ الکرسی اور آخری تین قل شریف 3'3 بار پڑھ کر اپنے پر پھونکیں۔

رات سونے سے پہلے 25'25 بار درود ابراہیمی اول وآخر درمیان میں "سورۃ النصر" 125 بار پڑھ کر (نوکری) معاشی حالات اچھے ہونے کی دعا کریں۔

اور خود بھی بھاگ دوڑ کریں ناغہ نہ ہو۔

خالدہ نورین......میاں چنوں

جواب:۔ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ذہنی۔ پریشانی کی وجہ سے پڑھائی پر توجہ نہیں قائم رہتی۔

والدہ اور تینوں بہنیں پڑھیں۔ "الھم انا نجعلک فی نحورھم ونعوذبک من شرور ھم"

نیت:۔ اے اللہ نجات دے (چچا) اس کی نحوست اور شر سے جو ہمارے بارے میں سوچتا اور کرتا ہے۔

صبح وشام ایک ایک تسبیح۔ ہر نماز کے بعد 11 بار ذہن یکسو ہو۔

حمیرا......وہاڑی

جواب:۔ قوت برداشت اور خود اعتمادی نہیں ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

آپ میں۔ یرقان کا مکمل علاج کروائیں سورۃ طحہ کی پہلی پانچ آیات پڑھ کر پانی پلائیں۔ آپ روزانہ سورۃ القریش ہر نماز کے بعد 41 بار پڑھ کر معاشی حالات بہتر ہونے کی دعا مانگیں۔

بیوی کے لیے:۔ ایک کلو کدو لے کر 8 پیس بنا کر 6 کلو پانی میں پکائیں۔ جب 4 کلو رہ جائے تو اس کو اتار کر ٹھنڈا کر کے چھان لیں۔ وہ پانی آپ کی بیوی پیے۔ اس کے علاوہ پانی استعمال نہ کریں روزانہ یہ عمل کرنا ہے۔

در نجف...... ٹانک سٹی

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ "سورۃ الاخلاص" پڑھیں۔ اپنے مسئلے کے لیے دعا کریں۔

شازیہ بی بی...... جویلیاں

جواب:۔ رات کو سونے سے پہلے سورۃ الاخلاص 11 بار پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر چہرے کو دھوئیں۔ پانی نالی میں نہ جائے باقی جسم کا کانپنا اور درد ہونا قریبی اچھے عامل سے رجوع کریں۔ علاج روحانی ضروری ہے۔

عبدالرحمان...... میانوالی

جواب:۔ 40 روز تک روزانہ "سورۃ یسین" شریف مع اول و آخر 11'11 بار درود ابراہیمی کے پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر پئیں اور گھر میں بھی چھڑکیں۔ مویشیوں پر بھی چھڑکیں۔ کوشش کریں کہ پلا بھی دیں۔ ان شاء اللہ افاقہ ہونا شروع ہوگا۔

ارم شہزادی...... ایبٹ آباد

جواب:۔ بھائی کے لیے۔ اول و آخر 25'25 بار درود ابراہیمی درمیان میں "سورۃ النصر" 125 بار پڑھ کر روزگار کی دعا کریں ناغہ نہ ہو۔

ابو کے راضی ہونے کے لیے "سورۃ الشمس" 40 بار پڑھ کر پانی پلائیں کہ ضد چھوڑ دیں اور رشتوں کے لیے راضی ہو جائیں۔

کشمالہ سمیر خان...... حیات آباد

جواب:۔ جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل (اول و آخر 3'3 مرتبہ درود شریف) پڑھ کر دم کر دیں۔ وہ چینی گھر کے تمام افراد کے استعمال میں آئے گھر میں لڑائی نہیں ہوگی ان شاء اللہ۔

شوہر کے روزگار کے لیے عشاء کی نماز کے بعد 111 مرتبہ سورۃ قریش (اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف) نیت یہ ہو کہ جو حق میں بہتر ہو (نوکری یا کاروبار) اس میں کامیابی ہو۔ دعا بھی کریں۔

ثمینہ ارشاد...... لیاقت پور

جواب:۔ رات کو جب دونوں بچے سو جائیں 41 مرتبہ سورۃ العصر اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

پڑھتے وقت دونوں مسئلے ذہن میں رکھیں۔ پانی پر دم کر لیں صبح نہار منہ دونوں کو پلائیں۔

ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ القریش پڑھیں دعا بھی کریں۔ روزی میں برکت کے لیے۔

ع ر...... مانسہرہ

جواب:۔ رشتوں کے لیے:۔ نوٹ (جن کے رشتوں کا مسئلہ ہے وہ خود پڑھیں) بعد نماز فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔

بعد نماز عشاء سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 21'21 مرتبہ۔ نیت یہ ہو کہ رشتوں میں جو بندش، رکاوٹ ہے وہ ختم ہو۔

اولاد کے لیے:۔ سورۃ ال عمران آیت نمبر 38 ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ۔

عالیہ علی...... پشاور کینٹ

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ۔ پڑھیں۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کریں۔

بعد نماز عشاء 3 مرتبہ سورۃ عبس نیت یہ ہو کہ جو رکاوٹ ہے وہ ختم ہو جائے

صدقہ بھی دیں جو حسب حیثیت ہو۔ جب چاہیں۔

صائمہ...... 190/9A.L

جواب:۔ آپ خود فجر کی نماز کے بعد "سورۃ الفرقان" آیت نمبر 74' 70 مرتبہ پڑھیں۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

عشاء کی نماز کے بعد سورۃ عبس 3 مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔ اور نیت یہ ہو کہ جو رکاوٹ بندش ہے رشتے میں وہ ٹوٹ رہی ہے۔

"یاولی" بعد نماز عشاء 1000 مرتبہ روزانہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف معنی ذہن میں رکھ کر پڑھیں۔ دعا یہ کریں کہ جو حق میں بہتر ہو وہ فیصلہ ہو جائے۔ اللہ سب سے بہتر کام بنانے والا ہے۔ یہ وظیفہ آپ کی بہن خود پڑھیں۔

شبانہ...... قصور

جواب:۔ سورۃ ال عمران آیت نمبر 38 ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ بعد نماز عشاء۔ (41 مرتبہ سورۃ الفاتحہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف) اپنی بیماری کے ٹھیک ہونے کا تصور رکھ کر پڑھیں۔ پورے جسم پر دم بھی کریں۔ اور پانی پر پھونک مار کر پئیں بھی۔

ثمینہ کوثر...... سرگودھا

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھیں۔ دعا بھی کریں۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔

س۔م

جواب:۔ بعد نماز عشاء سورۃ الاخلاص 41 مرتبہ۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ اپنے مسئلے کے لیے دعا کریں۔

مریم خان...... کراچی

جواب:۔ والدہ کو آیات سحر 11 بار پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر پلائیں۔ (3 ماہ)

سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74' 70 مرتبہ پڑھ کر (صرف بعد فجر) رشتہ کی دعا کریں۔

محبت رسولؐ کے لیے صرف اور صرف درود شریف کا پڑھنا ہے۔

شمع...... کراچی

جواب:۔ بعد نماز عشاء سورۃ النصر 125 مرتبہ۔ اول و آخر 25'25 مرتبہ درود ابراہیمی دعا بھی کریں اور تصور بھی ہو پڑھتے وقت کامیابی کا۔

طاہرہ بی بی...... بہاولپور

جواب:۔ ہر نماز کے بعد سورہ الفلق، سورۃ الناس گیارہ گیارہ مرتبہ۔

جب گھر میں چینی آئے تو اس پر 3 مرتبہ سورۃ المزمل اول و آخر 3'3 مرتبہ درود شریف پڑھ کر دم کر دیں چینی سب کے استعمال میں آئے۔ گھر میں بدنظمی نہیں ہوگی۔

روزانہ 313 مرتبہ "یاودود" پڑھ کر پانی پر دم کریں۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ وہ پانی شوہر اور بیٹے کو پلائیں۔

عبدالصمد...... گوجرانوالہ

جواب:۔ رشتہ کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

بعدنمازعشاء سورۃ عبس 3 مرتبہ۔آپ کے رشتے میں بندش ہے۔ یہ دونوں وظائف کریں اس کے علاوہ کوئی اور وظیفہ رشتہ کے لیے نہ کریں۔صدقہ بھی دیں۔

اپنے گھراور معاشی پریشانی کے لیے سورۃ القریش روزانہ بعدنمازعشاء۔111 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درودشریف۔

ابوبکر کے لیے استخارہ کرلیں کہ بیرون ملک جانا صحیح ہے یا نہیں۔

شہنازبیگم

جواب:۔ ہرنماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ قریش پڑھیں۔ بعدنمازعشاء 3 مرتبہ سورۃ عبس پڑھیں۔ایک بوتل پردم کریں اوراپنے پورے جسم پر۔

بوتل کا پانی صبح نہار منہ سب گھر کے افراد کو پلائیں۔

نرگس شاہین ہرنماز کے بعد سورۃ ال عمران آیت نمبر 38' 11 مرتبہ پڑھے۔اور عشاء کی نماز کے بعدتین مرتبہ سورۃ عبس پڑھے۔ اولاد کی بندش ختم ہونے کے لیے۔

پڑھنے کے بعد اپنے اوپردم کریں اور پانی پردم کرکے پییں بھی۔

مریم عارف.....سیالکوٹ

جواب:۔ جو بتایا وہ پڑھتی رہیں۔ صدقہ بھی دیں کام میں آسانی ہو۔

ہرنماز کے بعدسورۃ الاخلاص پڑھیں۔ 11 مرتبہ۔

بہن بعدنمازفجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔دعا بھی کریں۔

ہاجرہ پروین.....میاں چنوں

جواب:۔ رشتہ کے لیے روزانہ سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درودشریف۔

بعدنمازعشاء روزانہ سورۃ یٰسین آیت نمبر 58' 313 مرتبہ(اول وآخر 11'11 مرتبہ درودشریف) آپ کے تمام مسئلوں کے لیے۔دعا بھی کریں۔

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail @ gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے مئی 2013ء

نام..................... والدہ کا نام..................... گھر کا مکمل پتا.....................

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں.....................

خوشبوئے سخن

عمر اسرار

غزل

جب تک کسی کو دل سے نہ اپنا کہے کوئی
دنیا میں عاشقوں کو نہ رسوا کرے کوئی
ہر ہر قدم پہ ٹھوکریں ہیں میری راہ میں
پھر خاک زندگی کی تمنا کرے کوئی
تقدیر سے گلہ نہ شکایت عدو سے ہے
ٹوٹے ہوئے دلوں کو نہ چھیڑا کرے کوئی
دل اپنا ان کو دے کے یہ جانا ہے دوستو!
اس بندگی کا کاش نہ سودا کرے کوئی
محدود ہے دنیا میری' راہیں بھی ہیں مسدود
خالق سے اپنے کیسے یہ شکوہ کرے کوئی
کشکولِ دل بھی خالی محبت سے ہے مگر
پھر کیسے اس کو بھیک میں مانگا کرے کوئی
اب لاکھ دل میں اس کو چھپالو گی تم غزل
عشق کے رموز' کاش نہ سمجھا کرے کوئی

سلمیٰ غزل.....کراچی

غزل

سکوت ٹیسوں سے بھرا ہوا ہے
اس لیے لہجہ اکھڑا ہوا ہے
اس سے نہ مانگ زندگی کا خراج
وہ تیرے عشق سے نکھرا ہوا ہے
مجھے دیتا ہے ہستی کا گمان
خود اپنی ذات میں بٹا ہوا ہے
تم ذرا سنبھل کر قدم رکھنا
راہِ محبت میں دل ٹوٹا ہوا ہے
جلتے تپتے انگاروں کے بیچ
دل گلاب سا دہکا ہوا ہے
لہو کا قطرہ قطرہ شاہد
ہر اک پتھر پر جما ہوا ہے
سکوت ٹیسوں سے بھرا ہوا ہے
اس لیے لہجہ اکھڑا ہوا ہے

سید عبداللہ شاہد.....حیدرآباد

غزل

جانے کیسے سنبھال کر رکھے
سب ارادے سنبھال کر رکھے
کچھ نئے رنگ ہیں محبت کے
کچھ پرانے سنبھال کر رکھے
موسمِ عشق تیری بارش میں
خط جو بھیگے سنبھال کر رکھے
جن کی خوش بو اداس کرتی تھی
وہ بھی گجرے سنبھال کر رکھے
تجھ سے ملنے کے اور بچھڑنے کے
سارے خدشے سنبھال کر رکھے
جب ہَوا کا مزاج برہم تھا
ہم نے پتے سنبھال کر رکھے
آرزو کے حسین پنجرے میں
کچھ پرندے سنبھال کر رکھے
ہم نے دل کی کتاب میں تیرے
سارے وعدے سنبھال کر رکھے
تیرے دکھ کے تمام ہی موسم
اے زمانے سنبھال کر رکھے
میرے خوابوں کو راکھ کر ڈالا
اور اپنے سنبھال کر رکھے

انتخاب: عالیہ انعام الٰہی.....ایف بی ایریا،کراچی

کرچیاں

لڑکیاں!

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرسٹل کی بنی چیزوں جیسی
نازک
سندر
شفاف بے ریا
ثابت رہیں تو
چاہتوں کا مرکز
دل کی دھڑکن
روح کی ٹھنڈک
گر
ٹوٹ جائیں تو
یوں بکھریں
کہ کوئی ان کی کرچیاں
سمیٹ نہ پائے

ریحانہ سعیدہ...... لاہور

غزل

زرد موسم کے خواب لکھتا ہوں
زندگی کو عذاب لکھتا ہوں
انگلیاں ہیں فگار پھر بھی میں
تیرے خط کا جواب لکھتا ہوں
تیرا چہرہ ہے پھول کی مانند
تیرے رخ کو گلاب لکھتا ہوں
اب کہاں چاہتیں وہ پہلی سی
وحشتوں کا نصاب لکھتا ہوں
پی کے اک اشک کا سمندر بھی
خود کو محروم آب لکھتا ہوں
نفرتوں کی فضا میں رہ کے جمال
الفتوں کی کتاب لکھتا ہوں

سمیع جمال...... کراچی

غزل

وقت بدلتا ہے تو حالات بدل جاتے ہیں
دوستوں کے بھی خیالات بدل جاتے ہیں
یار مطلب کے ہیں ہم نے تو یہی ہے جانا
وقت کے ساتھ ہی جذبات بدل جاتے ہیں
کچھ سجھائی نہیں دیتا ہے اندھیروں کے سوا
روشنی ہو تو یہ دن رات بدل جاتے ہیں
ان کی آمد بھی لگی تازہ ہوا کا جھونکا
وہ چلے جائیں تو حالات بدل جاتے ہیں
ان سے بے گانہ الفت کا گلہ کیا کیجیے
وہ تو جب چاہیں وہیں بات بدل جاتے ہیں
سر کی دستار بھی قدموں میں جو گر جائے غزل
ہیں یہی لوگ جو غیرت سے بھی مر جاتے ہیں

سلمٰی غزل...... کراچی

غزل

اسرارِ باطن سے جو ذی روح بے دار ہے
دردِ عشق وہاں زندہ و پائیدار ہے
گر قائم ہے رشتۂ جسم و جاں
تو تڑپ اس دل کی نمودار ہے
آب و تاب بزم حسن جہاں
چشم بینا ہی سے برقرار ہے
خراماں خراماں جو چلے بادِ صبا
تو خوش بو و مستی کلی کی آشکار ہے
اک قطرۂ آب ہے شبنم فقط
پھول سے جب تک وہ بے کنار ہے
یہ باعثِ خوش گوشی ہے مری کہ
کوئل جہاں کی سریلی گلوکار ہے
گر نہیں سخن میں اثر جو تڑپا دے
تو قلم اہلِ نکتہ چیں بے رحم تلوار ہے
جیت کی تو قدر کرتا ہے وہی
ہار کی لذت سے جو ہم کنار ہے

عصمت اقبال...... منگلا ڈیم

کاش

کاش......!!
وہ لمحہ آجائے
تم بھی کہو تمہیں پیار ہے
کاش......
تم صرف یہی کہو
تمہیں صرف مجھ سے
صرف مجھ ہی سے پیار ہے
کاش......!
وہ لمحہ تھم جائے
تھم جائے وہ پل
جب تم یہ کہو
تمہیں مجھ سے پیار ہے
ہاں مجھ ہی سے
تمہیں پیار ہے

محمد فہد...... مظفر گڑھ

غزل

اس طرح تاریکیٔ دل میں اجالا کیجیے
اپنے دل میں دوسروں کے روگ پالا کیجیے
بالیقیں ہوجائے گا امروز تیرا خوشگوار
ہر کسی کو وعدہ فردا پر ٹالا کیجیے
کس لیے کرتے ہو آنکھیں بند کر کے اعتبار
آگے پیچھے دائیں بائیں دیکھا بھالا کیجیے
کڑھتے رہنے سے نہ بدلے گی زمانے کی روش
گردش ایام میں خود کو سنبھالا کیجیے
کرنا چاہتے ہو جفاؤں کا اگر پرچم بلند
پیار امرت میں غموں کا زہر ڈالا کیجیے
یاوہ گوئی سے کریں پرہیز جتنا ہو سکے
سوچ کر ہر بات کو منہ سے نکالا کیجیے
وقت کس کے پاس ہے تحقیق کرنے کا قمر
کچھ بھی مل جائے اسے بس تر نوالا کیجیے

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

غزل

کچھ نہ ملا شہر کی گلیوں میں
پلٹ کر اپنے گھر واپس آنا ہوگا
اداس موسموں کی رتیں عجیب سی ہیں
حال دل اس کو مگر سنانا ہوگا
شہاب آخر شب ہے دھیان رکھنا
چراغوں کو اپنے پھر جلانا ہوگا
غریب باپ کھانے کو کچھ نہ لا سکا
اپنے بچوں کو بھوکا پھر سلانا ہوگا
کر کے محبت زمانے کے سامنے
کیا خبر تھی اس نے مکر جانا ہوگا

وسیم اختر...... راولپنڈی

غزل

زندگی میں ہمسفر مل جائے گا
میری چاہت کا ثمر مل جائے گا
درد کا درماں جس سے ہو سکے
کوئی مجھ کو چارہ گر مل جائے گا
جس کا سایہ ہو ہمیشہ ساتھ ساتھ
پیار کا ایسا شجر مل جائے گا
اک دکھی ماں کو تسلی دی گئی
ہاں تیرا لخت جگر مل جائے گا
وہ جو لڑکا کھا رہا ہے ٹھوکریں
کوئی تو اس کو ہنر مل جائے گا
تُو اندھیروں کا نہ رانا خوف کر
راستے میں ہی قمر مل جائے گا

قدیر رانا...... راولپنڈی

غزل

کیسا ہے تیرا خیال کہ سونے نہیں دیتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اشکوں سے بھی دامن کو بھگونے نہیں دیتا
یہ کیسا ملا درد تیرے پیار میں مجھ کو
غم دور میری آنکھوں سے ہونے نہیں دیتا
ہر رات تیری یاد دلاتا ہے میری جان
یہ چاند مجھے چین سے سونے نہیں دیتا
شجاع جعفری...... ضلع چکوال

غزل

برسوں کے بعد دیکھا ہم نے ایک شخص دلربا سا
اب ذہن میں نہیں ہے پر نام تھا بھلا سا
ابرو کھچے کھچے سے آنکھیں جھکی جھکی سی
باتیں رکی رکی سی لہجہ تھکا تھکا سا
الفاظ تھے کہ جگنو آواز کے سفر میں
بن جائے جنگلوں میں جس طرح راستا سا
خوابوں میں خواب اس کے یادوں میں یاد اس کی
نیندوں میں گھل گیا ہو کہ جیسے رت جگا سا
پہلے بھی لوگ آئے کتنے ہی زندگی میں
وہ ہر طرح سے لیکن اوروں سے تھا جدا سا
اگلی محبتوں نے وہ نامراد یادیں
تازہ رفاقتوں سے دل تھا ذرا ذرا سا
پھر یہ کہ مدتوں سے ہم بھی نہیں تھے روئے
کچھ زہر میں بجھا تھا احباب کا دلاسا
پھر یوں ہوا کہ جیسے دل بھی تھا آبلہ سا
اب سچ کہیں تو یارو ہم کو خبر نہیں تھی واجد
بن جائے گا قیامت ایک واقعہ ذرا سا
ڈاکٹر واجد نگینوی...... ملیر، کراچی

غزل

یہ تو بتا میرے دل کو سکون کب ہوگا
دیوانے ہیں جو دن رات پھرتے ہیں ہم
شام کے گہرے سائے اب تو ڈھلنے لگے ہیں
لوٹ کے اب شہر وفا میں آتے ہیں ہم
تپش تیرے ہجر میں سورج سے بھی زیادہ
ٹوٹے ہوئے دل سے اکثر فریاد کرتے ہیں ہم
ہر پل زمانہ نگاہیں بدلتا ہی رہا ہے
قدم قدم زندگی میں یوں دھوکا کھاتے ہیں ہم
دل سمندر دیکھا نہیں کسی کا ہم نے جاوید
شہر ظلمت میں جی کو لگاتے ہیں ہم
محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

غم ہجراں میں سلگ رہے ہو......!
تم سے یہ کہنا ہے
کہ......!!!
کبھی زیست کے سفر کو طے کرتے ہوئے
اگر تم یہ محسوس کرو......
کہ تم نے کیا کچھ کھویا اور کیا پایا ہے
تو ممکن ہے بہت آسان ہو جائے گی زندگی تمہاری
مجھے کھو کر جاناں تم نے......!
بہاروں کا ہاتھ تھاما تھا
بہاریں جو کبھی مجھ سے منسلک تھیں
خوشبوئیں جو کبھی میرا پتہ دیتی تھیں
مگر اب تم اور یہ بہاریں، خوشبوئیں
تم کو کسی اور کا پتہ دیتی ہیں
اور اکثر تم اداس ہو جاتے ہو......!!!
ہجر رات میں کہیں کھو جاتے ہو
مجھے کھو کر بتاؤ جاناں کیا؟؟؟
تم نے واقعی زندگی پالی ہے
یا پھر اب تک بھٹک رہے ہو
غم ہجراں میں سلگ رہے ہو......!
فوزیہ سحر کائنات...... کراچی

ذوق آگھی

عفان احمد

اللہ پاک کے کام نرالے

اللہ اکبر، اللہ بڑا ہے۔ کوئی چیز اس کے مقابل نہیں، تمام تعریفیں اللہ پاک کے لیے ہیں کوئی اس کا شریک نہیں۔ وہ صفات میں اکیلا ہے وہ معبود ہے۔ اس کا شروع اور آخر نہیں۔ یاحی یاقیوم۔ وہ ہمیشہ حیات اور قائم رہنے والا ہے۔ اس کو زوال نہیں جس نے اس سے لو لگائی اس نے اس کے حکم سے ہمیشہ کی زندگی پالی۔ بلاشبہ یہی لوگ ہمیشہ جنت میں رہیں گے بہشت کے عیش و آرام میں کوئی بوریت نہیں۔ ایک بار اگر ایک انسان اپنی زبان سے اللہ اکبر کہتا ہے تو اس کو اللہ پاک اتنا ثواب عطا فرماتے ہیں کہ زمین اور آسمان کے درمیان جو خالی جگہ ہے۔ ثواب سے لبریز ہو جاتی ہے جو لوگ ہر وقت اللہ اکبر کا ورد زبان سے جاری رکھتے ہیں ثواب کے معاملے میں وہ خوش نصیب بن جاتے ہیں۔ اللہ پاک کے کام اور نام بہت ہی نرالے اور منفرد ہیں۔ کام انسان بھی انجام دیتے ہیں اور فرشتے بھی لیکن اللہ پاک کے کاموں میں انفرادیت ہوتی ہے۔ آیئے، صرف اللہ پاک کے ایک کام کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ فرق صاف ظاہر ہو جائے گا۔ اللہ پاک جیسا کام نہ ہی انسان اور نہ ہی فرشتے انجام دے سکتے ہیں اللہ پاک مشکل سے مشکل کام میں آسانی فرما دیتا ہے جبکہ انسان اور فرشتے آسان کام کو بھی مشکل بنا دیتے ہیں۔ فرشتے ہوں یا انسان اللہ پاک جیسا کام یہ نہیں کر سکتے۔ اب ہم انسانی جسم اور روح کا مشاہدہ کریں گے انسان ہو یا کوئی ذی روح جب تخلیق کے مراحل سے ہر ذی روح گزر رہا ہوتا ہے تو روح ڈالنے کا کام اللہ پاک جل شانہ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے جب کوئی انسان ماں کے پیٹ میں اللہ پاک کے حکم سے تخلیق پا رہا ہوتا ہے اس وقت اللہ پاک اس کے جسم میں اس کی روح کو ڈالتا ہے روح نے ایک ایک نس میں سمانا ہوتا ہے روح چونکہ اللہ کے حکم اور اس کی قدرت سے جسم میں داخل ہوتی ہے اس لیے نہ روح کو پتا چلتا ہے نہ ننھے سے جسم کو لاعلمی میں سارا کام انجام پالیتا ہے۔ حالانکہ یہ مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے جب انسان اس دنیا میں آ کے اپنا وقت گزار لیتا ہے تو روح نکالنے کے لیے حضرت عزرائیل علیہ السلام تشریف لاتے ہیں جب فرشتہ روح نکالتا ہے تو انسان پچھاڑیں کھانے لگتا ہے، تڑپتا ہے حتیٰ کہ چارپائی یا بیڈ سے نیچے گر جاتا ہے۔ یہ سب بے تحاشا تکلیف کی وجہ سے عمل میں آتا ہے اس سے پتا چلا کہ مالک کے کام نرالے ہیں۔ انسانوں اور فرشتوں کے کاموں کی نسبت حضرت عزرائیل علیہ السلام اتنی کھینچا تانی فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں آیا ہے کہ جب لوگ قیامت کے روز قبروں سے اللہ پاک کے حکم سے اٹھیں گے تو روح نکالی جانے والی تکلیف کو شدت سے محسوس کریں گے۔ گلے سڑے جسموں کو اللہ پاک دوبارہ اپنی طاقت اور قدرت سے اٹھائیں گے۔ روح دوبارہ اللہ کے حکم سے ان جسموں میں سرایت کرے گی۔ تب بھی کسی کو روح کے داخلے کی تکلیف نہ ہوگی۔ یعنی روح ڈالنا اللہ پاک کا کام ہے۔ جس میں تکلیف نہیں ہوتی۔ روح نکالنا حضرت عزرائیل علیہ السلام کی ڈیوٹی ہے۔ جس میں تکلیف ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تکلیف ہے اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اللہ پاک کا کام انفرادیت کا حامل ہے۔ جبکہ انسان اور فرشتے اللہ پاک جیسا کام نہیں کر سکتے۔ بلاشک اللہ ہی عظیم اور برتر ہے۔ اللہ جیسا کوئی نہیں وہ پاک ہے عظیم ہے اعلیٰ ہے تعریفوں والا ہے۔

بشیر احمد بھٹی...... بہاول پور

بندہ

بندے کے اوپر اللہ کا یہ حق ہے کہ بندے کو اللہ کی ذات اور صفات کی معرفت حاصل ہو۔ اس کا دل اللہ کی محبت سے سرشار ہو۔ اس کے اندر عبادت کا ذوق اور اللہ کے عرفان کا تجسس کروٹیں لیتا ہو۔ بندے کا اللہ کے ساتھ اس طرح تعلق استوار ہو جائے کہ بندگی کا ذوق اس کی رگ رگ میں رچ بس جائے اور بندہ اپنے پورے ہوش و حواس میں جان لے کہ میرا اللہ کے ساتھ ایک ایسا رشتا ہے جو کسی آن کسی لمحے اور کسی وقفے میں نہ ٹوٹ سکتا ہے نہ ختم ہو سکتا ہے یہ بات بھی حقوق اللہ میں شامل ہے کہ بندہ اس بات سے باخبر ہو اور اس کا دل اس کی تصدیق کرے کہ میں نے عالم ارواح میں اس بات کا عہد کیا ہے میرا رب مجھے بنانے والا خدوخال بخش کر میری پرورش کرنے والا اور میرے لیے وسائل فراہم کرنے والا اللہ ہے اور میں نے اللہ سے اس بات کا عہد کیا ہے کہ میں زندگی خواہ کسی عالم میں ہو آپ کا بندہ ہو کر گزاروں گا۔

اقتباس: حسن اختر...... ناظم آباد، کراچی

اخلاصِ نیت

☆ اللہ تعالیٰ کی عبادت خلوص دل سے ہونی چاہیے ورنہ مغز سے خالی چھلکے سے کیا فائدہ؟ اپنے کو اتنا ہی ظاہر کرو جتنا کہ تم ہو، اگر تم پست قد ہو تو نا سمجھ لوگوں کی نظر میں اونچا دکھانے کے لیے مصنوعی پاؤں کا استعمال نہ کرو۔

☆ دھات اور تانبہ کی چیز پر سونے، چاندی کی ملمع سازی دیکھ کر کوئی ناواقف آدمی دھوکا کھا سکتا ہے لیکن اے میرے پیارے عقل مند سنار تو اس کو ضرور پہچان لے گا اور اس کے بدلے میں تمہیں کوئی چیز نہیں دے گا۔

☆ وہ عبادت اور اعمال صالحہ جہنم کے دروازے کی چابیاں ہیں جو لوگوں کی نظر میں اپنے کو اچھا ظاہر کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں، آج دنیا میں جو آدمی جانی مالی عبادات کی محنت کر کے غیر اللہ کو خوش کر رہا ہے کل قیامت کے دن اس کو خداوند قدوس کی طرف سے کوئی اجر و ثواب ملنے والا نہیں ہے۔

☆ اے صاحب زادے! اگر تو قاسم کے گھر کا کام کرتا ہے تو پھر موسیٰ کے گھر سے اجرت حاصل کرنے کی امید چھوڑ دے، ریاکاری کی عزت سے ذرا بھی خوش مت ہونا اس لیے کہ اس پانی کے نیچے کیچڑ ہے۔

☆ اے بیٹے! اگر تم دل سے سنو گے تو اخلاص کی یہ نصیحت کافی ہوگی۔ ریاکار عبادت گزار سے وہ گنہگار بہتر ہے جو اللہ کے خوف سے اپنے گناہوں کو یاد کر کے آنسو بہا رہا ہو۔

مرسلہ: عبدالنادر انصاری...... کراچی

ایک غریب کا قصہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک غریب کو دیکھا جو ننگا ہونے کی وجہ سے ریت میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی حضرت دعا فرماتے جائیں اللہ تعالیٰ ضرورت کی روزی دے اس لیے کہ میں ناداری

سے بہت اکتا گیا ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے لیے دعا کی اور چلے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد پھر وہاں سے گزر ہوا تو اس آدمی کو بندھا ہوا اور اس کے چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ دیکھی۔ دریافت فرمایا: یہ کیا تماشہ ہے؟ لوگوں نے بتایا: اس آدمی نے شراب پی اور ایک آدمی کو جان سے مار ڈالا اب اس کے بدلے میں اس کی جان لینے کا حکم صادر ہوا ہے اس کو دیکھنے کے لیے سب لوگ جمع ہو گئے ہیں فرمایا ولو بسط الله الرزق لبغوا فی الارض.

بلی کے پاس اگر پر ہوتے تو چڑیوں کی نسل دنیا سے ختم کر دیتی اگر گدھے کے پاس بیل کے مانند سینگ ہوتے تو کسی کو اپنے قریب نہ آنے دیتا اگر اللہ تعالیٰ سب بندوں کے لیے روزی کشادہ کر دے تو وہ زمین میں فتنہ و فساد کرنا شروع کر دیں۔

فائدہ: ہر کام میں خدا کی حکمت ہوتی ہے۔

مراسلہ: خالد محمود خان میرانی...... لیہ

گلہائے متفرقہ

۞ بزرگی عقل کی وجہ سے ہے نہ کہ عمر زیادہ ہونے سے ہے۔

۞ کمینوں کے ہاتھ سے ذلیل ہونا بڑی ناموسی اور شرم کی بات ہے۔

۞ مہربانی اور درگزر اچھی چیز ہے مگر ظالم کے ساتھ نہیں اگر تو سانپ پر رحم کھا کر اسے چھوڑ دے تو یہ عام انسانوں پر ظلم ہوگا۔ (گلستان ص ۲۱۶)

۞ دوسروں کی غیبت سے اپنے بارے میں اچھا گمان ہوتا ہے جو مہلک ہے۔

۞ سارے انسان آپس میں ایک جسم کے اعضاء کی مانند ہیں اس لیے کہ ان کی پیدائش ایک ہی اصل (حضرت آدم علیہ السلام) سے ہے۔ جب ایک عضو میں کوئی تکلیف ہو تو دوسرے اعضاء بھی اس کے غم میں شریک ہو جاتے ہیں اگر تجھے دوسرے کی تکلیف کا احساس نہ ہو تو پھر تجھے آدمی اور انسان کہنا غلط ہے۔

۞ حصول علم دین کی خدمت کے لیے ہے نہ کہ دنیا کمانے کے لیے ہے۔

۞ مال زندگی کی راحت و آرام کے لیے ہے نہ کہ زندگی مال جمع کرنے کے لیے ہے۔

مراسلہ: شکیل احمد...... نواب شاہ

راہداری

سانسوں کے رشتوں میں تین زمانے چھپے ہوتے ہیں۔ یعنی ماضی حال اور مستقبل۔ ماضی تجربات و مشاہدات کا وہ سرمایہ ہے جس میں بڑے بڑے گوہر نایاب پڑے ہوتے ہیں بڑے بڑے ہولناک خونخوار درندے پوشیدہ نہیں۔ انہیں غور سے دیکھو اور ان میں سے قیمتی گوہر نایاب اپنے حال کے لیے چن لو کہ حال ایک ایسی راہداری ہے جس کے دوسرے سرے پر مستقبل تمہارا انتظار کر رہا ہے اور جب تم کل مستقبل کے دروازے پر دستک دو تو تمہارے دامن میں نیک روحوں کے وہ تمام عمل پوشیدہ ہوں جس سے تمہارا نفس تمہیں پشیمانی کا زہر پینے پر مجبور نہ کرے۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

⌘

WWW.PAKSOCIETY.COM

قسط نمبر 8

گنگا کا پجاری

اے حمید

جب بھی بارش اور جنگلات کے ساتھ ہندوستان کا تذکرہ آتا ہے' ذہن میں صرف اور صرف ایک ہی شخصیت کا تصور اور پیکر چھن سے اتر آتا ہے وہ تصور اور پیکر محترم اے حمید کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے' ان کے بارے میں نئے افق کے مدیر اور معروف کہانی کار اظہر کلیم مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ اے حمید بارش کی منظر کشی کرتے ہیں تو کمرے میں بند قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ باہر بارش تھاتھپ برس رہی ہے اور جب وہ قہوہ کا ذکر کرتے ہیں تو قہوے کی خوشبو چاروں طرف پھیلی محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ جادو گر تھے جو اپنی تحریر کے ذریعے پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔
زیر نظر ناول بھی اے حمید کا سفر نامہ جنوبی ہند ہے۔ جس میں آپ کو ایڈونچر سسپنس کے ساتھ معصوم محبتوں کے فسانے بھی ملیں گے۔

گارڈ نے جھنڈی ہلائی۔ انجن نے سیٹی دی اور گاڑی جھک جھک کرتی پلیٹ فارم پر کھسکنے لگی۔ بوڑھی عورت نے گٹھری میں ہاتھ ڈال کر ایک پوٹلی نکالی۔ پوٹلی میں سے نسواری رنگ کا سفوف نکال کر ہتھیلی پر رکھا اوپر دوسری ہتھیلی آہستہ سے ماری اور پھر سفوف کا پھکا منہ میں ڈال لیا۔ کہنے لگی۔

"میرے دانت نہیں ہیں۔ بھنگ تمبا کو پیس کر کھا لیتی ہوں تم بھی کیلاش ماتا کی یاترا کو جا رہے ہو بیٹا؟"

میں نے گول مول سا جواب دیا۔

"ہاں ماتا جی' وہیں ایک جگہ جا رہا ہوں۔"

وہ اپنا پوپلا سا منہ چلا رہی تھی کہنے لگی۔

"کیلاش ماتا کے مندر کی یاترا کرنے میں ہر سال جاتی ہوں۔ پہلے ماتا جی کی مورتی کے درشن کرتی ہوں پھر ناگ دیوتا کے مندر میں جا کر ناگ پوجا کرتی ہوں۔"

میں پھر بھی کچھ نہ بولا۔ اتنا مجھے پتا چل گیا تھا کہ یہ عورت کیلاش پربت کے سارے مندروں اور خاص طور پر ناگ دیوتا کے مندر سے بھی واقف ہے۔ مجھے اصل میں اسی ناگ مندر میں جانا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اس سے ناگ مندر کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنی چاہئیے پھر خیال آیا کہ اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں رازداری سے کام لینا چاہتا تھا۔ یہ بات میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ بوڑھی عوت بڑی زبردست سپیرن ہے اور وہ ناگن پاروتی کی بو پا کر ہی میرے ڈبے میں آئی تھی اور جان بوجھ کر اس نے ناگ دیوتا کی باتیں شروع کی تھیں۔

بوڑھی عورت ناگ دیوتا کے بارے میں بتانے لگی۔

"ناگ دیوتا بڑے شکتی مان دیوتا ہیں بیٹا کیا تم نے ان کے درشن کیے ہیں؟"

مجھے ناگ دیوتا کے درشن کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ اگر مجھے ناگ دیوتا سانپ کے روپ

میں کہیں مل جائے تو میں اینٹ مار کر اسے وہیں ہلاک کر دیتا۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں' جی"

بوڑھی عورت ایسی چالاکی سے باتیں کر رہی تھی کہ آخر مجھے اس سے پوچھنا ہی پڑا کہ ناگ دیوتا کا مندر کس جگہ پر ہے۔ وہ کہنے لگی۔

"بیٹا تم کیوں فکر کرتے ہو۔ میں تمہیں خود وہاں لے جا کر ناگ دیوتا کے درشن کراؤں گی۔ یہ مندر پہاڑیوں کے درمیان بڑی خطرناک جگہ پر ہے۔ وہاں تو کوئی کوئی یاتری ہی جاتا ہے۔ مگر میں تمہیں خود ساتھ لے کر جاؤں گی۔ اکیلے جاؤ گے تو راستہ بھول جاؤ گے۔ کیلاش پربت کی پہاڑیوں میں اگر کوئی راستہ بھول جائے تو اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ کئی یاتری ان پہاڑیوں میں بھٹک کر گم ہو چکے ہیں۔"

اس مکار عورت نے مجھے کچھ ایسا ڈرایا کہ مجھے کہنا ہی پڑا۔

"ماتا تم مجھے اپنے ساتھ ہی ناگ دیوتا کے مندر میں لے جانا۔"

وہ بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔

"تمہارا کیا نام ہے بیٹا؟"

میری زبان پر ہندوانہ ایک ہی نام آیا۔ میں نے کہہ دیا۔

"میرا نام موہن لال ہے۔ میں امرتسر سے آیا ہوں۔ میرے پتا جی بیمار ہیں کسی نے کہا ہے کہ ناگ دیوتا کے مندر کے تالاب کا پانی لا کر انہیں پلایا جائے۔ یہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں مندر کے تالاب کا پانی لینے جا رہا ہوں۔"

بوڑھی سپیرن جھوم اٹھی۔ سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے ہاتھ باندھ کر خدا جانے کس زبان میں منتر پڑھنے لگی۔ وہ منتر پڑھتے پڑھتے مجھ پر پھونکیں بھی مارتی جا رہی تھی۔ میں دل میں ہنس رہا تھا کہ یہ کیسی احمق عورت ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں کہ میں ہندو نہیں ہوں اور اس کے ناگ دیوتا کے وجود ہی کو نہیں مانتا اور اگر میرا بس چلے تو میں ہمالیہ کی پہاڑیوں کے سارے مندروں کے بت پاش پاش کر دوں۔ بوڑھی سپیرن منتر ختم کر چکی تھی کہنے لگی۔

"بیٹا! ناگ دیوتا کے تالاب کا جل امرت ہے چاہے کوئی روگ لگا ہو تالاب کے امرت جل کا ایک گھونٹ پلا دو۔ سارے روگ جاتے رہیں گے۔"

کوئی دو اڑھائی گھنٹے کے سفر کے بعد ٹرین بیر گن کے چھوٹے سے پہاڑی اسٹیشن پر آ کر رک گئی۔ بوڑھی سپیرن مجھے اپنے ساتھ لے کر ڈبے سے اتری۔ وہ میرے ساتھ بالکل شفیق ماں ایسا سلوک کر رہی تھی۔ میں اپنی غرض کی وجہ سے اس کے ساتھ ہو گیا تھا کہ یہ عورت مجھے میری منزل تک پہنچا دے گی ورنہ مجھے ناگ مندر تک پہنچنے میں کافی پریشانی اٹھانا پڑتی۔ کیونکہ وہاں کوئی شخص میری راہ نمائی کرنے والا نہیں تھا۔ عورت مجھے بے ضرر بھی لگ رہی تھی۔ ہم اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ باہر دو تین یکے کھڑے تھے۔ یہ علاقہ ایسا تھا کہ کہیں زمین اونچی اور کہیں نیچی تھی۔ دور دور تک پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں اس عورت سے ناگ دیوتا کے مندر کا پتا معلوم کرنے کے بعد بیر گنج کے کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا۔ جب میں نے بوڑھی سپیرن سے کہا کہ مجھے ناگ مندر کا پتا سمجھا دو۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا تو وہ بولی۔

"رام رام کرو بیٹا! تم اکیلے وہاں کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ یہ مندر تو کیلاش پربت کے اوپر بڑی خطرناک جگہ پر ہے۔ ایک سرنگ میں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ تم میرے ساتھ جاؤ گے۔ میں بھی ادھر ہی جا رہی ہوں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے دل میں سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ میں اس عورت کے ساتھ ہی چلوں۔ اس طرح آسانی سے ناگ دیوتا کے مندر میں پہنچ جاؤں گا۔ میں نے سپیرن سے کہا۔
"ماتا میں تو کل ناگ مندر جاؤں گا۔ میں سفر سے بڑا تھک گیا ہوں۔ اب میں کسی ہوٹل میں جا کر آرام کروں گا۔"
بوڑھی سپیرن منہ اوپر نیچے چلاتے ہوئے کہنے لگی۔
"جیسے تمہاری مرضی بیٹا۔ تم مجھے اپنا ہوٹل دکھا دو۔ میں تمہیں صبح وہیں سے لے لوں گی۔"
"اچھا ماتا میرے ساتھ آؤ۔"
بیر گنج ایک نیم پہاڑی قصبہ تھا۔ وہاں ایک ہی معقول ہوٹل تھا۔ یہ ایک منزلہ مکان تھا جس کو ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کمرے کا کرایہ معمولی تھا۔ میں نے بوڑھی سپیرن سے کہا۔
"ماتا جی! میں اسی ہوٹل میں ہوں' کل صبح کے نو بجے تم آ جاؤ۔ پھر چل پڑیں گے۔"
"ٹھیک ہے بیٹا' ایسا ہی کرتے ہیں۔ تم آرام کرو۔ میں کل صبح آؤں گی۔"
بوڑھی عورت یعنی بوڑھی سپیرن چلی گئی۔ ابھی تک مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہ عورت بڑی مکار سپیرن ہے اور وہ ایک خاص مقصد دل میں رکھ کر میرے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ جب وہ چلی گئی تو میں نے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں جا کر جیب میں سے رومال نکال کر کھولا۔ پاروتی کے سانپ کی روپ میں دونوں ٹکڑے اسی طرح موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ ان ٹکڑوں کو کسی چھوٹے سے ڈبے میں بند کر کے رکھنا چاہیے پھر وہی ڈبہ میں اسی طرح کیلاش مندر کے تالاب میں ڈال دوں گا۔ میں نے ہوٹل کے نوکر سے ٹین کا ایک چھوٹا ڈبہ منگوایا اور پاروتی سانپ کے جسم کے دونوں ٹکڑے اس میں ڈال کر ڈبے کو بند کر دیا۔ یہ ڈبہ اتنا چھوٹا تھا کہ میری جیب میں آسانی سے آ جاتا تھا۔ جس رومال میں میں نے پاروتی کے سانپ کے ٹکڑوں کو پہلے باندھ کر رکھا ہوا تھا وہ رومال میں نے اپنی دوسری جیب میں رکھ لیا۔ رات میں نے ہوٹل میں گزاری۔
دوسرے دن سورج نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی بوڑھی سپیرن آ گئی۔ میں تھوڑی دیر پہلے سو کر اٹھا تھا اور نیچے ہوٹل میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ میں نے بوڑھی سپیرن کو بھی ناشتہ کرایا۔ آخر وہ میری بے غرض مدد کر رہی تھی۔ مجھے اس کی اتنی خاطر داری تو ضرور کرنی چاہیے تھی۔ میں نے اس سے کہا۔
"ماتا! میں اوپر جا کر تیار ہوتا ہوں تم یہیں بیٹھ کر چائے پیو۔"
وہ مجھے دعائیں دیتی ہوئی بولی۔
"بیٹا! بھگوان تیرا سات جنموں میں بھلا کرے تو میری بڑی خدمت کر رہا ہے۔ فکر نہ کر میں بھی تجھے ناگ دیوتا کے مندر میں پہنچا کر واپس آؤں گی۔"
مجھے تیار کیا ہونا تھا۔ بس منہ ہاتھ دھویا۔ پاروتی کے سانپ کے ٹکڑوں والا ڈبہ سنبھال کر جیب میں رکھ لیا۔ بوڑھی سپیرن نیچے میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔ گٹھری اس کے ساتھ ہی تھی۔ کہنے لگی۔
"بیٹا یہاں سے یکہ لے لیں گے' اوپر ڈیرو گڑھ تک یکے جاتے ہیں آگے پہاڑیوں میں پیدل سفر شروع ہوگا۔"
ایک یکہ ہم نے کرا لیا اور نیچے نیچے نیم میدانی کھیتوں میں سے گزرتے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈیرو گڑھ کے گاؤں میں پہنچے۔ یہاں سے ہمارا پیدل سفر شروع ہو گیا۔ یہ بالکل ایسا علاقہ تھا جس طرح

ہمارے کوہ مری جاتے ہوئے تریٹ کے مقام سے پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ایک بڑی ہری بھری وادی میں ہم جا رہے تھے۔ میں نے بوڑھی عورت سے کہا۔
"ماتا تم تھک تو نہیں جاؤ گی؟ ہمیں کتنا پیدل چلنا پڑے گا؟"
وہ کہنے لگی۔
"ارے بیٹا میری تو ساری عمر ان پہاڑیوں میں آتے جاتے گزر گئی ہے۔ ہر سال ناگ دیوتا کی یاترا کو آتی ہوں۔ ہر مہینے میں ایک بار درشن کرنے بھی ضرور آ جاتی ہوں۔ بس ہمیں ایک دن ایک رات لگ جائے گی مندر تک پہنچتے پہنچتے۔"
میل دو میل چلنے کے بعد چڑھائی شروع ہو گئی۔ یہ ہمالیہ کی ترائی کے ٹیلے تھے۔ راستے میں کہیں کہیں کوئی چھوٹا سا گاؤں بھی آ جاتا۔ چھوٹے چھوٹے جھونپڑی نما مکان ہوتے جن کے آگے مٹی اور پتھروں کے چبوترے بنے ہوئے ہوتے۔
اس وقت آسمان پر بادل جمع ہونے لگے۔ بوڑھی سپیرن نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔
"زور کا مینہ برسے گا۔ یہ تو بارش کا طوفان لگتا ہے۔ ہمیں کہیں رک جانا ہوگا۔"
بادل اتنے گہرے نہیں تھے مگر میں نے ست پڑا کے جنگلوں کے بادل دیکھے تھے۔ میں نے سوچا شاید ہمالیہ کی ترائی میں ایسے ہی بادل طوفانی بارش لاتے ہوں' میں اس بوڑھی عورت کی ایک ایک بات پر یقین کرتا جا رہا تھا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر یہ میری بے وقوفی تھی اور بیوقوف آدمی ضرور مار کھاتا ہے۔ قدرت کے اصول اور ضابطے عقل مند آدمی کا ساتھ دیتے ہیں۔ کیونکہ قدرت خود اصول اور ضابطے کی پابند ہے۔
میں نے اس عورت سے کہا۔
"آگے کوئی گاؤں ہوگا۔ وہاں کسی جھونپڑے میں پناہ لے لیں گے۔"
وہ بولی۔ "ہاں آگے ایک گاؤں آ رہا ہے۔ مجھے یاد ہے۔"
بادل اتنے گہرے سیاہ نہیں تھے لیکن آپس میں گھل مل گئے اور لگتا تھا کہ بارش ہوگی۔ ایک ٹیلے کا چکر کاٹ کر ہم آگے بڑھے تو کھپریل کی چھتوں والے چھ سات بوسیدہ سے مکان دکھائی دیئے۔ بوڑھی سپیرن نے ایک عورت سے آگے جا کر بات کی اور پھر مجھے اشارے سے بلایا۔
"یہ بڑے دھرمی لوگ ہیں۔ یاتریوں کی بڑی سیوا کرتے ہیں۔ انہیں دو چار روپے دے دو۔"
میں نے عورت کو چار روپے دیئے۔ وہ روپے لے کر بڑی خوش ہوئی۔ اس نے ایک مکان کا دروازہ کھول دیا۔ اندر پیاز کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کونے میں پیازوں کا ڈھیر لگا تھا۔ عورت کے آدمی نے اندر دو چار پائیاں ڈال دیں اور ہمارے لیے مٹی کے گلاسوں میں چائے بنا کر لے آیا۔ اتنے میں بارش شروع ہو گئی۔ کھپریل کی ڈھلواں چھت پر بارش کی آواز آنے لگی۔ بوڑھی سپیرن چارپائی پر بیٹھ کر اپنی گٹھری کھولنے لگی۔
"بیٹا! اس میں میرے دو چار کپڑے' تمباکو اور تھوڑا سا گڑ ہے۔ یہ گڑ کالی ماتا کے مندر کا پرشاد ہے۔"
اور اس نے پوٹلی میں سے گڑ کی ڈالی نکال کر تھوڑا سا گڑ توڑ کر مجھے دیا۔ گڑ کا رنگ سنہری تھا۔ اس کے ساتھ تل اور بادام بھی لگے تھے۔ وہ کہنے لگی۔
"اسے کھاؤ۔ یہ پرشاد ہے۔ انکار نہ کرنا کالی ماتا ناراض ہوگی۔"
مجھے کالی ماتا کی ناراضگی کی کوئی پروا نہیں تھی لیکن گڑ کی رنگت اور تل بادام دیکھ کر میرا جی للچا گیا۔ میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے گڑ کا ٹکڑا لے کر منہ میں ڈال لیا۔ واقعی گڑ بڑا لذیذ تھا۔ بوڑھی سپیرن کٹھڑی میں سے نکالے ہوئے پرانے کپڑوں کو جھاڑ کر تہہ کر رہی تھی اور بولے بھی جا رہی تھی۔

"تم بڑے بھاگ وان ہو جو ناگ دیوتا کے درشن کرنے جا رہے ہو۔ تمہاری جو خواہش ہوگی وہ ضرور پوری ہو جائے گی۔ وہاں سے کوئی سوالی خالی نہیں جاتا......"

بوڑھی سپیرن باتیں کیے جا رہی تھی۔ میں دوسری چارپائی پر بیٹھا اسے باتیں کرتا دیکھ رہا تھا کہ مجھے اچانک ایک چکر سا آیا اور مجھے اتنا یاد ہے کہ میں پیچھے کو گرا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

ہوش اس وقت آیا تو میں باہر برآمدے میں فرش پر پڑا تھا۔ مکان کا مالک اور اس کی پہاڑن بیوی میرے پاس بیٹھے مجھے ہوش میں لانے کی تدبیریں کر رہے تھے۔ میں نے ہوش میں آتے ہی پوچھا۔

"مجھے کیا ہو گیا تھا؟"

پہاڑن عورت نے کہا۔ "پتا نہیں کیا ہوا تھا؟"

اس کا خاوند کہنے لگا۔

"ہم تو تمہارے لیے کھانا تیار کرنے میں لگے تھے کہ تمہاری ماتا جی مکان کا دروازہ بند کر کے میرے پاس آئی۔ کہنے لگی۔ میرا بیٹا سفر کرتے کرتے بہت تھک گیا ہے۔ اب وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ اسے جگانا مت۔ میں اس کے لیے جنگل سے ایک جڑی بوٹی لینے جا رہی ہوں۔ وہ چلی گئی۔ ہم نے تمہیں نہ جگایا۔ جب شام ہونے لگی تو ہمیں تمہاری فکر لگی۔ ہم نے جا کر دیکھا کہ تم بے ہوش پڑے تھے......"

میں نے جلدی سے اٹھ کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میرا بٹوا جس میں پیسے تھے اور وہ ڈبی جس میں ناگن پاروتی کے ٹکڑے رکھے تھے غائب تھی۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ یہ عورت اسی لیے میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اسے ناگن پاروتی کے جسم کے ٹکڑے چاہیے تھے اور وہ انہیں اڑا لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔

❁......❁......❁

اس وقت رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

پہاڑی مکان کے برآمدے میں مٹی کے تیل کی لالٹین ستون کے ساتھ لگی جل رہی تھی۔ میں نے مکان کے مالک سے پوچھا کہ بوڑھی عورت کو گئے کتنی دیر ہو گئی ہے۔ اس نے کہا۔

"وہ تو دن کے وقت ہی چلی گئی تھی۔"

اس کا مطلب تھا کہ میں سارا دن بے ہوش پڑا رہا تھا۔ کاش میں اس عیار عورت کا گڑ نہ کھاتا۔ اس میں بے ہوشی کی دوائی ملی ہوئی تھی۔ اب کیا کروں؟ میں سوچ میں پڑ گیا۔ مجھ سے پاروتی چھین لی گئی تھی۔ یقیناً یہ بوڑھی عورت کوئی سپیرن تھی اور اس نے میری جیب میں پڑے ہوئے پاروتی کے ٹکڑوں کی بو سونگھ لی تھی اور وہ اسے ہتھیانے کے لیے میرے پیچھے لگ گئی تھی۔ پاروتی نے کئی بار مجھے کہا تھا کہ اب جب کہ مجھ میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی ہے کہ انسانی شکل سے سانپ کی شکل اختیار کر سکتی ہوں تو میں دشمن سپیروں کے لیے بڑی قیمتی ہو گئی ہوں۔ اگر کوئی سپیرا مجھے اپنے قبضے میں کر لیتا ہے اور اسے ناگ دیوتا کے وہ خفیہ منتر بھی آتے ہیں جن کے پڑھنے سے میری یادداشت گم ہو سکتی ہے تو وہ مجھ سے بڑے خطرناک کام لے سکتا ہے۔ اس لیے اگر کبھی میرے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا اور کسی انسان نے مجھے معمولی سانپ سمجھ کر مار دیا تو میری لاش کو بہت سنبھال کر رکھنا اور کیلاش پربت کے مندر تک جاتے ہوئے کسی کو

کانوں کان خبر نہ ہونے پائے کہ تم ناگن پاروتی کے سانپ کی لاش لے جا رہے ہو۔

افسوس میں بوڑھی عورت سے دھوکا کھا گیا جو ضرور بڑی خطرناک سپیرن تھی۔ وہ پاروتی ٹکڑے مجھے بے ہوش کر کے لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور خدا جانے اب وہ اسے اپنے قبضے میں کر کے اس سے کیسے کیسے برائی کے کام لے گی۔ میرا فرض ہو گیا تھا کہ میں اس مکار بوڑھی عورت کا کھوج لگا کر اس سے پاروتی کی لاش کے ٹکڑے کسی طرح واپس لوں۔ میں نے پہاڑی آدمی سے پوچھا۔

"ماتا یہاں سے کس طرف گئی تھی؟"

میرا خیال تھا کہ وہ اوپر ناگ دیوتا کے مندر کی طرف گئی ہو گی مگر پہاڑیا کہنے لگا۔

"میں رسوئی میں اپنی عورت کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے رسوئی کی کھڑکی سے تمہاری ماتا کو دیکھا تھا۔ وہ نیچے وادی میں شہر کی طرف جا رہی تھی۔ کیا تمہیں وہ بتا کر نہیں گئی تھی؟ تم بے ہوش کیسے ہو گئے تھے؟ کیا تم نے زیادہ دارو پی لیا تھا؟"

میں نے اسے تو کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ یہاں میں نے سو روپے کا ایک نوٹ تہہ کر کے چھپا کر رکھا ہوا تھا کہ اگر بٹوہ چوری ہو گیا تو یہ روپے میرے کام آ سکتے ہیں۔ سو کا تہہ کیا ہوا نوٹ مجھے مل گیا۔ اسی جیب میں وہ رومال بھی تھا جس میں میں نے پاروتی کے سانپ کے روپ میں کٹے ہوئے ٹکڑے باندھے تھے اور پھر اس میں سے نکال کر ٹین کے ڈبے میں بند کر لیے تھے۔ میں یہ رومال پھینکنے لگا۔ پھر سوچا کہ یہ پاروتی کی نشانی ہے اور میں نے رومال کو نکال کر تہہ کر کے پچھلی جیب میں سو روپے کے نوٹ کے ساتھ ہی سنبھال کر رکھ لیا۔ میں نے دیہاتی آدمی سے کہا۔

"میں واپس بیرگنج جاؤں گا۔ کیا یہاں سے کوئی خچر وغیرہ مل جائے گا جو مجھے بیرگنج لے جائے۔"

وہ کہنے لگا۔

"ہمارے پاس تو ایک گائے ہی ہے وہ ہم تمہیں نہیں دے سکتے۔ کیونکہ گئو ماتا پر ہم سواری نہیں کرتے مگر رات کے اندھیرے میں تمہیں نہیں جانا چاہیے۔ ترائی کے جنگل میں رات کو بھالو اور چیتے نکل آتے ہیں۔"

میں مکار سپیرن کو جلد سے جلد پکڑنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"تم مجھے وہ راستہ بتا دو جو بیرگنج کو جاتا ہے۔ ہم جس راستے سے آئے تھے وہ مجھے یاد نہیں رہا۔"

آدمی نے کہا۔

"اگر تم ضرور جانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ آؤ۔"

اس نے لالٹین اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی اور میرے آگے آگے چلنے لگا۔ ڈھلان سے اتر کر ہم ایک پہاڑی پگڈنڈی پر آ گئے۔ یہ پگڈنڈی دو چار موڑ گھومنے کے بعد ایک کچے راستے پر نکل آئی۔

پہاڑیا بولا۔

"یہ راستہ بیرگنج کو جاتا ہے۔ میں ایک بار پھر تمہیں یہی کہوں گا کہ رات کے اندھیرے میں جنگل میں سفر کرنے میں بڑا خطرہ ہے۔ ادھر رات کو بھالو چیتے نکل آتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تمہارا دھنوار بھائی......"

اور میں بیرگنج کو جانے والے کچے راستے پر اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ یہ پہاڑی راستہ تھا۔ دونوں جانب جھاڑیاں تھیں جن میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اردگرد چھوٹے بڑے ٹیلے تھے جو رات کے اندھیرے میں بڑے ڈراؤنے لگ رہے تھے۔ میں چلتا گیا۔ راستہ اترائی کا تھا۔ اس لیے میری رفتار تیز

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ بیر گنج وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ کیونکہ جب مکار عورت مجھے ساتھ لے کر بیر گنج سے چلی تھی تو کوئی آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد ہم چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں آگئے تھے جہاں اس سپیرن نے مجھے بے ہوش کیا تھا لیکن رات کی تاریکی کی وجہ سے مجھے رک رک کر چلنا پڑ رہا تھا۔ ذرا کسی طرف سے کوئی کھڑکا ہوتا تو میں رک جاتا کہ کہیں کوئی بھالو یا چیتا نہ ہو لیکن خدا کا کرم شامل حال رہا۔ مجھے راستے میں کوئی چیتا یا ریچھ نہ ملا اور ایک جگہ اترائی اترتے ہوئے مجھے بیر گنج کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آنے لگیں۔

میں بیر گنج پہنچ گیا۔ یہاں میں اسی ہوٹل میں آ گیا جہاں میں نے رات گزاری تھی۔ یہ ہوٹل جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ایک شکستہ سا پرانا دومنزلہ مکان تھا جس کو ہوٹل بنا دیا گیا تھا۔ میں نیچے ہوٹل کی دکان میں ہی بیٹھ گیا۔ میں نے پانی پیا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ چاول دال منگوا کر کھائے۔ ہوٹل کا لڑکا مجھے بوڑھی سپیرن کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ وہ پانی کا جگ لے کر آیا تو مجھ سے پوچھنے لگا۔

''صاحب تمہاری ماتا جی بھی دوپہر کو یہاں آئی تھی۔ بھوجن کر کے چلی گئی تھی۔''

میں نے چونک کر لڑکے کی طرف دیکھا۔

''وہ کس وقت آئی تھی؟''

لڑکے نے میری طرف حیرانی سے دیکھا اور کہا۔

''بارش ہو رہی تھی۔ دن کے نو دس بجے آئی تھی۔ وہ بارش میں بھیگ رہی تھی۔ یہاں اس کمرے میں اس نے دوسری ساڑھی پہنی اور بھوجن کیا تھا پھر شہر کی طرف چل دی۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ آگے بڑا شہر گورکھپور ہی ہے۔ بیر گنج سے وہ سیدھی گورکھپور گئی ہوگی۔ گورکھپور ایک بڑا شہر تھا۔ میں اسے وہاں کہاں تلاش کروں گا؟ وہ کہاں مل سکے گی؟ کہیں وہ گورکھپور سے بھی آگے تو نہیں نکل گئی ہوگی؟ مجھے یہی سوال پریشان کر رہے تھے۔ اس وقت رات کے نو سوا نو بجے کا وقت ہوگا۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ میں نے لڑکے سے پوچھا۔

''اس وقت بیر گنج سے کوئی لاری یا ریل گاڑی گورکھپور کو جاتی ہے؟''

لڑکے نے کہا۔

''لاری تو کوئی نہیں جاتی۔ ریل گاڑی شاید مل جائے۔''

میں نے کھانے کا اور کمرے کا جو تھوڑا بہت بل بنتا تھا ادا کیا اور سیدھا بیر گنج کے اسٹیشن پر آ گیا۔ رات کے بارہ بجے کہیں جا کر مجھے ایک گاڑی ملی جو گورکھپور سے ہوتی ہوئی پٹنہ کو جاتی تھی۔ کوئی دو بجے رات گورکھپور پہنچا۔ اگرچہ گورکھپور کے بارے میں یہی پتا چلا تھا کہ یہاں شروع شروع میں ہندو مسلم فساد ہوئے تھے مگر اس کے بعد امن امان ہو گیا تھا لیکن اسٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ شہر میں رات کا کرفیو لگا ہوا ہے جو صبح نو بجے کھلے گا۔ پلیٹ فارم پر بہت سے مسافر رکے ہوئے تھے۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ اس علاقے میں اب مجھے ہندو مسلم کی پہچان ہو گئی تھی۔ اگرچہ بظاہر دیکھنے میں دونوں کے روپ ایک سے ہوتے تھے مگر مسلمان کے کندھے پر ڈالے ہوئے سرخ خانے دار پرنے کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے لیکن فسادات کی وجہ سے اب مسلمانوں نے پرنے رکھنے چھوڑ دیئے تھے۔ اب صرف داڑھی سے پتا چلتا تھا کہ یہ مسلمان ہے۔ میں بھی پلیٹ فارم پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ میرے ماتھے پر جو سرخ بندیا لگی تھی وہ میں نے اتار کر پھینک دی تھی۔ یہ میں نے اس وقت لگائی تھی جب میں پاروتی کی لاش کے ٹکڑے لے کر کیلاش پربت کو ہندو بن کر جا رہا تھا۔ اب مجھے ہندو بنے رہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی کیونکہ گورکھپور میں مسلمانوں کی کافی آبادی تھی۔

رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ گورکھپور کے اسٹیشن پر بتیاں روشن تھیں۔ یہ کافی بڑا شہر تھا۔ میں پلیٹ فارم پر کتابوں رسالوں کے ایک بند کھوکھے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے عیار سپیرن اس وقت تک نہ جانے کہاں کی کہاں نکل چکی ہوگی۔ مجھے کوئی منصوبہ بندی کر کے اس کی تلاش شروع کرنی تھی۔ اس کا سراغ مجھے سپیروں سے یا کسی ایسے ہندو سے ہی لگ سکتا تھا جہاں ناگ دیوتا کی پوجا ہوتی ہے۔ خدا جانے گورکھپور میں کوئی ایسا مندر تھا بھی یا نہیں۔ یہ معلومات مجھے شہر میں صبح کرفیو کھلنے کے بعد ہی مل سکتی تھیں۔ اس بات کا ڈر بھی تھا کہ اگر یہاں رات کا کرفیو لگا ہے تو ضرور شہر میں بلوہ ہوا ہوگا۔ میں شہر سے ناواقف تھا۔ کھلے بندوں شہر میں جانا خطرے کا باعث بھی ہو سکتا تھا۔

میں اسی الجھن میں بیٹھا سوچتا رہا۔ میرے قریب ہی ایک فیملی بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک عمر رسیدہ مرد تھا۔ جس کی داڑھی تھی۔ چارخانے کی دھوتی اور بنیان پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ دو تین عورتیں اور دو بچے تھے۔ یہ مسلمان فیملی لگتی تھی۔ میرا جی چاہا کہ ان سے شہر کے حالات کے بارے میں کچھ معلوم کروں۔ میں اٹھ کر ان کے پاس گیا۔ عمر رسیدہ بزرگ کو السلام علیکم کہا اور وہیں بیٹھ گیا۔

بزرگ نے وعلیکم السلام کہہ کر مجھے گہری نظروں سے دیکھا اور منہ دوسری طرف کر کے اپنی عورتوں سے دبی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس سے کہا

''بھائی صاحب میں مسلمان ہوں۔ پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ بیر گنج اپنے ایک عزیز سے ملنے گیا تھا۔ یہاں آ کر پھنس گیا ہوں۔ کیا شہر میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے؟''

اس آدمی نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

''میاں! ہمیں تو کچھ معلوم نہیں۔ ہم تو لکھنؤ سے آئے ہیں۔ کان پور جانے والی گاڑی کا انتظار ہے۔ کہتے ہیں صبح جائے گی۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے جانا تو اصل میں پاکستان ہے۔ میں پاکستان کے شہر لاہور کا ہی رہنے والا ہوں مگر سنا ہے پنجاب میں ہندو سکھ مسلمانوں کے قافلوں اور ریل گاڑیوں پر حملے کر رہے ہیں اور مسلمان مہاجرین کو قتل کر رہے ہیں۔ اس لیے اب یہی سوچا ہے کہ یہاں سے کلکتے چلا جاؤں۔ وہاں سے بمبئی جاؤں اور وہاں سے سمندری جہاز میں سوار ہو کر کراچی کی طرف نکل جاؤں۔''

''ہاں میاں تمہارے لیے یہی راستہ مناسب رہے گا۔ مشرقی پنجاب میں تو ہر طرف آگ لگی ہے۔ سکھ ہندو مل کر مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا رہے ہیں۔ انہیں قتل کر رہے ہیں۔ مہاجرین کی جو ریل گاڑیاں پاکستان جاتی ہیں ان کو راستے میں ہی روک کر کاٹ ڈالتے ہیں۔''

یہ ساری باتیں مجھے معلوم تھیں۔ میں گورکھپور شہر کے بارے میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہاں ہندوؤں کی آبادی کتنی ہے اور کیا یہاں کوئی ایسا مندر بھی ہے جہاں سانپوں کی پوجا ہوتی ہے۔ جب میں نے بڑے طریقے سے یہ باتیں ان سے پوچھیں تو وہ بزرگ کہنے لگے۔

''میاں ان ہندوؤں کے مذہب میں تو ہر جانور کی پوجا ہوتی ہے۔ یہ کوئی مذہب نہیں ہے گورکھپور

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں مسلمان بھی رہتے ہیں مگر اس شہر میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ سنا ہے یہاں ایک مندر ہے جہاں سانپ دیوتا کی پوجا ہوتی ہے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے جلدی سے کہا۔

"یونہی پوچھ رہا تھا۔ بھلا مجھے ان ہندوؤں سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟"

اس بزرگ سے گورکھپور میں ایک ایسے مندر کا سراغ مجھے مل گیا تھا جہاں ناگ کی پوجا ہوتی تھی۔ اب مجھے اس مندر میں جا کر اس مکار بوڑھی سپیرن کا سراغ لگانا تھا کہ کہیں وہ وہاں تو نہیں آئی۔ میری تفتیش اسی طرح ایک ایک قدم ایک ایک مرحلہ کرکے آگے بڑھ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ عورت میری نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ اب میں سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کے مطابق چل کر ہی اس کا کوئی کھوج لگا سکتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح رات گزر گئی۔ دن نکلا تو پلیٹ فارم پر کچھ رونق نظر آنے لگی۔ مسافر چائے کی کینٹین پر جا کر اپنے لیے اور اپنے بال بچوں کے لیے ناشتے کا سامان خریدنے لگے۔ میں نے بھی وہیں پلیٹ فارم پر ناشتہ کیا اور کرفیو کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں اس پلیٹ فارم پر آ گیا جس کے گیٹ میں سے باہر شہر کا بازار نظر آ رہا تھا۔ بازار خالی پڑا تھا۔ اسٹیشن کے بالکل سامنے ایک چھوٹے سے پلاٹ میں فوارہ لگا تھا جو بند تھا۔ پولیس کے کچھ سپاہی ہاتھ میں ڈنڈے لیے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔

کرفیو کھلنے کا سائرن بجا تو بازار میں رکشے یکے اور لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ خدا جانے لوگ کہاں کہاں سے نکل کر سڑک پر آ گئے تھے۔ میں بھی اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ مجھے اب ہندو بن کر یعنی اپنے آپ کو ہندو ظاہر کرکے ناگ پوجا والے مندر کا پتا معلوم کرنا تھا۔ تانگہ اسٹینڈ پر تین چار یکے خالی کھڑے تھے۔ ایک کوچوان شکل صورت سے ہندو لگتا تھا۔ اسے صرف میں ہی پہچان سکتا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

"بھیا شہر میں کچھ شانتی ہوئی کیا؟"

وہ بولا۔ "شانتی کیوں نہیں ہوگی بابو جی۔ مسلمانوں کو مار دیا ہے یا نکال دیا ہے شہر سے۔ تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں سمجھ گیا کہ کوچوان ہندو ہے۔ میں نے کہا۔

"بھیا کیلاش پربت ناگ دیوتا کے درشن کو گیا تھا۔ اب گورکھپور کے ناگ مندر میں بھی پوجا کا خیال ہے۔ پھر واپس اپنے شہر رامپور چلا جاؤں گا۔ کیا مجھے ناگ مندر لے چلو گے؟"

"ناگ جی کے مندر کا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں ہاں وہی......"

"بیٹھ جاؤ۔"

میں یکے میں بیٹھ گیا۔ یکہ شہر کی سڑک پر چل پڑا۔ کرفیو کھلتے ہی دکانیں بھی کھل گئی تھیں۔ لوگ سودا سلف لینے گھروں سے نکل آئے تھے۔ ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی جو اپنی وضع قطع سے صاف پہچانے جاتے تھے۔ یکہ دو مندروں کے سامنے سے بھی گزرا۔ آخر کوچوان نے مجھے ایک بازار کے کونے پر لے آیا۔ کہنے لگا۔

"یہ رہا ناگ جی کا مندر بابو۔"

یہ مندر بھی ویسا ہی تھا جیسا اکثر بڑے شہروں میں چھوٹے مندر میں نے دیکھے تھے۔ احاطہ تھا، احاطے میں پیپل اور نیم کے درخت تھے۔ کونے میں بہت بڑا چبوترہ تھا جس کے اوپر مخروطی مینار والی مندر کی عمارت کھڑی تھی۔ مینار کے اوپر زعفرانی رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ کرفیو کھلا ہی تھا۔

بہت سے ہندو پوجا پاٹھ کرنے وہاں آ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ مندر کے اندر گھنٹیاں اور سنکھ بج رہے تھے۔ میں نے احاطے میں ایک طرف کھڑے ہو کر چاروں طرف غور سے دیکھا۔ یہاں بھی درختوں کے نیچے کہیں کہیں سادھو دھونی رمائے بیٹھے تھے اور لوگ ان کے آگے پوری کچوری کے دونے رکھ رہے تھے۔ سادھو لمبی جٹائیں چھوڑے چلم منہ سے لگائے چرس مدک پی رہے تھے۔ یہاں مجھے وہ عیار سپیرن کہیں نظر نہ آئی۔ میں نے سوچا کہ اندر چل کر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر مندر میں آ گیا۔ ہندوؤں کے دوسرے مندروں کی طرح یہاں بھی ایک تنگ سا کمرہ تھا جس میں دم گھٹ رہا تھا۔ لوبان اور ہرمل کی بو سے فضا سخت بوجھل ہو رہی تھی۔ دیوار میں پتھر کا ایک سیاہ رنگ کے سانپ کا بت بنا ہوا تھا جس نے پھن کھول رکھا تھا۔ اس کے پھن کے اوپر دو دیئے جل رہے تھے۔ سانپ کے پھن پر سیندور کا پوپا پھیرا ہوا تھا۔ ہندو عورتیں اور مرد اس کے آگے سجدے کر رہے تھے۔ میں نے سانپ کے بت کی طرف ایک نظر دیکھا۔ عورتوں پر نگاہ ڈالی۔ جس شکل کی مجھے تلاش تھی وہ شکل وہاں نظر نہیں آئی تو میں مندر سے باہر نکل آیا۔ میں چبوترے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ میں نے دو آدمیوں کو دیکھا جو قریب ہی ایک درخت کے پاس کھڑے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ یہ آدمی جب میں مندر میں داخل ہوا تو اس کے گیٹ کے ایک طرف کھڑا تھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا تھا اور جب میں مندر کے چبوترے کی طرف جا رہا تھا تو میں نے یونہی پلٹ کر دیکھا تو یہ آدمی میرے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ ہٹا کٹا آدمی تھا۔ رنگ کالا تھا۔ گردن بھینسے کی طرح موٹی تھی اور سر کے درمیان سے بودی باہر نکلی ہوئی تھی۔ اب یہی آدمی اپنے کسی ساتھی کو لے کر وہاں آ گیا تھا۔ غالباً اسے مجھ پر شک ہوا تھا کہ میں ایک اجنبی ہوں اور مندر میں آیا ہوں۔ ہو نہ ہو میں ضرور مسلمان ہوں گا۔ مجھے یکے والے ہندو نے بھی بتایا تھا کہ ان مندروں میں کسی مسلمان کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی مسلمان غلطی سے مندر میں آ جائے تو پجاری کے آدمی اسے زندہ نہیں چھوڑتے شاید ان آدمیوں کو میرے مسلمان ہونے کا علم ہوگیا تھا۔ انہیں مجھ پر کچھ نہ کچھ شک ضرور پڑ چکا تھا۔ شہر کی فضا فسادات کی وجہ سے پہلے ہی کشیدہ تھی۔

میں نے وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کرلیا لیکن تقدیر میں کچھ ایسی باتیں کاتب تقدیر لکھ دیتا ہے کہ وہ پوری ہو کر ہی رہتی ہیں۔ انسان لاکھ ہاتھ پاؤں مارے وہ ہو کر ہی رہتی ہیں۔ جب میں نے مندر سے نکل جانے کا فیصلہ کیا تو ساتھ ہی مجھے یہ خیال بھی آ گیا کہ مندر کے پیچھے بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہیے۔ ہوسکتا ہے عیار سپیرن وہاں نظر آ جائے۔ کیونکہ وہ عورت کیلاش پربت سے اتر کر اسی طرف آئی تھی۔ میں وہیں سے چبوترے کی دیوار کے عقب کی طرف گھوم گیا۔ یہ مندر کا پچھواڑہ تھا۔ یہاں نیم کے درخت ادھر ادھر اگے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ جھاڑیاں تھیں۔ کونے میں ایک کچا کوٹھا تھا جس کے باہر بندھی ہوئی بکری مے مے کر رہی تھی۔ دیوار کی ایک جانب گائے بندھی ہوئی تھی۔ یہاں سپیرن تو کجا کسی انسان کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

میں واپس جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ اچانک مجھے کسی نے پیچھے سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میں بوکھلا گیا۔ میں نے ان دیکھے آدمی کے بازوؤں

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے نکلنے کی کوشش کی تو مزید دو آدمی آ گئے اور انہوں نے آتے ہی میرے منہ میں کپڑا ٹھونسنا شروع کر دیا۔ میں نے پہچان لیا ان میں دو آدمی وہی تھے جو میرا پیچھا کر رہے تھے۔ جس نے مجھے جکڑ رکھا تھا وہ وہی بودی والا کالا کلوٹا ہندو تھا۔ میں نے شور مچانے کی بڑی کوشش کی مگر میرا منہ کپڑا ٹھونس کر بند کر دیا گیا تھا۔ اس دوران ایک ہندو نے میرے ختنے دیکھ لیے۔ وہ چلا کر بولا۔

"ارے مسلا ہے مسلا' اسے لے چلو۔ تم نے ٹھیک کہا تھا بھیکو۔"

بھیکو اس کالے کلوٹے بھینسا نما ہندو کا نام تھا جس نے سب سے پہلے پیچھے سے آ کر مجھے دبوچا تھا۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھے اور مجھے اٹھا کر سامنے کونے میں جو کوٹھا تھا اس کے اندر لے گئے اور زمین پر پھینک کر باہر سے کنڈی لگا دی۔ کسی نے کہا۔

"پجاری جی سے کہو۔ مسلمان پکڑا ہے۔ آج اماوس کی رات ہے' شو بھگوان ناگ جی نے خود ہے اپنی بھینٹ کے لیے مسلمان بھیج دیا ہے۔"

میرا خون خشک ہو گیا۔ یہ لوگ مجھے اپنے ناگ دیوتا پر قربان کرنے والے تھے۔ میں نے اللہ سے دعا مانگی۔

"اللہ پاک! مجھے ان کافروں سے بچا لے۔"

......☆☆☆......

میرے ہاتھ پیر رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔

میں اندھیری کوٹھری میں فرش پر ایک طرف منہ کر کے پڑا تھا۔ میرے ہاتھ انہوں نے پیچھے باندھے تھے جس کی وجہ سے میں سیدھا نہیں لیٹ سکتا تھا۔ یا خدا! یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں لیکن میں جس راستے پر چل پڑا تھا وہاں میرے ساتھ یہی کچھ ہونا تھا۔ کہاں بمبئی جا رہا تھا اور بغیر ٹکٹ پکڑا گیا۔ ٹی ٹی نے مجھے اندھیری رات کو جنگل میں اتار دیا۔ اس کے بعد واقعات کیسی کیسی خوفناک شکلیں اختیار کرتے چلے گئے اور میں پھنستا ہی چلا گیا۔ لیکن ابھی تو میں رسیوں سے بندھا کوٹھری میں بند تھا اور جیسا کہ ان ہندوؤں نے کہا تھا یہ لوگ ناگ دیوتا پر میری بھینٹ چڑھانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ہندوستان کے کونے کونے میں پھر کر شہروں دیہاتوں اور جنگلوں میں آوارہ گردی کر کے اور ہر قسم کی مصیبتوں میں مبتلا ہو کر مجھے ہندوؤں کی بہت سی باتوں کا علم ہو گیا تھا۔ ان کے مذہب میں میں نے ایسی ایسی باتیں دیکھی تھیں کہ جو نہ صرف درندگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھیں بلکہ تہذیب و شائستگی سے گری ہوئی اور کراہت انگیز بھی تھیں۔ مثال کے طور پر راجستھان میں کالی ناتھ کا مندر ہے جہاں چوہوں کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس مندر میں بڑے پلے ہوئے موٹے چوہے چاروں طرف بڑی آزادی سے چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ لوگ ان کے آگے دودھ حلوہ اور مٹھائیاں رکھتے ہیں۔ کراہت کی بات یہ ہے کہ وہاں بیٹھ کر لوگ جس تھالی میں مٹھائی یا دال چاول کھاتے ہیں چوہے بھی اسی تھال کے کناروں پر بیٹھ کر ساتھ ساتھ کھاتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ پوجا کرنے والے چوہوں کے منہ سے لڈو لے کر خود بڑے مزے سے کھا لیتے ہیں ذرا غور کریں۔ دنیا کا کوئی ایسا آدمی جس میں ذرا سی بھی عقل ہو گی کبھی یہ مکروہ حرکت نہیں کر سکتا لیکن راجستھان کے اس مندر میں پوجا پاٹھ کرنے آنے والے لوگ چوہوں کو اپنے کھانے کی تھالی میں بٹھا کر ان کے ساتھ کھاتے

اور ان کا جوٹھا دودھ بڑے شوق سے پیتے ہیں۔ یقین کریں پاکستان کا قیام ایک قدرتی عمل تھا۔ مسلمان اور ہندو میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہ بھی یقین کریں کہ اگر مسلمانوں میں صادق اور جعفر ایسے غدار وطن پیدا نہ ہوئے ہوتے تو پاکستان سلطان ٹیپو کے زمانے میں ہی بن چکا ہوتا۔

اگر آپ کے دونوں ہاتھ رسی سے پیچھے بندھے ہوئے ہوں اور پاؤں بھی رسی سے بندھے ہوں تو آپ زیادہ دیر تک پہلو پر لیٹے نہیں رہ سکتے۔ میرا کندھا شل ہو گیا اور میں اوندھا ہو کر لیٹ گیا۔ اس طرح تھوڑا سکون ضرور ملا مگر کبھی میں چہرہ ایک پہلو پر کرتا کبھی دوسری طرف کر لیتا۔ اس قسم کی مصیبت بھی مجھ پر پہلے نہیں پڑی تھی۔ دروازہ کوئی باہر سے کھول رہا تھا۔ میں نے دروازے پر نظریں جما دیں۔ دروازے کے کھلتے ہی دن کی روشنی بھی تین آدمیوں کے ساتھ اندر آئی تھی۔ انہوں نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ ان لوگوں کی آوازوں سے میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے مجھے یہاں باندھ کر پھینکا تھا۔

سب سے پہلے انہوں نے میری آنکھوں پر کس کر پٹی باندھ دی۔ پھر مجھے ڈولی ڈنڈا کر کے اٹھایا اور باہر لے گئے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ باہر اور اندر کا صرف اتنا فرق تھا کہ کوٹھری کے گھپ اندھیرے میں جب انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی تو اندھیرے میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ باہر چونکہ دن کی روشنی تھی اس لیے صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کچھ روشن روشن ہو گئی تھی مگر نظر پھر بھی نہیں آ رہا تھا۔ یوں لگا جیسے انہوں نے مجھے کسی اسٹریچر پر ڈال دیا ہے۔ پھر یہ اسٹریچر چل پڑا۔ کچھ دور جانے کے بعد اسٹریچر ڈھلان پر اترتا محسوس ہوا۔ مجھے ان لوگوں کے قدموں کی آواز ساتھ سنائی دے رہی تھی۔ اس کے بعد ان میں سے ایک آدمی بولا تو اس کی گونج سی پیدا ہوئی۔ معلوم ہوا کہ مجھے زمین کے نیچے کسی جگہ لے جایا جا رہا تھا۔ فضا بھی تھوڑی گرم ہو گئی تھی۔ میں زندگی سے مایوس تو نہیں ہوا تھا کیونکہ زندگی اور موت تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن لگ یہی رہا تھا کہ میری موت کا جو وقت مقرر ہوا تھا وہ وقت آن پہنچا ہے۔

اسٹریچر ایک طرف کو مڑنے کے بعد سیدھا ہو گیا پھر آہستہ آہستہ رینگنے لگا اور پھر رک گیا۔ مجھے لوبان اور ہرمل کی تیز بو آنے لگی۔ سب سے پہلے میرے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کھول دی گئیں لیکن دو آدمیوں نے دائیں بائیں سے میرے بازوؤں کو پکڑے رکھا۔ میری آنکھوں کی پٹی بھی کھول دی گئی۔ سب سے پہلے میں نے دیوار کے ساتھ لگی ہوئی مشعل کو دیکھا۔ ان طرح کی تین چار مشعلیں دیوار کے ساتھ لگی جل رہی تھیں۔ یہ ایک بڑا تہہ خانہ تھا جس کے درمیان میں پھن دار سانپ کا بت نصب تھا۔ بت کے آگے گول دائرے میں بنا ہوا گڑھا تھا گڑھے کے کنارے اونچے تھے۔ پہلے میں اسے کنواں سمجھا مگر گڑھے میں ایک آدمی چل پھر رہا تھا اس کا صرف سر مجھے نظر آتا تھا۔ وہی تین آدمی جو مجھے لے کر وہاں آئے تھے۔ انہوں نے مجھے چمڑے کی پیٹی سے اسٹریچر کے ساتھ باندھ دیا۔ اسٹریچر ایک طرف دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ میں نے آواز کو ذرا رعب دار بناتے ہوئے پوچھا۔

"تم لوگ مجھے یہاں کس لیے لائے ہو؟"

"ابھی پتا چل جائے گا کہ تمہیں یہاں کیوں لائے ہیں؟"

فرش پر سامنے والی دیوار کے ساتھ دری بچھی تھی۔ دری پر لال رنگ کے بڑے بڑے تکیے پڑے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

تینوں آدمی دری پر جا کر بیٹھ گئے اور آپس میں سر جوڑ کر بڑی رازداری سے باتیں کرنے لگے۔ تہہ خانے کا ایک دروازہ بھی تھا مگر اس دروازے کے پٹ نہیں تھے۔ دروازے پر لال رنگ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ تہہ خانے میں اترائی اتر کر آنا پڑتا تھا۔ مجھے آدمیوں کی آوازیں آئیں۔ تینوں آدمی اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ پردہ ہٹا اور مزید تین آدمی اندر آ گئے۔ ان میں دو آدمی دبلے پتلے تھے اور ایک آدمی گول مٹول اور موٹا تھا۔ اس کی توند باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ ان سب نے دھوتی بنیان پہنی ہوئی تھی۔ صرف موٹے آدمی نے کندھے پر زعفرانی پٹکا ڈال رکھا تھا۔ اس کے ماتھے پر سرخ رنگ کی تین لکیریں کھینچی ہوئی تھیں۔ یہ مندر کا بڑا پجاری لگتا تھا۔

وہ آتے ہی دری پر درمیان والے بڑے تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ باقی لوگ اس کے دائیں بائیں ادب سے بیٹھ گئے کچھ دیر تک وہاں خاموشی چھائی رہی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ لوگ شاید یہاں خاموشی کا کوئی چلہ کاٹنے آئے ہیں۔ بڑے پجاری نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ایک آدمی جلدی سے اٹھ کر تہہ خانے سے نکل گیا۔ کوئی تین منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ اپنے ساتھ تین عورتوں کو لے کر آ گیا۔ ان عورتوں نے بھڑکیلے رنگوں کی ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ بالوں میں سرخ پھولوں کے گجرے تھے۔ اور چہروں پر زبردست میک اپ کیا ہوا تھا۔ تینوں عورتیں باری باری موٹے پجاری کے پاس گئیں۔ جھک کر اس کے پاؤں چھو کر ماتھے پر لگائے اور بڑے ادب سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئیں۔ تینوں نے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ بڑے پجاری نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"پاربتی جی کا ناچ شروع ہو۔"

شو دیوتا کو ہندو تباہی بربادی کا دیوتا مانتے ہیں۔ اس دیوتا کے سر پر بالوں کا جوڑا بندھا ہوتا ہے اور جوڑے میں ایک سانپ پھن کھولے بیٹھا دکھایا جاتا ہے۔ وہ سانپ شو دیوتا کے بازوؤں سے اور ایک سانپ اس کی گردن سے بھی لپٹا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ پاربتی اس دیوتا کی بیوی کا نام ہے انڈیا میں سانپوں کی پوجا کرنے والے شو کو ہی اپنا بڑا دیوتا مانتے ہیں اور دور دراز دیہات اور جنوبی ہند کے علاقوں میں آج بھی سانپ دیوتا کے آگے زندہ عورتوں اور بچوں کی قربانی دی جاتی ہے۔

پجاری کا اشارہ پا کر تینوں عورتیں اٹھیں اور درمیان میں سانپ کا جو بڑا سا بت رکھا ہوا تھا اس کے گرد ڈانس کرنے لگیں۔ وہ ساتھ ساتھ خدا جانے کس زبان کا کوئی گیت بھی گا رہی تھیں۔ میں اسٹریچر پر تقریباً نیم جان پڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ یہ ساری تیاریاں میری موت کی تیاریاں تھیں۔ یہ لوگ خدا جانے مجھے کیسی اذیت ناک موت مارنے والے تھے۔ بس میں دل میں خدا کے حضور دعائیں مانگ رہا تھا۔ رقص جاری تھا کہ دری پر بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے دو آدمی اٹھے۔ سانپ کے بت کے پیچھے گئے اور وہاں پڑے ہوئے دو ڈمرو اٹھا کر لے آئے اور ڈمرو بجاتے ہوئے وہ بھی رقص کرنے والی عورتوں میں شامل ہو کر سانپ کے بت کے گرد چکر لگانے لگے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد رقص کرنے والی عورتیں اور ڈمرو بجانے والے مرد سانپ کے مجسمے کے آگے جو اونچی منڈیر والا گڑھا کھدا ہوا تھا اس کی ایک جانب قطار بنا کر کھڑے ہوگئے۔ آدمی ڈمرو بجا رہے تھے مگر عورتیں رقص کرنے کی بجائے گانا گا رہی تھیں اور ہاتھ باندھ کر دائیں بائیں جھوم رہی ہیں۔ اب موٹا پجاری اٹھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا سانپ کے بت کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا۔ گیت اور ڈمرو کی آواز تھم گئی۔ پجاری نے ہاتھ باندھ کر سانپ کے بت پر نگاہیں جما کر اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے اس دوران باقی آدمیوں نے سب سے پہلے میرے ہاتھ ایک بار پھر پیچھے رسی سے کس کر باندھ دیئے۔ پیٹی کھول کر مجھے اسٹریچر سے اتارا اور بازوؤں سے پکڑ کر سانپ کے بت کے سامنے گڑھے کی منڈیر کے پاس لے آئے۔

جیسے ہی میں گڑھے کی منڈیر یا دیوار کے پاس آیا ڈمرو بجانے والوں نے زور زور سے ڈمرو بجانا اور عورتوں نے دوبارہ گانا شروع کر دیا۔ ایک بار پھر وہاں شور مچ گیا۔ اسی شور میں دو آدمیوں نے مجھے پیچھے سے اٹھا کر گڑھے میں پھینک دیا۔ میں گڑھے میں مٹی کے ڈھیر پر گرا۔ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا سر منڈیر سے تھوڑا اونچا تھا مگر میں باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ میں ان لوگوں کا منہ تک رہا تھا جو مشعلوں کی روشنی میں عورتوں کے ہاتھ پکڑ کر دیوانہ وار ڈانس کر رہے تھے۔ پجاری میرے سامنے کھڑا زور زور سے اشلوک پڑھ رہا تھا۔

پھر ایک دم سے شور تھم گیا۔

پجاری نے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ فوراً تین آدمی دیواروں پر سے مشعلیں اتار کر لے آئے اور یہ مشعلیں گڑھے کی دیوار پر لگے ہوئے کنڈوں میں پھنسا دی گئیں۔ ان کی روشنی گڑھے میں بھی پڑنے لگی۔ میں نے دیکھا۔ گڑھے میں مٹی ہی مٹی تھی اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے یہی سمجھا کہ یہ لوگ مجھے گڑھے میں پھینک کر چلے جائیں گے۔ ان کا مقصد یہ ہوگا کہ میں یہاں بھوکا پیاسا رہ کر اپنے آپ مر جاؤں لیکن میری یہ خوش فہمی فوراً ہی دور ہوگئی۔ دو آدمی گڑھے میں اتر گئے۔ انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر گڑھے کی دیوار کے ساتھ لگا کر زبردستی بٹھا دیا اور پیچھے دیوار میں لوہے کی ہک لگی تھی' مجھے رسی سے اس ہک کے ساتھ اس طرح باندھ دیا کہ میں اٹھ نہیں سکتا تھا۔ دونوں آدمی گڑھے میں سے باہر نکل گئے۔ میں اوپر دیکھ رہا تھا۔ باہر خاموشی چھا گئی تھی۔ پر کسی نے گڑھے کی دیوار کے اوپر بڑا سا ٹوکرا لا کر رکھ دیا۔ میں نے مشعلوں کی روشنی میں ایک آدمی کو دیوار پر چڑھتے دیکھا۔ وہ ٹوکرے کے پاس کھڑا ہوگیا۔ اس نے کوئی نعرہ لگایا۔ جس کے جواب میں دوسرے آدمیوں نے بھی نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ نعروں کے شور میں دیوار پر کھڑے آدمی نے ٹوکرے کا ڈھکنا اٹھا کر پرے پھینکا اور ٹوکرا میرے اوپر الٹ دیا۔ میری چیخیں نکل گئیں۔

ٹوکری میں سانپ تھے جو میرے اوپر آ گرے اور پھنکاریں مارنے لگے۔ میری چیخوں کی آواز پر باہر عورتوں اور مردوں نے اونچی آوازوں میں اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ باہر پھر ایک شور مچ گیا۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ یہ لوگ گڑھے کے گرد چکر لگا رہے ہیں لیکن گڑھے میں کوئی نہیں جھانک رہا تھا۔ گڑھے کے اندر میرے ساتھ ایک عجیب بات ہوگئی۔ مجھ پر سانپوں کا جو ٹوکرا پھینکا گیا تھا اس میں چھوٹے بڑے کتنے ہی سانپ تھے۔ سانپ مجھ پر گرتے ہی پھنکارنے اور میری گردن کندھوں اور بازوؤں پر چڑھنے لگے لیکن فوراً ہی خدا جانے کیا بات ہوئی کہ ایک ساتھ سارے کے سارے سانپ میرے جسم سے اتر گئے۔ ان کی پھنکاریں خاموش ہوگئیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سارے کے سارے سانپ جو بیس پچیس ضرور تھے مجھ سے پانچ فٹ کے فاصلے پر اکٹھے ہو کر کنڈلیاں مار کر بیٹھ گئے اور میری طرف پھن اٹھا کر دیکھنے لگے۔

میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ شاید خدا نے میری فریاد سن لی تھی اور سانپوں کو مجھ سے الگ کر دیا تھا۔ پھر یہ خیال آیا کہ شاید سانپ باری باری

WWW.PAKSOCIETY.COM

آگے آئیں گے اور مجھے ایک ایک کر کے کاٹتے چلے جائیں گے۔ پجاری نے شاید انہیں اسی طرح سدھایا ہوا ہو مگر ایسی بھی کوئی بات نہ ہوئی۔ ایک منٹ دو منٹ گزر گئے اور سانپ اپنی جگہ پر بیٹھے مسلسل میری طرف تکتے رہے۔ اس دوران باہر ڈمرو اور عورتوں مردوں کے اونچی اونچی اشلوک پڑھنے کی آوازیں تیز ہوتی گئیں شاید وہ مجھے اس وقت دیکھنا چاہتے تھے جب سارے سانپ نے مجھے کاٹنے کے بعد میرا جسم نوچ نوچ کر ادھیڑ چلے ہوں۔

اچانک کسی مرد نے اونچی آواز میں نعرہ بلند کیا۔ اس کے ساتھ ہی گانے اور ڈمرو کی آواز خاموش ہوگئی۔ میں نے اوپر گڑھے کی منڈیر کی طرف دیکھا۔ وہاں کتنے ہی انسانی چہرے مجھے اس طرح بندھا ہوا بیٹھا اور سانپوں کو ایک جگہ کنڈلی مارے پھن کھولے بیٹھا دیکھ کر حیران تھے۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے گڑھے میں مجھے اور سانپوں کو دیکھ رہے تھے۔

پجاری نے ایک آدمی کو زور سے بازو ہلا کر کہا۔

''سلاخ چلاؤ۔ جلدی کرو۔ وقت نکلا جارہا ہے۔''

ایک آدمی نے لمبی سلاخ گڑھے میں ڈالی۔ سلاخ آگے سے مڑی ہوئی تھی۔ اس نے سلاخ سے ایک سانپ کو پکڑا اور میرے اوپر ڈال دیا۔ سانپ نے پھنکار ماری اور جیسے میرے جسم سے خوف زدہ ہو کر جلدی سے بھاگ کر دوسرے سانپوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ یہ بات میری سمجھ سے بھی باہر تھی کہ آخر سانپ مجھ سے خوف کھا کر کیوں بھاگا ہے۔ پجاری اوپر سے دوسرے آدمیوں اور عورتوں کے ساتھ گردن نکالے یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے سلاخ والے آدمی کو غصے میں کہا۔

''سارے سانپ اس مسلے کے اوپر ڈال دو۔''

سلاخ کی مدد سے باری باری دو دو تین تین کر کے میرے اوپر سانپ پھینکے گئے مگر ہر بار یہی ہوا کہ جیسے ہی سانپ میرے جسم پر گرتا وہ تڑپ کر ایک طرف کو چھلانگ لگاتا اور تیزی سے رینگتے ہوئے دیوار کے پاس جا کر بیٹھ جاتا۔ اب پجاری اور اس کے آدمی حیران ہونے کے ساتھ کچھ خوف زدہ بھی ہوگئے تھے۔ ادھر مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وجہ جو بھی ہو لیکن یہ سانپ مجھے کاٹیں گے نہیں۔ میں نے سوچا اس موقع سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہیے۔ کوئی پتا نہیں کچھ دیر کے بعد ان سانپوں کا خوف دور ہو جائے اور یہ مجھ پر حملہ کردیں۔ میں نے چہرہ اوپر اٹھا کر رعب دار آواز میں کہا۔

''تم دیکھ رہے ہو کہ ان سانپوں نے مجھے کچھ نہیں کہا اور میرے غلام بن گئے ہیں۔ نیچے آکر میری رسیاں کھول دو نہیں تو میں ان سانپوں کو حکم دوں گا اور تم سب کو اوپر آکر ڈس لیں گے۔''

بڑا پجاری اس کے ساتھی اور عورتیں پہلے ہی مجھ سے بے حد متاثر ہوچکی تھیں۔ کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ سانپوں نے مجھے کچھ نہیں کہا اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ جب میں نے رعب دار آواز میں انہیں اپنی رسیاں کھولنے کا حکم دیا تو فوراً ایک آدمی سیڑھی لگا کر گڑھے میں اتر آیا۔ اس نے میری رسیاں کھول دیں اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''شما کردیں مہاراج!''

میں گڑھے سے باہر نکلا تو سب ہاتھ جوڑ کر ادب سے کھڑے تھے۔ بڑے پجاری نے کہا۔

''مہاراج! آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ آپ شودیوتا کے داس ہیں۔''

میں نے کہا۔

''اگر میں پہلے بتا دیتا تو اس کا یہ اثر نہ ہوتا جو اب ہوا ہے۔ تم میں سے کسی نے میری بات کا یقین نہیں کرنا تھا۔''

پجاری نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''مہاراج! آپ تو مسلمان ہیں پھر شو مہاراج کے اتنے پوتر داس کیسے بن گئے؟'' میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

''خبردار موٹے پجاری! ایسی باتیں مت پوچھو۔ یہ راز ہے جس کو تم نہیں سمجھ سکتے۔ فوراً میرے اشنان اور بھوجن پانی کا بندوبست کیا جائے۔''

وہ لوگ بڑے احترام کے ساتھ مجھے تہہ خانے سے نکال کر مندر کے ایک خاص کمرے میں لے گئے جہاں فرش پر قالین بچھا تھا۔ تکئے لگے تھے۔ میں نے غسل کیا۔ کھانا کھایا اور بڑے مزے سے ٹانگیں پسار کر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہوگیا۔ ایک آدمی میرے بازو اور دو آدمی میرے پاؤں دبا رہے تھے۔ یہ راز بعد میں کھلا کہ ٹوکرے کے سانپ مجھ سے خوف زدہ ہو کر یا میرا ادب کرتے ہوئے ایک طرف ہٹ کر کیوں بیٹھ گئے تھے۔ یہ سارا کرشمہ اس رومال کا تھا جس میں میں نے پاروتی کی لاش کے دونوں ٹکڑے پہلے باندھے ہوئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ سانپ کے ٹکڑے ٹین کے ڈبے میں بند کرتے وقت یہ رومال میں نے پھینکا نہیں تھا۔ اس رومال میں پاروتی کے جسم کی بو رچی ہوئی تھی ان سانپوں کو مجھ سے پاروتی کی بو آئی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے مجھے کچھ نہیں کہا تھا۔ پاروتی بہت بڑی طاقت بن چکی تھی اور سارے سانپ اس کا احترام کرتے تھے۔ اب میں آسانی سے عیار سپیرن کا سراغ لگا سکتا تھا۔

......☆☆☆......

مندر کا بڑا پجاری میرے آگے بچھا جارہا تھا۔ میری بہت زیادہ ٹہل سیوا کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ عیار سپیرن کا اسی سے کھوج لگوانا چاہیے۔ میں نے اپنی آواز میں جلال پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''تم لوگوں نے مجھے رسیوں سے باندھا۔ مجھے سانپوں کے گڑھے میں پھینکا۔ تم اندھے اور بہرے ہو۔ تم جھوٹے پجاری ہو۔ میری شکل صورت سے تم لوگ یہ اندازہ بھی نہ لگا سکے کہ میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں۔ بلکہ شودیوتا کا خاص اوتار ہوں۔ موٹا پجاری ہاتھ باندھ کر دوزانو بیٹھ گیا۔ عاجزی سے بولا۔

''مہاراج شما کردیں۔ ہم سے بھول ہوگئی۔''

میں نے کہا۔ ''تم سے تو اس مندر کے سانپ اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ جنہوں نے مجھے فوراً پہچان لیا اور ادب سے ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ تم جھوٹے پجاری ہو۔ تمہیں تمہاری غلطی کی سزا ضرور ملے گی۔''

موٹا پجاری گڑگڑانے لگا۔ میں نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں صرف ایک صورت میں معافی مل سکتی ہے۔''

''کیا مہاراج۔'' پجاری نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

میں نے کہا۔ ''اس شہر گورکھ پور میں اس وقت ایک مکار سپیرن موجود ہے۔ ہم پاروتی دیوی کا پجاری سانپ لے کر کیلاش پربت کو جارہے تھے کہ اس مکار سپیرن نے وہ سانپ چرا لیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے لیکن ہم تمہیں بھی سزا دینا چاہتے ہیں۔ فوراً اس کا کھوج لگاؤ اور اسے پکڑ کر ہمارے سامنے پیش کرو۔''

جب میں نے موٹے پجاری کو سپیرن کا حلیہ بتایا تو وہ پکار اٹھا۔

''مہاراج یہ ضرور دھنوتی سپیرن ہے۔ وہ بڑی مکار ہے مہاراج۔ مجھے معلوم ہے اس کا ڈیرہ کہاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ میں ابھی اسے پکڑ کرلاتا ہوں۔"

مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ پاروتی مجھے مل جائے گی۔ موٹے پجاری کو میں نے اسی وقت سپیرن کی تلاش کے لیے روانہ کردیا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وہ عیار سپیرن کو پکڑے چلا آرہا ہے۔ اس نے سپیرن کو میرے بارے میں ضرور بتادیا ہوگا کہ میں شودیوتا کا ایک روپ ہوں اور سانپ مجھے سجدہ کرتے ہیں۔ کیونکہ سپیرن مجھے پہچاننے کے باوجود آتے ہی میرے قدموں پر گر پڑی اور معافیاں مانگنے لگی۔ میں نے زوردار آواز میں کہا۔

"پاروتی دیوی کا پجاری سانپ کہاں ہے؟"

اس نے قمیص کے اندر سے تھیلی نکال کر میرے قدموں میں رکھ دی اور ہاتھ باندھ کر بولی۔

"مہاراج سانپ اس میں موجود ہے۔"

میں نے تھیلی کھول کر دیکھا۔ اس میں پاروتی ناگن کے ٹکڑے موجود تھے۔ اسی وقت تھیلی میں نے اپنے قبضے میں کرلی اور موٹے پجاری سے کہا۔

"اس چور سپیرن کو لے جاکر تین دن کے لیے اندھیری کوٹھری میں بند کردو۔"

پجاری کے داس اسی وقت سپیرن کو پکڑ کرلے گئے۔ اب میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہاں میرا راز کھل جاتا یعنی پاروتی کا وہ رومال جس کی وجہ سے سانپ میری پوجا کرتے تھے گم ہوجاتا مجھے وہاں سے نکل کر کیلاش پربت کی طرف روانہ ہوجانا چاہیے تھا۔ چنانچہ میں نے موٹے پجاری سے کہا۔

"ہم صبح صبح کیلاش کی طرف روانہ ہوجائیں گے۔ ہمارے لیے سواری کا بندوبست کیا جائے۔"

رات میں نے موٹے پجاری کے کمرے میں گزاری۔ صبح کو اٹھا تو باہر تین خچر موجود تھے۔ ایک خچر پر کھانے پینے کا سامان لدا ہوا تھا اور دوسرے خچر پر ایک نوکر سوار تھا۔ اس نوکر کو میرے ساتھ محافظ کے طور پر سفر کرنا تھا۔ میں اپنے خچر پر بیٹھ گیا۔ سارے پجاری مجھے الوداع کہنے کے لیے باہر موجود تھے۔ میں بڑی شان سے وہاں سے روانہ ہوگیا۔

مندر سے نکلنے کے بعد میں نے اپنا رخ گورکھ پور کے ریلوے اسٹیشن کی طرف کردیا۔ ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر میں خچر سے اتر گیا اور نوکر سے کہا کہ وہ بیرگنج کے مندر کے باہر میرا انتظار کرے اور اسے کہا۔ "اگر میں پہلے پہنچ گیا تو میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔"

نوکر دونوں خچر لے کر چل پڑا۔ گورکھ پور سے بیرگنج تک نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ اور وہاں بہت شارٹ کٹ یعنی مختصر فاصلے والے راستے بھی تھے۔ بیرگنج سے آگے کیلاش پربت تک دشوار گزار پہاڑی سفر شروع ہوتا تھا۔ چنانچہ میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر بیرگنج جانا چاہتا تھا' میں ٹکٹ لے کر گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ گاڑی آئی تو میں اس میں سوار ہوگیا۔

بیرگنج پہنچ کر بڑے مندر میں آ گیا۔ نوکر ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ دوپہر کے وقت نوکر بھی آ گیا۔ وہاں سے ہمارا پہاڑی سفر شروع ہوگیا۔ یہ کافی مشکل سفر تھا۔ کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ راستے میں بے شمار گھاٹیاں اور ندی نالے آئے۔ خچروں کی وجہ سے ہمارا سفر آسانی سے کٹتا چلا گیا۔ راستے میں ہی ہمیں رات آ گئی۔ بارش بھی شروع ہوگئی۔ ایک ٹیلے کے دامن میں ایک چھوٹا سا مندر نظر پڑا۔ ہم خچروں کو لے کر وہاں چلے گئے۔ وہاں پر کوئی پجاری نہ تھا۔ نہ کسی دیوی دیوتا کا بت ہی تھا۔ ایک خالی کوٹھڑی تھی جس کی شکل مندر کی طرح کی تھی۔ ساری رات موسلا دار مینہ برستا رہا۔ صبح ہوئی تو ہم کیلاش پربت کی طرف چل پڑے۔ بارش ختم ہوچکی تھی۔ پہاڑوں کی

بارش ایسی ہوتی ہے کہ کہیں پانی وغیرہ کھڑا نہیں ہوتا۔ صرف درخت' جھاڑیاں اور گھاس گیلی تھی۔ درختوں کے نیچے سے گزرتے تو شاخوں پر رکا ہوا پانی ٹپ ٹپ ہم پر گرتا۔ سارا دن سفر کرتے رہے۔

نوکر کو کیلاش پربت کے ناگ مندر کا راستہ معلوم تھا۔ سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے ہمیں دور اوپر ایک جگہ پہاڑیوں میں مندر کے عکس دکھائی دیئے۔ نوکر نے مجھے وہ عکس دکھاتے ہوئے کہا۔

"مہاراج وہ ہے کیلاش پربت کا ناگ مندر۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پاروتی کا ناگن کے روپ میں کٹا ہوا جسم تھیلی میں بند میرے پاس تھا۔ کیلاش پربت کے مندر کے احاطے میں آ کر ہم خچروں سے اتر پڑے۔ وہاں کوئی آدمی دکھائی نہ دیا۔ نوکر کہنے لگا۔

"مہاراج سردیوں میں یہاں یاتری نہیں آتے۔ صرف بڑا پجاری موجود ہوتا ہے۔ میں اسے جاکر بلاتا ہوں۔"

میں نے اسے جانے دیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ پجاری کے آگے میری بڑھ چڑھ کر تعریف کرے گا۔ تھوڑی دیر میں ایک گول مٹول توند والا ناٹے قد کا پجاری نوکر کے ساتھ مندر کے برآمدے میں نمودار ہوا۔ اس نے آتے ہی میرے قدم چھوئے اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"ہمارے دھن بھاگ مہاراج کہ آپ ہمارے مندر میں تشریف لائے۔"

میں نے بڑی شان سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے لیے ایک علیحدہ کمرے کا انتظام کردو۔ ہم کچھ روز یہاں رہ کر شودیوتا کی پوجا کریں گے۔"

"تشریف لائیے مہاراج۔"

مجھے اسی مندر میں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ جو شاید وہاں سب سے آرام دہ کمرہ تھا۔ کیلاش پربت کی ان پہاڑیوں میں کافی سردی تھی۔ مجھے پہننے کے لیے پجاری نے ایک اونی فرغل بھی دیا۔ کمرے میں بڑا سا آتشدان تھا۔ اس میں آگ روشن کردی گئی۔ نوکر کو میں نے وہیں سے واپس جانے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ میرے پاؤں چھو کر واپس چل دیا۔ پجاری میرے لیے کھانا اور گرم قہوہ لے کر آ گیا۔ میں کھانا کھاتا رہا اور وہ میرے سامنے ادب سے ہاتھ باندھے بیٹھا رہا۔

میرا بستر لگادیا گیا تھا۔ آتشدان میں جلتی ہوئی آگ کی وجہ سے کمرے میں ہلکی سی گرمائش تھی۔ میں کھانا کھانے کے بعد قہوہ پینے لگا۔ پجاری بولا۔

"مہاراج اگر آپ کا حکم ہو تو میں رات کو سونے سے پہلے دیوتاؤں کا رس پیش کروں۔"

میں سمجھ نہ سکا کہ دیوتاؤں کا رس کیا ہوتا ہے۔ میں سمجھا کوئی خاص قسم کا قہوہ ہوگا۔ میں نے کہا۔

"ہاں! تمہیں اجازت ہے اب تم جاسکتے ہو۔"

پجاری چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے بڑے تھیلے میں سے پاروتی کے جسم کے ٹکڑوں والی تھیلی نکالی۔ اسے کھول کر سانپ کے ٹکڑوں کو غور سے دیکھا۔ ان کا رنگ سیاہ ہوتا جارہا تھا۔ مجھے ان ٹکڑوں کو جتنی جلدی ہوسکے کسی ڈبے میں بند کرکے اس مندر کے تالاب میں ڈبو دینا اور پھر دس روز تک وہاں انتظار کرنا تھا۔ پجاری سے میں نے پوچھ لیا تھا۔ تالاب جسے کیلاش سرودر بھی کہتے تھے مندر کے پیچھے تھا۔ رات ہوگئی تھی۔ مندر میں چراغ روشن ہوگئے تھے۔ ایک بڑا چراغ میرے کمرے میں بھی جل رہا تھا۔ میں کمرے سے نکل کر اونی فرغل کو جسم کے گرد لپیٹے تالاب کے مشاہدے کے لیے چل پڑا

WWW.PAKSOCIETY.COM

مندر کے پیچھے ایک لمبا چوڑا برآمدہ تھا۔ اس برآمدے کے آگے سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا تالاب بنا ہوا تھا۔ جس میں کنول کے پھول بھی کھلے تھے اور مچھلیاں بھی کناروں پر جلتے چراغوں کی روشنی میں تیرتی نظر آ رہی تھیں۔ سردی بڑی شدید تھی۔ اوپر ہمالیہ کی برف پوش پہاڑیاں دن کے وقت مجھے صرف نظر آئی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں نے یہی سوچا کہ رات کے پچھلے پہر جب مندر کے سارے آدمی گہری نیند سو رہے ہوں گے تو پاروتی کے جسم کے ٹکڑوں کو ڈبے میں بند کر کے تالاب میں ڈبودوں گا۔ مجھے کسی ایسے ڈبے کی تلاش تھی جس میں تالاب میں ڈوبنے کے بعد پانی داخل نہ ہو سکے۔ کمرے میں مجھے کچھ شیشے کی بوتلیں پڑی تو مل گئیں مگر ڈبہ نہ ملا۔ میں نے سوچا کہ سانپ کے ٹکڑوں کو کسی بوتل میں بند کر کے تالاب میں ڈال دیتا ہوں مگر مشکل یہ تھی کہ بوتل ڈوب نہیں سکتی تھی۔ فوراً تالاب کی سطح پر آ جاتی۔

اس کا میں نے ایک حل تلاش کر لیا۔ میں نے سوچا کہ بوتل کے ساتھ ایک پتھر باندھ دوں گا۔ پھر خیال آیا کہ پاروتی نے بوتل کا نہیں کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے کسی ڈبے میں بند کر کے تالاب میں ڈالنا مگر وہاں ڈبہ کہیں سے نہیں مل رہا تھا۔ میں بستر پر کمبل اوپر کر کے بیٹھ گیا۔ آتشدان میں آگ مدھم پڑ گئی تھی۔ کمرہ خوب گرم ہو گیا تھا۔ اتنے میں دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔

''کون ہو تم؟'' میں نے رعب سے پوچھا۔

کسی عورت کی آواز آئی۔ ''مہاراج میں ہوں رکمنی۔''

میں نے سوچا مندر کی نوکرانی ہے۔ پجاری نے میرے لیے کوئی مٹھائی وغیرہ بھیجی ہو گی۔ میں نے کہا۔ ''اندر آ جاؤ۔''

دروازہ کھلا اور ایک نوجوان عورت ہاتھوں میں طشت لیے سر جھکائے بڑے ادب سے چلتی داخل ہوئی۔ میرے پلنگ کے پاس آ کر اس نے طشت پتھر کی تپائی پر رکھ دیا اور ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا لائی ہو؟''

وہ بولی۔ ''مہاراج جی نے سوم رس بھیجا ہے۔''

سوم رس؟ میں سوچنے لگا۔ اف میرے خدایا! پجاری نے جو دیوتاؤں کا رس بھجوانے کے لیے کہا تھا وہ یہ سوم رس ہی تھا۔ سوم رس اس علاقے کی دیسی شراب تھی۔ میں نے رکمنی سے کہا۔

''رکمنی ہم جب یاترا پر آتے ہیں تو سوم کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ اسے واپس لے جاؤ۔''

''جو حکم مہاراج۔''

وہ طشت اٹھا کر واپس دروازے کی طرف گئی تو میں نے کہا۔

''رکمنی ہمیں شو دیوتا کی چتا کے بال رکھنے کے لیے ٹین کے بند ڈبے کی ضرورت ہے۔ کہیں سے ہمیں ٹین کا ڈبہ لا دو۔''

رکمنی نے گردن جھکا کر کہا۔ ''جو حکم مہاراج۔''

وہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ٹین کا گول ڈبہ تھا۔ میں نے ڈبہ لے کر چراغ کی روشنی میں دیکھا۔ یہ لپٹن چائے کا ڈبہ تھا۔ مجھے ایسے ہی ڈبے کی ضرورت تھی۔ میں نے رکمنی سے کہا۔ ''اب تم جا سکتی ہو رکمنی۔''

وہ ادب سے سر جھکا کر واپس چلی گئی۔ میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا لی۔ پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔ ڈبے کو کھول کر دیکھا۔ اس کا ڈھکنا ایسا تھا کہ ایک بار بند ہونے کے بعد مشکل سے کھلتا تھا۔ میں

نے سانپ کے ٹکڑوں والی تھیلی کھول کر اس میں سے پاروتی کے جسم کے ٹکڑے نکال کر بڑی احتیاط سے رکھ دیئے اور کہا۔

''پاروتی مجھے یقین نہیں آتا کہ تم دوبارہ زندہ ہو کر انسانی شکل میں واپس آ سکو گی۔''

مجھے تو اس وقت تک یہ بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ناگن سے عورت اور عورت سے پھر ناگن بن جاتی ہے۔ میں اس وقت بھی اور آج بھی اسے اپنی آنکھوں کا فریب سمجھتا ہوں۔ بہرحال جب آدمی گھر سے ایڈونچر کرنے نکلتا ہے اور خاص کر ہندوستان کے جنوبی جنگلوں میں سفر کرتا ہے تو اس کے ساتھ عجیب و غریب واقعات پیش آتے ہیں۔ یہ وہ جنگل ہیں جہاں قدم قدم پر توہمات اور پراسرار اور ناقابل یقین واقعات سے واسطہ پڑتا ہے۔

میں نے پاروتی کے ٹکڑوں کو ڈبے میں اچھی طرح سے بند کر کے اپنے سرہانے کے نیچے رکھ لیا۔ اس کے بعد سو گیا۔ صبح صبح میری آنکھ کھل گئی۔ یہ بات میں نے تجربہ کر کے دیکھی تھی کہ اگر آدمی کو صبح صبح اٹھنا ہو اور وہ اپنے آپ سے یہ کہہ کر سو جائے کہ میں صبح چار بجے اٹھ بیٹھوں گا تو ٹھیک چار بجے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ رات کو میں بھی اپنے دل سے یہی کہہ کر سویا تھا کہ میں منہ اندھیرے جاگ جاؤں گا۔

اس وقت ابھی رات کا اندھیرا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ میرے کمرے کا چراغ بجھ چکا تھا۔ آتشدان کی آگ بھی اتنی مدھم پڑ گئی تھی کہ لکڑی کے انگاروں پر سفید راکھ کی تہہ چڑھ چکی تھی۔ میں نے پاروتی کے ٹکڑوں والا ٹین کا چوکور ڈبہ غل کے اندر چھپایا۔ سر پر چادر ڈالی اور آہستہ سے کنڈی کھول کر کمرے سے نکل گیا۔ باہر سخت سردی تھی۔ یہ ہمالیہ کے پہاڑوں کی سردی تھی۔ تیز ہوا نہیں چل رہی تھی مگر ہوا ایسے لگتا تھا جیسے سردی کی وجہ سے جم گئی ہے۔ پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر کہر کے بادل اترے ہوئے تھے۔ میں دبے پاؤں چلتا مندر کے عقبی برآمدے میں آ گیا۔ تالاب دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ میں نے باریک رسی رات کو ہی سنبھال کر رکھ لی تھی۔ تالاب کے پاس جا کر میں نے ایک بڑے سے پتھر کو رسی کے ساتھ باندھ کر ٹین کے ڈبے کے سات مضبوطی سے باندھ دیا اور کونے میں اسے تالاب کے پانی میں اتار دیا۔ پتھر نیچے گیا اور ٹین کے ڈبے کو بھی ساتھ ہی نیچے لے گیا۔ میرا مقصد اور میرا فرض پورا ہو گیا تھا۔ اب مجھے دس دن تک وہاں رہ کر پاروتی کے دوبارہ زندہ ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ جس کے بارے میں مجھے بالکل یقین نہیں تھا لیکن مجھے ہر حالت میں وہاں رہ کر اپنا فرض پورا کرنا تھا۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ مجھے پاروتی سے دلی محبت ہو گئی تھی اور میں دل سے یہی چاہتا تھا کہ وہ اللہ کے حکم سے دوبارہ زندہ ہو جائے۔ میرا ایمان تھا کہ اگر خدا چاہے گا تو پاروتی دوبارہ زندہ ہو کر انسانی شکل میں واپس آ جائے گی۔

میں تالاب کے پاس بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ یہاں دس دن خیریت سے گزر جائیں۔ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میں نے یہاں ٹین کا ڈبہ تالاب میں ڈالا ہے اگر کسی نے ڈبہ نکال لیا تو پاروتی نے مجھے بتا دیا تھا کہ پھر میں کبھی اس دنیا میں واپس نہ آ سکوں گی۔ پہلے میں نے سوچا کہ میں یہیں کسی جگہ گیان دھیان کرنے کے بہانے بیٹھ کر ڈبے کی نگرانی کرنا شروع کر دوں لیکن جب سردی کا خیال آیا تو یہ خیال دل سے نکال دیا۔ اس علاقے میں واقعی بے حد سردی تھی میں اٹھ کر واپس اپنے کمرے کی طرف چلا۔ ابھی برآمدے میں ہی قدم رکھا تھا کہ ایک ستون کے پیچھے سے اچانک کوئی عورت نکل کر میرے سامنے آ گئی۔ یہاں کچھ دور

WWW.PAKSOCIETY.COM

ستون کے طاق میں جلتے چراغ کی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ میں نے عورت کو پہچان لیا۔ یہ رکمنی تھی جو رات کو میرے لیے دیوتاؤں کا رس لے کر آئی تھی اور جس نے مجھے ٹین کا ڈبہ بھی لا کر دیا تھا۔

میں نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ یونہی سیر کرتا ادھر آ گیا تھا کہا۔

"یہاں صبح کا سماں بڑا اچھا ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے یہاں گیان دھیان کروں۔"

رکمنی مسکرا رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔

"مہاراج! رشی منی لوگ یہیں بیٹھ کر گیان دھیان کیا کرتے تھے۔"

مجھے شک ہوا کہ کہیں اس نے مجھے تالاب میں ڈبہ ڈالتے دیکھ نہ لیا ہو۔ میں نے پوچھا۔

"تم یہاں اس وقت کیا کر رہی ہو؟"

رکمنی نے کہا۔

"مہاراج! میں تو روز منہ اندھیرے اٹھ کر ناگ مندر کے سات چکر لگاتی ہوں۔ پرانے شاستروں میں لکھا ہے کہ جو دیوداسی دو مہینے منہ اندھیرے اٹھ کر ناگ مندر کے سات پھیرے لگائے گی اسے سورگ میں جگہ ملے گی۔"

میرا شک دور ہو گیا۔ رکمنی کو بالکل معلوم نہیں ہوا تھا کہ میں وہاں کیا کرنے آیا تھا یا میں نے تالاب میں کوئی ڈبہ ڈالا ہے۔ میں نے کہا۔

"اچھا رکمنی سکھی رہو۔"

میں اسے آشیرباد دے کر اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ کمرے کی گرم فضا میں آتے ہی مجھے سکون نصیب ہوا۔ کمرے کی فضا باہر کی کڑاکے کی سردی کے مقابلے میں گرم اور پرسکون تھی۔ گورکھ پور کے مندر کے نوکر نے کیلاش پربت کے اس ناگ مندر کے پجاری کو میرا تعارف کراتے ہوئے یہی بتایا تھا کہ میں دیوتا شو کا اوتار ہوں اور مجھے سانپ سجدہ کرتے ہیں۔ دوسرے دن پجاری میرے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ اس نے پوچھا۔

"مہاراج! کیا یہ سچ ہے کہ ناگ آپ کی پوجا کرتے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"ہاں، اس لیے کہ میں شو دیوتا کا اوتار ہوں۔ سانپ مجھے دیکھتے ہی ادب سے سر جھکا دیتے ہیں۔ اگر تمہیں یقین نہیں تو تجربہ کر کے دیکھ لو۔"

پجاری بولا۔

"مہاراج! ویسے تو مجھے آپ کے اوتار ہونے کا پورا وشواش ہے مگر میرا دل چاہتا ہے کہ میں سانپوں کو آپ کی پوجا کرتے دیکھوں۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ مکار پجاری یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میں کہیں فراڈ یا تو نہیں ہوں۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ رومال میرے پاس موجود تھا جس میں پاروتی کے جسم کی بو رچی ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے سانپ میرے قریب نہیں پھٹکتے تھے بلکہ ادب سے دور کھڑے ہو جاتے تھے۔ میں نے پجاری سے کہا۔

"اس میں دیر کس بات کی ہے۔ ابھی تمہیں یہ چمتکار دکھائے دیتا ہوں۔ کہیں سے سانپ لے آؤ۔"

پجاری کے پاس اس وقت اس کی چہیتی دیوداسی رکمنی بھی کھڑی تھی۔ اس نے رکمنی کو اشارہ کیا۔ رکمنی اسی وقت گئی اور سانپوں کی پٹاری لے کر آ گئی۔ اس وقت یہ لوگ میرے کمرے میں بیٹھے تھے۔ پجاری نے سانپوں کی پٹاری درمیان میں رکھ دی پھر اس کا منہ کھول دیا۔

پٹاری کے اندر سے تین سیاہ کالے سانپ پھنکارتے ہوئے باہر نکل آئے۔ میں اپنی جگہ پر بڑے اطمینان سے بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی

یہ سانپ مجھے دیکھ کر فوراً ایک طرف ہٹ جائیں گے اور پھر ادب سے پھن اٹھا کر اس طرح کھڑے ہو جائیں گے جیسے میری تعظیم بجا لا رہے ہوں مگر میں یہ دیکھ کر کچھ بے چین سا ہو گیا کہ سانپ میری طرف دیکھ کر ابھی تک پھنکار رہے تھے۔ ان میں سے ایک سانپ میرے قریب بھی آ گیا اور اس نے مجھے ڈسنے کی بھی کوشش کی۔ میں نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور یہ دیکھ کر میرا جسم خوف کے مارے سرد ہو گیا کہ میری جیب میں پاروتی کا رومال نہیں تھا۔ اچانک مجھے یاد آ گیا کہ پاروتی کا رومال میری دوسری پتلون میں ہے جو غسل خانے میں ٹنگی ہوئی ہے۔ میں ایک دم اٹھا اور یہ کہہ کر غسل خانے میں گھس گیا کہ "میں ابھی آتا ہوں۔"

جلدی سے اپنی دوسری پتلون سے رومال نکال کر اپنی پتلون میں ڈالا اور باہر آ کر اسی طرح بیٹھ گیا جیسے ہی میں بیٹھا تینوں سانپ ڈر کر ایک طرف ہو گئے۔ پھر وہ ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے پھن کھول لیے اور جیسے بار بار پھن جھکا جھکا کر میری تعظیم بجا لانے لگے۔

پجاری بڑا عیار آدمی تھا اس کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ سمجھ گیا ہے کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے سانپ میرے قریب نہیں آتے۔ پہلے وہ چیز میرے پاس نہیں تھی۔ میں غسل خانے سے وہ چیز لایا ہوں۔ مگر اوپر سے اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ مجھ سے بڑا متاثر ہوا ہے۔ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج! آپ سچ مچ اوتار ہیں۔"

جب وہ اور رکمنی چلے گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور دل میں فیصلہ کیا کہ اب پاروتی کا رومال ہمیشہ اپنی جیب میں رکھا کروں گا۔ مگر آگے جو کچھ میرے ساتھ ہونے والا تھا اس کی مجھے کوئی خبر نہیں تھی۔

......☆☆☆......

مجھے دس دنوں کا حساب رکھنا تھا۔ وہاں کوئی کلینڈر وغیرہ تو نہیں تھا کہ اسے دیکھ کر معلوم کرتا کہ آج کون سا دن ہے اور کل کونسا دن ہوگا۔ میں نے دیوار پر ایک جگہ کوئلے سے نشان لگانے شروع کر دیئے۔ ایک دن گزر جاتا تو ایک نشان لگا لیتا۔ میں اس ناگ مندر میں صرف پاروتی کی خاطر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے سوا مجھے وہاں مندر کے پجاری اس کی دیوداسیوں اور سانپوں کی پوجا پاٹھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دن بھر میں وادیوں گھاٹیوں میں ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا رہتا۔ رات کو تھوڑی دیر کے لیے مندر میں آ کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا۔ پجاری کو میں یہ ظاہر کرتا کہ میں گیان دھیان میں مصروف ہوں۔ حقیقت میں میں سوچ رہا تھا کہ پاروتی اگر واقعی دوبارہ انسانی شکل میں واپس آ گئی تو میں اسے ساتھ لے کر کلکتے اس کے کسی رشتے دار کے ہاں چھوڑ کر اپنے نئے آزاد وطن پاکستان چلا جاؤں گا اور پھر کبھی ان علاقوں میں آنے کا نام نہیں لوں گا۔ میں نے ان علاقوں میں بڑی تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائی تھیں۔

پجاری برابر میری خدمت کر رہا تھا۔ صبح شام مجھے اعلیٰ قسم کا کھانا میرے کمرے میں پہنچ جاتا تھا۔ کبھی نوکر لے کر آ جاتا، کبھی دیوداسی رکمنی کھانا لے کر آ جاتی۔ رکمنی کی عمر تیس برس کے قریب تھی۔ اس کی شکل سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ وہ عام طور پر خاموش رہتی تھی۔ میں بات کرتا تو وہ بھی کوئی بات کر لیتی۔ مگر اس کی آنکھوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہرے راز کو دل میں چھپائے ہوئے ہے۔ ایک ایسا راز جس کو وہ مجھ سے چھپانا بھی چاہتی ہے اور مجھے بتانا بھی چاہتی ہے۔ اپنی آوارہ گردیوں کے دوران مجھے قسم قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا اور میں لوگوں کے چہروں کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھوڑا تھوڑا پڑھ لیتا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ رکمنی کس راز کو چھپائے ہوئے ہے۔ ایک روز شام کو وہ میرے لیے کھانا لے کر آئی تو میں اس سے کیلاش پربت کی پہاڑیوں اور موسموں کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"رکمنی! تم اتنی مدت سے یہاں رہ رہی ہو۔ کبھی تم نے کسی ایسے سادھو جوگی یا سپیرے کو دیکھا ہے جو سانپ کا روپ دھار لیتا ہو؟"

رکمنی مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! میں نے ایسا کوئی سپیرا سنیاسی یا سادھو نہیں دیکھا۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ کیا آپ نے کوئی ایسا آدمی دیکھا ہے؟"

میں نے کہا۔

"نہیں، میں نے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن میں نے رشیوں سے سنا ہے کہ اگر کوئی سانپ سو سال تک زندہ رہے تو اس میں ایسی شکتی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جب چاہے انسان کی شکل بدل سکتا ہے۔"

رکمنی میری بات بے توجہی سے سن رہی تھی۔ اس نے دو ایک بار دروازے کی طرف اس انداز سے دیکھا کہ جیسے اسے شک ہو کہ کوئی ان کی باتیں سن رہا ہے۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! میں نے بھی سنا ہے مگر ابھی تک اتنی شکتی والا سانپ نہیں دیکھا۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں اس عورت کے بارے میں کچھ دیر غور کرتا رہا۔ یہ دیوداسی مجھے پراسرار لگ رہی تھی۔ دن گزرتے چلے گئے، میرے حساب سے جب نو دن گزر گئے اور دس تاریخ کی رات آئی تو میں ساری رات جاگتا رہا کیونکہ پاروتی کے جسم والے ٹین کے ڈبے کو تالاب میں پڑے دس دن ہو گئے تھے اور اب مجھے اسے رات کے پچھلے پہر تالاب سے نکالنا تھا۔ یہ بات واضح نہیں تھی کہ آیا پاروتی خود بہ خود ڈبے میں سے انسانی شکل اختیار کر کے باہر آ جائے گی یا میں اس کے جسم کے ٹکڑوں کو جوڑوں گا اور اس کے بعد وہ انسانی شکل اختیار کر کے اٹھ کھڑی ہوگی۔ جو بھی تھا مجھے رات کے پچھلے پہر سب سے پہلے پاروتی کے ڈبے کو تالاب سے باہر نکالنا تھا۔ میں نے ڈبے کو رسی سے باندھ کر تالاب کے کونے میں ڈال رکھا تھا اور رسی کو جھاڑیوں میں چھپا کر اوپر پتے اور گھاس ڈال دی تھی۔

مندر میں رات کے پچھلے پہر گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ میں ان کے بجنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئیں تو میں اونی لبادہ پہن کر کمرے سے خاموشی سے نکل کر تالاب پر آ گیا۔ میں نے گھاس پتے ہٹا کر رسی کو اندھیرے میں پکڑنے کی کوشش کی مگر رسی میرے ہاتھ نہ آئی۔ میں نے اسے ادھر ادھر ٹٹولا۔ رسی وہاں نہیں تھی۔ میں نے تالاب کے کنارے کو جھک کر دیکھا۔ اوپر سے کوئی رسی تالاب میں نہیں جا رہی تھی۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا کوئی پاروتی کے ٹکڑوں والا ڈبہ نکال کر لے گیا تھا ایسا ہی ہوا تھا۔ رسی اپنے آپ تالاب میں نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے اسے جھاڑی کے ساتھ باندھ کر رکھا ہوا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا کسی نے مجھے تالاب میں ڈبہ ڈالتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ آدمی ڈبہ نکال لے جا چکا تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک رات پہلے دیکھا تھا۔ رسی موجود تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ واردات دس تاریخ کی رات کو ہی ہوئی ہے۔ جس آدمی نے بھی ڈبہ چرایا تھا وہ ان دنوں کے پورے ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا مطلب بھی واضح طور پر نکلتا تھا کہ جس شخص نے ڈبہ نکالا ہے وہ جانتا تھا ڈبے میں کسی ایسے سانپ کے ٹکڑے بند ہیں جس نے دس دن گزرنے کے بعد انسانی شکل اختیار کرنی ہے۔

میں قدرتی طور پر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کام کسی بھیدی کا ہے اور وہاں اس راز کو جاننے والا سوائے ناگ مندر کے بڑے پجاری کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھے پجاری پر ہی شک پڑا۔ میں چپکے سے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں سخت پریشان تھا۔ دن چڑھا اور رکمنی میرے لیے دودھ لے کر آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ "اس مندر میں پجاری کے علاوہ اور کون کون رہتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے ان دنوں باہر سے کوئی جوگی یا سپیرا تو نہیں آیا؟"

رکمنی نے کہا۔

"کوئی نہیں آیا مہاراج! اس موسم میں باہر سے سادھو جوگی لوگ نہیں آتے۔"

رکمنی چلی گئی۔ اس کے چہرے کی پراسراریت بہت زیادہ نمایاں تھی۔ میں سخت بے چین تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ کام سوائے مندر کے بڑے پجاری کے اور کسی کا نہیں ہے۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ پجاری پر میرے چمتکاروں یعنی کرامت کا گہرا اثر ہے۔ اگر میں نے اسے تھوڑا سا بھی ڈرایا دھمکایا تو وہ مان جائے گا کہ تالاب میں سے ڈبہ اسی نے نکالا تھا۔

میں نے دودھ کا پیالہ جلدی جلدی پیا اور پجاری کے کمرے کی طرف تیز تیز چل پڑا۔ پجاری اپنے کمرے میں آتشدان کے پاس ہرن کی کھال پر بیٹھا وید سامنے رکھے پڑھ رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولا۔

"مہاراج! آپ نے کیوں تکلیف کی۔ مجھے بلا لیا ہوتا۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور کہا۔ "پجاری جی! میری ایک بڑی قیمتی شے چوری ہو گئی ہے۔ مجھے شک ہے کہ اسے مندر کے کسی آدمی نے چرایا ہے۔"

پجاری نے وید کی کتاب بند کر دی اور میری طرف پوری طرح متوجہ ہو کر بولا۔

"مہاراج! یہاں کبھی کسی کی کوئی شے غائب نہیں ہوئی۔ آپ کی کونسی چیز چوری ہوئی ہے؟"

میں نے ایک منٹ کے لیے سوچا۔ پھر اسے کہا۔

"میں نے مقدس گنگا کے پانی والا ڈبہ تپسیا کے لیے مندر کے تالاب میں ڈال رکھا تھا۔ آج صبح میں نے جا کر دیکھا تو ڈبہ وہاں نہیں تھا۔ میں آپ کو حکم دیتا ہوں کہ جس کسی نے میرا ڈبہ چرایا ہے اسے ڈبے سمیت میرے سامنے پیش کیا جائے۔"

پجاری بڑی عاجزی سے کہنے لگا۔ "مہاراج! میں ابھی سارے مندر کی آپ کے سامنے چھان پھٹک کرتا ہوں۔ یہاں ہمارے علاوہ دو تین دیوداسیاں ہی ہیں۔ ابھی ان سے پوچھ گچھ کرتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں اگر آپ کی چیز یہاں ہوئی تو وہ آپ کو ضرور مل جائے گی۔"

پجاری کی ان باتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ ڈبہ اس نے چوری نہیں کیا۔ میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے یہاں یا تو باہر سے کوئی چور آیا ہے یا پھر کسی دیوداسی نے تالاب میں سے ڈبہ نکال کر چھپا لیا ہے؟"

پجاری نے اسی وقت ساری دیوداسیوں کو بلا لیا۔ یہ کل چار دیوداسیاں تھیں۔ ان میں رکمنی بھی شامل تھی۔ پجاری نے بڑی سختی سے ان کو ڈانٹ ڈپٹ کی اور کہا کہ اگر ان میں سے کسی نے پوتر گنگا جل کا ڈبہ تالاب سے نکالا ہے تو بتا دے نہیں تو ان سب کو ناگ دیوتا کا شراپ بھگتنا پڑے گا۔

ساری دیوداسیاں رونے لگیں۔ انہوں نے ہاتھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

باندھ کر کہا کہ ہم نے گنگا جل کا ڈبہ دیکھا تک نہیں۔ ہم بے قصور ہیں۔ ہمیں معاف کیا جائے۔ میں نے بھی یہی اندازہ لگایا کہ ان میں سے کسی نے ڈبہ نہیں چرایا تو پھر آخر وہ کہاں چلا گیا۔ ظاہر ہے کسی بھیدی نے اسے تالاب میں سے عین دسویں دن نکالا ہے۔ میں نے اپنے طور پر سراغ رسانی کا فیصلہ کیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ دوپہر تک کمرے میں پیچ و تاب کھاتا اور سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے بار بار پجاری کا ہی خیال آتا۔ اسی پر شک پڑتا کہ یہ کام اس کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس کی کڑی نگرانی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دن کے وقت تو پجاری سب کے سامنے رہتا تھا۔ صرف رات کو وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا اور رکمنی کے کہنے کے مطابق وہ ساری رات گیان دھیان میں مشغول رہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ رات کے وقت کسی طریقے سے چھپ کر اس کی نگرانی کرنی چاہیے مگر میں اس کے بند کمرے میں نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے کمرے کی صرف ایک ہی کھڑکی تھی جو مندر کے عقبی صحن کی طرف کھلتی تھی۔ یہ کھڑکی دن کے وقت بھی اور رات کے وقت بھی بند رہتی تھی۔ ہو سکتا ہے کھڑکی میں کوئی سوراخ یا درز ہو۔ میں اس میں سے پجاری کو دیکھ سکتا تھا۔

دن میں نے اپنے کمرے میں ہی گزار دیا۔ جب رات ہو گئی اور چاروں طرف اندھیرا خاموشی چھا گئی تو میں دبے پاؤں اپنے کمرے سے نکل کر پجاری کے کمرے کی عقبی کھڑکی کے پاس آ گیا۔ کھڑکی بند تھی۔ میں آنکھ لگا کر ادھر ادھر کوئی سوراخ یا درز تلاش کرنے لگا۔ ایک جگہ چھوٹی سی درز تھی۔ میں نے اس کے ساتھ آنکھ لگا دی۔ مجھے پجاری کمرے کے وسط میں ہرن کی کھال پر آلتی پالتی مارے آنکھ بند کیے بیٹھا نظر آیا۔ وہ واقعی گیان دھیان میں مصروف تھا۔ میں دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر پجاری کا تھوڑی تھوڑی دیر بعد مشاہدہ کرتا رہا۔ وہ اسی طرح بیٹھا تھا۔ مجھے سردی لگنے لگی۔ سردی وہاں بہت زیادہ تھی اوپر پہاڑی کی طرف سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی تھی۔

میں مایوس ہو کر کمرے میں آ گیا۔ سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ پاروتی کے جسم کے ٹکڑوں کے ڈبے کا غائب ہو جانا میرے لیے بہت بڑا حادثہ تھا۔ پاروتی کے بغیر کیلاش پربت سے واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے ہر حالت میں پاروتی کے ڈبے کا کھوج لگانا تھا۔ میرے دل میں اچانک خیال آیا کہ دیوداسی رکمنی سے پوچھنا چاہیے۔ وہ پراسرار دیوداسی ہے۔ ہو سکتا ہے اسے کچھ معلوم ہو۔ صبح کے وقت جب رکمنی میرے لیے دودھ لے کر آئی تو میں نے سب سے پہلے تو رکمنی کی تعریف شروع کر دی کہ وہ سب دیوداسیوں سے بڑھ کر خوب صورت اور عقل مند دیوداسی ہے۔ رکمنی اپنی تعریف سن کر خوش بھی ہوئی اور کچھ شرما بھی گئی۔ اس لیے کہ ایک قدرتی بات تھی۔ جب میں نے اس سے کہا کہ گنگا جل والا پوتر ڈبہ میری زندگی کی سب سے قیمتی چیز ہے اور میں اس کے بغیر واپس نہیں جا سکتا تو وہ خاموش نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"رکمنی! تم مجھے مندر کی ساری دیوداسیوں سے بڑھ کر اچھی لگتی ہو۔ میری بات کا وشواش کرو کہ اگر مجھے میرا ڈبہ نہ ملا تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔"

رکمنی نے بند دروازے کی طرف ایک نگاہ ڈالی۔ جیسے اسے شک ہو کہ باہر کوئی ہماری باتیں سن رہا ہے۔ میں نے کہا۔ "بے فکر رہو۔ ہماری باتیں کوئی

نہیں سن رہا۔ اگر تمہیں کسی راز کا پتا ہے تو بے دھڑک مجھے بتا دو۔ میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ بلکہ تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔"

دیوداسی رکمنی مسلسل مجھے سنجیدہ نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔

جب میں نے اپنی بات ختم کی تو اس نے آہستہ سے ایک ایسا سوال کر دیا جس نے مجھے سر سے پاؤں تک چونکا دیا۔ اس نے میرے چہرے پر نظریں جمائے پوچھا۔

"مہاراج! اس ڈبے میں اگر گنگا جل ہوتا تو اسے چور اٹھا کر نہیں لے جا سکتا تھا۔"

میں اس کا منہ تکنے لگا۔ وہ بولی۔

"آپ خود ہی بتا دیں کہ ڈبے میں اگر گنگا جل نہیں تھا تو پھر کیا تھا؟"

میں نے رکمنی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"رکمنی! اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ ڈبہ کس نے چرایا ہے تو میں تمہیں بتا دوں گا کہ ڈبے میں کیا تھا؟"

رکمنی نے آہستہ سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! معلوم نہیں کیوں آپ مجھے اچھے لگ رہے ہیں۔ آپ جس روز یہاں آئے تھے اسی وقت سے مجھے اچھے لگ رہے ہیں۔"

میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس دیوداسی کو سارا راز معلوم ہے۔ میں اس کی تعریف کر کے اس سے یہ راز اگلوانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"رکمنی! وشواش کرو۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو تم بھی بڑی اچھی لگی تھیں۔ تم بہت خوب صورت ہو۔"

میں نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ رکمنی کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ میں نے جب دیکھا کہ لوہا گرم ہے تو اس پر ضرب لگاتے ہوئے کہا۔

"رکمنی! اگر تم مجھے بتا دو کہ میرا ڈبہ کس کے پاس ہے تو میں بھگوان شو جی کے آگے تمہارے لیے بڑی پرارتھنا کروں گا۔"

دیوداسی رکمنی کہنے لگی۔ "مہاراج! اس ڈبے میں آکاش کی کوئی اپسرا سانپ کے روپ میں بند تھی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں؟"

میں نے کہا۔ "ہاں رکمنی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اب جلدی سے یہ بھی بتا دو کہ وہ ڈبہ کس کے پاس ہے؟"

دیوداسی رکمنی نے مجھ سے ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان بیان کی۔ اس نے کہا۔

"مہاراج! بڑے پجاری کا ایک گرو دیو ہے جس کو سب راج گرو کہتے ہیں۔ آج رات وہ اچانک کیلاش پربت والے اپنے مندر سے اتر کر پجاری کے پاس آ گئے۔ میں ایک طرف کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ راج گرو نے کہا یہاں ایک شخص آیا ہے جس کے پاس ایک ایسی ناگن ہے جو انسانی شکل بدلتی رہتی ہے۔ اس ناگن کو سانپ کے روپ میں کسی نے مار ڈالا تھا۔ یہ شخص اس کی لاش کے ٹکڑے ڈبے میں بند کر کے لایا ہے اور اس نے ڈبے کو مندر کے تالاب میں دس دنوں کے لیے ڈال دیا ہے۔ اگر وہ ڈبہ ہمارے ہاتھ لگ جائے تو ہماری قسمت بدل سکتی ہے۔ راج گرو نے پجاری سے کہا کہ دس دن کے بعد یہ ناگن انسانی روپ میں ظاہر ہو جائے گی۔ میں اسے اپنے خاص منتر سے اپنے قبضے میں کر لوں گا۔ یہ ناگن زبردست طاقت کی مالک ہے۔ ہم اس کی مدد سے بھارت ورش کے سارے ناگ مندروں کو اپنے قبضے میں کر کے سب کے مہا پجاری بن سکتے ہیں۔ یہ سن کر ہمارے پجاری کو بھی لالچ آ گیا۔ اس نے کہا راج گرو ہم ابھی جا کر تالاب سے ناگن کا ڈبہ نکال لاتے ہیں۔ وہ اسی وقت تالاب پر گئے اور ڈبہ نکال کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

لے آئے۔ راج گرو نے ڈبے کو سونگھ کر کہا۔ اس میں سے ناگ کی بو آ رہی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ اوپر پہاڑوں پر اپنے مندر میں لے جا رہا ہوں۔ وہاں جا کر میں اس پر منتر پڑھ کر پھونکوں گا۔ پھر یہ ہمارے قبضے میں ہوگی۔ اسے سورج نکلنے کے بعد کھولوں گا۔"

دیوداسی رکمنی یہ داستان سنا رہی تھی اور میں حیرانی سے سن رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"راج گرو ناگن کا ڈبہ لے کر اوپر اپنے پہاڑی مندر میں چلا گیا ہے۔"

میں پریشان ہو کر کمرے میں ادھر ادھر پھرنے لگا۔ میں نے رکمنی کا بازو پکڑ کر کہا۔

"رکمنی! کیا تم مجھے اس مندر کا پتا بتا سکتی ہو جہاں راج گرو ناگن کا ڈبہ لے کر گیا ہے؟"

رکمنی نے کہا۔ "مہاراج! میں نے وہ مندر دیکھا نہیں ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ یہاں سے دو پہاڑیاں چھوڑ کر اوپر ایک راستہ جاتا ہے۔ آدمی اس راستے پر ایک دن ایک رات سفر کرلے تو ایک جھیل آجاتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ راج گرو کا مندر اسی جھیل کے آس پاس کسی جگہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں ابھی اس چور راج گرو کی تلاش میں جاتا ہوں۔"

رکمنی بولی۔ "مہاراج! راج گرو سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے چل دیا تھا اور وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ آپ اسے راستے میں نہیں پکڑ سکیں گے۔ راج گرو ضرور کسی خفیہ راستے سے جا رہا ہوگا۔ مجھے معلوم ہے ان لوگوں نے اس قسم کے کاموں کے واسطے پہاڑوں میں خفیہ ٹھکانے اور خفیہ راستے بنا رکھے ہیں۔"

میں نے رکمنی کا شکریہ ادا کیا اور اسے تاکید کی کہ وہ یہ بات کسی کو نہ بتائے کہ میں کہاں گیا ہوں۔

"میں بہت جلد اپنی چیز لے کر تمہارے پاس واپس آجاؤں گا۔"

پجاری سے اس بارے میں کوئی بات کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ڈبہ اس کے ہاتھ سے نکل کر راج گرو کے قبضے میں جا چکا تھا۔ یہ راج گرو یقیناً کوئی بڑا جادوگر قسم کا آدمی تھا جس کو اوپر پہاڑوں میں معلوم ہوگیا تھا کہ کیلاش پربت کے مندر میں کوئی شخص بڑی شکتی والی ناگن کی لاش لے کر آیا ہوا ہے۔

رکمنی کہنے لگی۔ "مہاراج! اوپر پہاڑوں میں برف جمی رہتی ہے وہاں بڑی سردی ہوتی ہے۔ میں آپ کو گرم کپڑے لا دیتی ہوں۔"

رکمنی چلی گئی۔ میں نے پاروتی کے جسم کی بو والا رومال سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیا۔ رکمنی میرے سر اور گردن کو ڈھانپ دینے والی اونی ٹوپی اور روئی کی بنڈی لائی تھی۔ میں نے اسے پہن لیا۔ میرے پاؤں میں چمڑے کے جوتے تھے۔ اندر میں نے گھٹنوں تک گرم جرابیں بھی پہن رکھی تھیں جو میں نے بیرگنج میں خریدی تھیں۔ میں نے رکمنی سے کہا۔

"اب میں جاتا ہوں۔ پجاری پوچھے تو کہہ دینا کہ میں کسی کام سے نیچے بیرگنج گیا ہوں اسے ہرگز پتا نہ چلے کہ میں راج گرو کے تعاقب میں اوپر پہاڑوں پر گیا ہوں۔"

رکمنی نے کہا۔ "میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ آپ جلدی واپس آجانا۔"

اس کی آنکھوں میں عجیب سی اداسی تھی۔ مجھے اس وقت اس کی آنکھوں کی اداسی پر غور کرنے کی واقعی فرصت نہیں تھی۔ رکمنی کہنے لگی۔ "نیچے اصطبل میں خچر بندھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک خچر لے جائیں۔ پیدل آپ نہیں جاسکیں گے۔"

میں نے رکمنی کا شکریہ ادا کیا اور خچروں کے

اصطبل کی طرف چل دیا۔

ایک خچر کو کھول کر میں اس کے اوپر بیٹھ گیا اور دیوداسی رکمنی نے مجھے جو راستہ بتایا تھا خچر کو اس راستے پر ڈال دیا۔ آسمان صاف تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ہوا بند تھی مگر سردی بہت تھی۔ شروع شروع میں راستہ دشوار گزار نہیں تھا۔ زمین غیر ہموار تھی مگر دونوں جانب جوار کے کھیت تھے اور پگڈنڈی بھی کشادہ تھی۔ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا۔ پگڈنڈی سمٹتی گئی۔ کھیتوں کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ اب کہیں کہیں کسی ڈھلان پر کوئی کھیت نظر آجاتا تھا۔ پہلے دونوں جانب پہاڑیاں دور دور تھیں۔ اب وہ قریب آرہی تھیں۔ میں ایک پہاڑی دریا میں سے گزرا جس کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ ہر طرف پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ پانی صرف درمیان میں ایک ندی کی شکل میں بہہ رہا تھا۔ میں نے اتر کر پانی میں ہاتھ ڈالا۔ وہ برف کی طرح ٹھنڈا یخ تھا۔ دوپہر کے وقت میں ایسے علاقے میں سے گزر رہا تھا جہاں گھاٹیاں، برساتی نالے اور بڑی بڑی چٹانیں جگہ جگہ کھڑی تھیں۔ یہاں پہاڑیاں خشک بنجر اور نسواری رنگ کی تھیں۔ چٹانوں کے پتھر دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ہرے بھرے جنگل پیچھے رہ گئے تھے۔ کافی بلندی پر پہاڑیوں کی ڈھلانیں اوپر برف پوش چوٹیوں تک چلی گئی تھیں۔ یہ کوہ ہمالیہ کی برف پوش پہاڑیاں تھیں۔

ابھی تک راستے میں کہیں کہیں کوئی پہاڑی گاؤں آجاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھر کی سلوں کی ڈھلواں چھتوں والے جھونپڑا نما مکان تھے۔ بیچ میں ایک تنگ سا بازار ہوتا۔ دو چار دکانیں ہوتیں۔ ایک گاؤں آیا تو میں نے خچر کو چرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ ایک دکان کے باہر بیٹھ کر روٹی کھائی۔ چائے پی۔ اس دوران خچر بھی گھاس وغیرہ چر کر تازہ دم ہوگیا تھا۔ گاؤں والوں سے آگے مندر کا راستہ پوچھا اور سفر پر روانہ ہوگیا۔ یہ ایک دن اور ایک رات کا سفر تھا۔ رکمنی نے مجھے راج گرو کے مندر کی یہ نشانی چلتے وقت بتائی تھی کہ جب مندر قریب آتا ہے تو برف پوش پہاڑیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ ابھی یہ پہاڑیاں دور اوپر مجھ سے کافی فاصلے پر تھیں۔ میں اونی ٹوپی اور اونی فرغل کی وجہ سے کافی گرم ہو کر خچر پر بیٹھا تھا۔ خچر آرام آرام سے پہاڑی راستوں پر چل رہا تھا۔ یہ ساری کی ساری چڑھائی تھی، مگر اتنی اونچی اور مشکل چڑھائی نہیں تھی۔

شام کے وقت ایک بنجر ٹیلے کی ڈھلان اتر کر ایک چھوٹی سی وادی آگئی۔ یہاں تین چار سر سبز کھیتوں میں سرو کی طرح کے اونچے چھریرے درخت کھڑے تھے۔ ایک پتھر کا چھوٹا سا مکان بھی نظر آرہا تھا۔ راستے میں خچر کو پلانے کے واسطے پانی کہیں نہیں ملا تھا۔ ان کھیتوں میں ایک جگہ چھوٹی سی پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ میں یہاں خچر سے اتر پڑا۔ خچر پانی پینے لگ گیا۔ میں نے بھی تھوڑا سا پانی پیا۔ پانی بہت سرد تھا۔ اتنے میں پتھر کے مکان میں سے ایک دیہاتی نکل کر میری طرف آیا۔ اس نے پہاڑی لہجے میں پہاڑی زبان میں مجھ سے پوچھا کہ میں اوپر کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے اسے راج گرو کے مندر کا بتایا تو وہ بولا۔

"وہ تو بہت دور برفانی پہاڑیوں کے اندر ہے۔ تم وہاں کیوں جا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "یاترا کرنے جا رہا ہوں۔"

دل میں کہا۔ "راج گرو کی گردن توڑنے جا رہا ہوں۔ مجھے تمہارے مندروں کی یاترا سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ دیہاتی میرے لیے جوار کی روٹی اور دودھ لے آیا۔ دودھ کا رنگ سرخی مائل تھا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ کس کا دودھ ہے۔ یہاں مجھے کوئی گائے تو نظر نہیں آرہی۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ بولا۔ ”یہ گھوڑی کا دودھ ہے۔“

میں نے دودھ کا پیالہ اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”شکریہ دوست! میں روٹی کے ساتھ دودھ نہیں پیا کرتا۔“

وہ دودھ واپس لے گیا اور میرے لیے گڑ لے آیا۔ میں نے گڑ کے ساتھ بڑے مزے سے جوار کی روٹی کھائی۔ ٹھنڈا پانی پیا' دل میں خیال آیا کہ یہیں رات بسر کرنی چاہیے پھر سوچا کہ ابھی کافی دن باقی ہے۔ جتنا سفر طے ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ میں نے دیہاتی کا شکریہ ادا کیا اور خچر پر سوار ہو کر آگے روانہ ہوا۔

اب کوئی باقاعدہ پگڈنڈی یا راستہ نہیں بنا ہوا تھا۔ بس سامنے والی برفانی پہاڑیوں کو نظر میں رکھ کر سفر کر رہا تھا۔ ایک پہاڑی کا موڑ گھوم کر اپنے راستے سے ہٹ جاتا تو اوپر والی برف پوش پہاڑیوں کو دیکھ کر پھر راستہ درست کر لیتا۔

جب سورج مشرقی برفانی پہاڑی چوٹیوں کے پیچھے چلا گیا تو وادی میں اور پہاڑیوں کے نشیب میں اندھیرا سا چھانے لگا۔ اس وقت مشرق کی جانب آسمان پر سیاہ کالے بادل نمودار ہوئے۔ یہ بادل میدانوں کے بادلوں سے بالکل مختلف تھے۔ میدانوں کے بادل تو اوپر اوپر سائبان کی طرح پھیلے ہوتے ہیں لیکن یہاں ہمالیہ کی بلندیوں پر بادل بالکل سامنے سے چلے آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں میں اور خچر بادلوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی اندھیری سرنگ میں داخل ہو گیا ہوں۔ بادل اس قدر ٹھنڈے اور گیلے تھے کہ میرے کندھے سردی کی وجہ سے کپکپانے لگے۔ ایک تو ویسے ہی سورج غروب ہو چکا تھا اوپر سے بادلوں نے مجھے گھیر لیا تو اور بھی اندھیرا چھا گیا۔ خچر دو ایک بار پریشان ہو کر اچھلا اور رک گیا۔ میں جلدی سے اتر پڑا اور خچر کی باگ پکڑ کر وہیں پتھر پر بیٹھ گیا۔ بادل سیاہ دھند کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ سردی سے میرے دانت بج اٹھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے بادل میرے جسم کے اندر سے ہو کر گزر رہے ہیں۔ جب بادل نہ چھٹے اور میرے اردگرد اسی طرح سیاہ دھند چھائی رہی تو میں نے خچر کی باگ پکڑ لی اور اسے کھینچتے ہوئے جس پہاڑی راستے پر چل رہا تھا اسی پر آگے چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ تک راستہ ہموار رہا۔ پھر چڑھائی شروع ہو گئی۔ کچھ دور تک چڑھائی چڑھنے کے بعد میں بادلوں سے باہر نکل آیا۔ میں نے شام کے گہرے ہوتے اندھیرے میں نیچے دیکھا۔ مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر سیاہ کالے بادل وادیوں پر ایسے پھیلے ہوئے تھے جیسے کسی نے وادیوں کو بادلوں سے بھر دیا ہو۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور خچر پر بیٹھ کر پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اوپر بھی بادلوں کے جمگھٹے آ گئے۔ آسمان پر جو غروب ہونے کے بعد سورج کی لالی سیاہ رنگ اختیار کرتی جا رہی تھی وہ ان بادلوں میں غائب ہو گئی۔ یہ بادل بہت گھنے تھے۔ ان میں رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی اور ہلکی ہلکی گرج سنائی دینے لگی تھی۔ میں نے سوچا کہ کوئی ایسی جگہ جلدی سے تلاش کرنی چاہیے جہاں بارش کا یہ جو طوفان آ رہا ہے اس سے پناہ مل سکے۔

اپنی بائیں جانب تھوڑا اوپر آڑھی ترچھی کھڑی چٹانوں کے درمیان مجھے ایک شگاف دھندلا دھندلا سا نظر پڑا۔ میں نے خچر کو اسی طرف ڈال دیا۔ ابھی میں چٹانوں کے قریب ہی پہنچا تھا کہ بجلی چمکی اور بادل بڑے زور سے گرجے پھر موٹی موٹی بارش کی بوندیں گرنے لگیں۔ میں خچر سے اترا اور اسے کھینچتے ہوئے چٹانوں کے درمیان سے ہو کر شگاف تک آ گیا۔ یہ شگاف اصل میں ایک قدرتی غار تھا۔ قدرت نے مجھے ایک بڑی اچھی پناہ گاہ عطا کر دی

تھی۔ غار کافی کھلا اور کشادہ تھا۔ زمین پر چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اصل میں یہ ایک دریا تھا جو پہاڑوں کے اندر سے بہتا ہوا یہاں نکل آیا تھا مگر سردیوں کے موسم کی وجہ سے خشک ہو رہا تھا۔ میں نے زمین کو چھو کر دیکھا۔ زمین دریا کے پاٹ کی طرح گیلی تھی۔ خچر بھی میرے ساتھ غار میں آ گیا۔

اتنی دیر میں موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ سرد ہوا بھی چلنے لگی۔ مگر غار میں ہلکی ہلکی گرمائش تھی۔ میں ہاتھ بغلوں میں دے کر غار کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ غار کے دہانے پر اوپر پتھر باہر کو نکلے ہوئے تھے جن کی وجہ سے بارش کی بوچھاڑیں اندر نہیں آتی تھیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب رات بھی اسی غار میں بسر کروں گا۔ میں کافی دیر تک بیٹھا اندھیرے میں بارش کی آواز سنتا رہا۔ کافی تیز بارش ہو رہی تھی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد بڑا تیز شور سنائی دینے لگا۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ یہ کوئی برساتی نالا تھا جس میں بارش کا ریلا اچانک آ گیا تھا اور بڑے زور وشور سے پانی بہنے لگا تھا۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں بارش کا پانی تو نہیں آ رہا تھا مگر سرد ہوا کے جھونکے بڑے تیز تھے۔ میں نے خچر کو وہیں چھوڑا اور خود اٹھ کر غار کے اندر چلا گیا۔ میں سونے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے لگا۔ غار میں اندھیرا تھا مگر محسوس ہوتا تھا کہ غار کافی کشادہ ہے اور اس کی چھت بھی اونچی ہے۔ میرے پاؤں تلے جو پتھر آ جاتے تھے ان کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ غار کی چھت اونچی ہے۔ میں دیوار کے ساتھ غار کے منہ سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ یہاں اتنی سردی نہیں تھی۔ بارش اور برساتی نالے کا شور بھی زیادہ سنائی نہیں دیتا تھا۔

اندھیری اور طوفانی بارش والی لمبی رات مجھے وہیں بسر کرنا تھی۔ کچھ دیر تک اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا پاروتی کے بارے میں سوچتا رہا کہ راج گرو پجاری نے پاروتی کو انسانی شکل میں لانے کے بعد منتر پڑھ کر اپنے قبضے میں کر لیا ہوگا۔ اور پاروتی کی یادداشت غائب کر دی ہوگی۔ یہ بات پاروتی نے مجھے ایک بار بتائی تھی کہ اگر کوئی زبردست طاقت والے سپیرے نے مجھے پکڑ لیا اور اسے شیش ناگ کا منتر بھی آتا ہوگا تو وہ مجھے اپنے قبضے میں کر سکتا ہے پھر میری یادداشت بھی غائب ہو جائے گی اور میں جن لوگوں کو پہلے دیکھ چکی ہوں' جن لوگوں سے پہلے مل چکی ہوں ان کو بالکل نہ پہچان سکوں گی۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ ایسی حالت میں پاروتی مجھے بھی نہیں پہچانے گی۔ پاروتی نے اتنی بات تو مجھے بتا دی تھی مگر آگے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا توڑ کیا ہوگا اور کس طریقے پر عمل کرنے سے اس کی یادداشت واپس آ سکے گی۔ یہی بات مجھے سخت پریشان کیے ہوئے تھی جس کی وجہ سے میری نیند غائب تھی لیکن نیند آنا ایک قدرتی بات ہے اور تو جوانی میں آدمی کو بڑی جلدی نیند آ جاتی ہے۔ مجھے بھی رات کے کسی پہر نیند آ گئی۔

آنکھ اس وقت کھلی جب میرا خچر زمین پر پاؤں مار رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا' غار کے دہانے میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے غار کی چھت کو دیکھا۔ یہ کسی مکان کی چھت نہیں تھی۔ پہاڑ کے اندر غار کی چھت تھی جس میں سے نوکیلے پتھر باہر نکلے ہوئے تھے اور جگہ جگہ سوراخ تھے۔ دیوار بھی کہیں باہر کو نکلی ہوئی تھی اور کہیں اندر کو دھنسی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ زمین پر پانی کے بہنے کا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی ایسا دریا یا پہاڑی نالا تھا جس کا دہانہ اوپر برفانی چوٹیاں پر تھا اور برف پگھلنے کے بعد اس میں پانی آتا ہوگا۔ اگر یہ برساتی نالہ ہوتا تو اب تک جتنی بارش ہوئی تھی اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں سیلاب آچکا ہوتا۔

میں غار کے دہانے پر بندھے ہوئے خچر کے پاس گیا۔ اسے تھپکی دی۔ باہر بارش بالکل نہیں ہو رہی تھی۔ کہیں کوئی درخت نہیں تھا۔ کسی پرندے کے چہچہانے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ آسمان پر بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ مجھے خود بھی تھوڑا بہت کھانا پینا تھا اور خچر کو بھی کھلانا پلانا تھا۔ یہی فیصلہ کیا کہ غار سے نکل کر آگے چلا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ آگے کوئی گاؤں آجائے۔ خچر کھول کر میں اس پر بیٹھ گیا۔ اسے آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے غار سے باہر نکلا اور جس پہاڑی راستے سے میں اوپر جا رہا تھا اسی راستے پر روانہ ہوگیا۔ بارش کے بعد ٹھنڈ زیادہ ہوگئی تھی۔ یہ بات بڑی غنیمت تھی کہ ہوا تیز نہیں چل رہی تھی۔

یہ ساری چڑھائی ہی چڑھائی تھی۔ آس پاس بھی بڑی چٹانوں کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ میرا خچر ان پتھروں کے درمیان سے ہو کر قدم قدم چل رہا تھا۔ یہ اس علاقے کا خچر تھا اور اسے پہاڑوں پر چڑھنے کی بڑی مہارت تھی۔ میں کسی ایک پہاڑی کی چڑھائی نہیں چڑھ رہا تھا۔ بلکہ یہ بہت سے پہاڑوں کی ڈھلانوں سے مل کر ایک وسیع و عریض ڈھلان بنی ہوئی تھی۔ اس ڈھلان میں کہیں خچر گہری کھائی میں اتر جاتا، کبھی چٹانوں کے درمیان بنے ہوئے تنگ راستے سے گزرتا۔ اب اوپر اور دائیں بائیں کہیں کہیں سفید برف پتھروں سے چمٹی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ کافی دیر تک چڑھائی چڑھنے کے بعد ایک کشادہ جگہ آگئی۔ یہاں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ کشادہ جگہ سے آگے پہنچے تو نشیب میں سیڑھیوں کی طرح بنے ہوئے دو تین ہرے بھرے کھیت دیکھ کر دل کو تسکین ہوئی کہ یہاں کسی نہ کسی دیہاتی کا مکان ضرور ہوگا۔ میں نے خچر کو کھیتوں کی طرف ڈال دیا۔ یہاں بھی کھیتوں کے قریب ہی اونچائی پر ایک گھر بنا ہوا تھا۔ میں اس طرح چلنے لگا۔ خچر کی پتھروں پر ٹاپوں کی آواز سن کر مکان میں سے ایک آدمی نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا حقہ تھا۔

اس آدمی نے میری بڑی خاطر داری کی۔ روٹی کھلائی۔ میرے خچر کے آگے چارہ ڈالا اور میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جس ناگ مندر میں میں جا رہا ہوں وہ ابھی اوپر کافی فاصلے پر ہے۔ اس نے کہا کہ سورج غروب ہونے سے پہلے برفانی علاقہ شروع ہوجائے گا۔ اس علاقے میں ایک جگہ مجھے تین برف پوش نوکیلی چٹانیں ساتھ ساتھ کھڑی نظر آئیں گی۔ ناگ مندر ان چٹانوں کے پیچھے ہے۔ یہ معلومات میرے لیے کافی تھیں۔ اس دیہاتی نے مجھے چار روٹیوں پر اچار ڈال کر ساتھ دے دیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سفر پر چل پڑا۔

دیہاتی نے سورج غروب ہونے سے پہلے برفانی پہاڑیوں کے شروع ہوجانے کا کہا تھا مگر دوپہر کے بعد ہی برف پوش ٹیلوں اور چٹانوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے تک میں برف پوش پہاڑیوں میں داخل ہوچکا تھا۔ اب میرا خچر برف پر چل رہا تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کی وجہ سے سورج دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن دن کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ سفر اب اس طرح کٹ رہا تھا کہ کہیں چڑھائی آجاتی اور کہیں برف پوش چٹانوں کے درمیان تھوڑی سی اترائی آجاتی۔ دور اوپر کی

وقت پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں بھی نظر آجاتی تھیں۔ میرے چاروں طرف اب برف ہی برف تھی۔ یہ برف نرم نہیں تھی۔ جمی ہوئی تھی جس کی وجہ سے خچر سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہا تھا۔ یہاں اتنی سردی نہیں محسوس ہو رہی تھی جتنی سردی نیچے تھی۔

جس وقت میں ایک برف پوش پہاڑی درے میں سے گزر کر دوسری طرف گیا تو شام کا ہلکا سرمئی اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ میں نے برفانی ٹیلوں کا جائزہ لیا تو مجھے اوپر ایک جانب تین برف پوش چٹانیں دکھائی دیں۔ یہ چٹانیں ساتھ ساتھ کھڑی تھیں۔ میں اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا۔ یہی وہ چٹانیں تھیں جن کے دوسری طرف پجاری راج گرو کا مندر تھا۔ مجھے وہیں جانا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے رات کا اندھیرا ہوجائے گا اور راستہ تلاش کرنے میں دشواری ہوگی۔ میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ میں کسی جگہ رک کر رات گزار لوں اور اگلے روز دن کی روشنی میں ان چٹانوں کی طرف چلوں۔ وہاں برف ہی برف تھی۔ رات بسر کرنے کا کوئی ٹھکانہ بظاہر نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے خچر کو ایک طرف ڈال دیا۔ خچر ایک ٹیلے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ٹیلے کے دوسری جانب پہنچ کر میں نے اوپر نگاہ ڈالی تو میں نے خچر کو وہیں روک لیا۔ سامنے ایک پہاڑی کا چبوترہ سا باہر کو نکلا ہوا تھا۔ چبوترے پر لکڑی کا چھوٹا سا ڈبہ نما کیبن بنا ہوا تھا۔ قدرت نے مجھے رات گزارنے کے لیے بڑی اچھی جگہ عنایت کردی تھی۔ میں خچر کو لے کر پہاڑی چبوترے کی طرف چلنے لگا۔ یہاں بڑے بڑے پتھر راستہ روک رہے تھے۔ میں خچر سے اتر پڑا۔ اس کی باگ تھام کر پیدل چل پڑا۔ تھوڑی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد میں چبوترے کے سامنے آگیا۔ چبوترے پر اور لکڑی کے کیبن کی چھت پر برف کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ دو تین سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ سیڑھیاں بھی برف پوش تھیں۔ میں نے خچر کو وہیں چھوڑا اور سیڑھیاں چڑھ کر لکڑی کے کیبن کا جائزہ لیا۔ خدا جانے یہ کیبن کس نے اور کس مقصد کے لیے یہاں بنایا تھا۔ کیبن کا لکڑی کا دروازہ بند تھا۔ کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ دروازے کے آگے چھوٹا سا برآمدہ تھا جس کے اوپر کیبن کی ڈھلانی چھت دو تین ستون پر کھڑی تھی۔

دروازے پر کوئی تالا نہیں پڑا تھا۔ شام کا اندھیرا رات کے اندھیرے میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے دروازے کو دھکیلا ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ میں اندر داخل ہوگیا۔ فرش لکڑی کا تھا جس پر ایک طرف سوکھی گھاس کا ڈھیر پڑا تھا۔ لکڑی کی ایک بڑی چوکی تھی۔ چوکی پر لکڑی کا گول تھال رکھا تھا۔ اس تھال میں مٹی کا ایک دیا سلائی کا بکس پڑا تھا۔ اس کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔ جس دیہاتی نے مجھے دو روٹیاں دی تھیں۔ اس نے مجھے ایک تام چینی کا پیالہ بھی دیا تھا کہ اگر پیاس لگے تو اس میں پانی ڈال کر پی لوں۔

سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ سوکھی گھاس کا گٹھا سا بنا کر باہر لے آیا اور خچر کے آگے ڈال دیا۔ خچر بڑے مزے سے گھاس کھانے لگا۔ کیبن میں آکر میں نے چراغ روشن کردیا وہاں پینے کا پانی کہیں نہیں تھا۔ میں نے ایک جگہ سے تھوڑی سی برف توڑ کر تام چینی کے پیالے میں ڈالی اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے چراغ کی لو پر گرم کرنے لگا۔ دو منٹ کے بعد برف پگھل کر پانی بن گئی۔ میں نے پیالہ جلتے ہوئے دیئے کے پاس ہی رکھ دیا اور روٹی نکال کر کھانے لگا۔ روٹی کھانے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے بعد میں باہر آ گیا۔ خچر ساری گھاس کھا گیا تھا اوراب برف پر منہ مار رہا تھا۔ شاید وہ اپنی گرم زبان اور سانس کی گرمی سے برف میں سے پانی نکال کر پی رہا تھا۔ میں اسے چبوترے پر لے آیا اور برآمدے میں ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ خود کیبن میں آ کر سوکھے گھاس کے ڈھیر میں گھس کر سمٹ سمٹا کر بیٹھ گیا۔ گھاس نے مجھے گرم کردیا۔ میں نے دیا بجھادیا اور وہیں گھاس پر اکٹھا ہو کر سو گیا۔

کچھ معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کچھ ایسا خیال آ رہا تھا کہ خچر نے زور سے برآمدے کے فرش پر پاؤں مارے تھے۔ می نے کان لگادیئے۔ خچر نیا یک بار پھر فرش پر پاؤں مارے۔ میں آہستہ سے اٹھا اور بند دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ باہر سفید برف کی وجہ سے رات اتنی اندھیری نہیں تھی جتنی میدانی علاقوں میں ہوتی ہے۔ میں نے ایک انسانی سایہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر ڈھلان کی طرف جاتے دیکھا۔ پہلے تو مجھے خوف محسوس ہوا کہ یہ کوئی ڈاکو یا قاتل قسم کا آدمی نہ ہو پھر خیال آیا کہ اگر وہ ڈاکو یا قاتل ہوتا تو مجھے مار ڈالتا اور میرا خچر کھول کر لے جاتا لیکن اس نے دونوں میں سے ایک بھی کام نہیں کیا تھا۔ سایہ جو مجھے نظر آیا تھا وہ بالکل انسان کی طرح تھا پھر یہ کون تھا اور برآمدے میں کس غرض سے آیا تھا؟

پہلے تو میں نے سوچا کہ اس کا پیچھا کروں اور معلوم کروں کہ یہ کون تھا پھر یہ سوچ کر وہیں کھڑا رہا کہ خواہ مخواہ مجھے کسی مصیبت میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے پہلے سے ہی میں جس مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں میرے لیے کافی ہے۔ میں نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی اور خشک گھاس کی ڈھیری میں آ کر گھس گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن کچھ تجسس اور کچھ خوف کے مارے اب مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرا ذہن بار بار اس انسانی سائے کی طرف جاتا جو مجھے برآمدے سے اتر کر نشیب میں جاتا دکھائی دیا تھا۔ آخر یہ کون تھا؟ ضرور کوئی بھوت پریت ہوگا۔

یہی سوچتے سوچتے میں اونگھنے لگا۔ مجھے شروع ہی سے اونگھنا پسند نہیں رہا۔ مجھے بیداری اچھی لگتی ہے یا نیند اچھی لگتی ہے لیکن اونگھنا جو بیداری اور نیند کی درمیانی حالت ہے سخت بری لگتی ہے۔ اس حالت میں ایک تو آدمی کو اپنے اوپر کنٹرول نہیں رہتا دوسرے گردن انتہائی بے بسی کے عالم میں کبھی ادھر کو گرنے لگتی ہے کبھی ادھر کو اپنے آپ جھک جاتی ہے۔ اونگھنے کی حالت میں انسان عجیب عجیب مضحکہ خیز شکلیں بناتا ہے۔ میں اونگھنے کی بجائے گھاس پر دراز ہو گیا اور آنکھیں بند کرلیں تاکہ سو جاؤں اور اونگھنے کی کیفیت سے نجات ملے۔ نیند مجھے اپنی آغوش میں لینے ہی والی تھی کہ برآمدے میں میرے خچر نے زور زور سے پاؤں مارے۔ اس کے شور سے میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جلدی سے دروازہ کھول کر دیکھا۔ خچر اب اطمینان سے کھڑا تھا۔ ایک آدھ منٹ میں دروازے میں کھڑا سفیدی مائل برفانی رات کے اندھیرے میں جائزہ لیتا رہا اس دفعہ مجھے وہ انسانی سایہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں دروازہ بند کر کے گھاس کی ڈھیری پر آ کر بیٹھ گیا۔ اب نیند بالکل غائب تھی۔ یہ جگہ مجھے کچھ پراسرار اور آسیبی لگنے لگی تھی۔ دیا بجھا ہوا تھا کیبن میں اندھیرا تھا۔ میں گھاس کی ڈھیری میں گھس کر خاموش بیٹھا تھا۔

اچانک مجھے شوں شوں کی دو آوازیں سنائی

دیں۔ خوف کے مارے میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

اس سنسان برفانی پہاڑیوں میں رات کے سناٹے میں یہ آواز ایسی خوفناک لگی کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ باہر جا کر معلوم کروں کہ یہ آواز کس چیز کی ہے۔ جب تھوڑے وقفے کے بعد ایک بار پھر وہی آواز سنائی دی تو مجھے شک پڑا کہ باہر کوئی جنگلی ریچھ خچر کو کھانے نہ آ گیا ہو اور یہ اس کی آواز نہ ہو۔ میں آہستہ سے اٹھا اور دروازہ کھول کر برآمدے میں نظر ڈالی۔

برآمدہ سنسان پڑا تھا۔ خچر سر جھکائے ایک جگہ ایسی حالت میں کھڑا تھا جیسے کھڑے کھڑے سو گیا ہو۔ میں ہمت کر کے خچر کے پاس آ گیا۔ خچر میری بو پا کر ذرا سا خرخرایا اور پھر اپنی جگہ پر ساکت ہوگیا۔ خچر زندہ تھا۔ وہاں کوئی جنگلی درندہ وغیرہ بھی نظر نہ آیا۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ میرے ہاتھ ٹھٹھرنے لگے پھر بھی میں برآمدے میں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا کہ دیکھوں کہیں درندہ مجھے دیکھ کر ادھر ادھر نہ ہو گیا ہو لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ شاید خچر نے ہی شوں شوں کی تھی۔ میں واپس کیبن میں آ کر گھاس پر لیٹ گیا۔ خشک گھاس اس برفانی رات میں میرے لیے بستر سنجاب و سمور سے کم ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے جب مجھے اونگھ آئی تو میں نے اونگھ سے بچنے کے لیے یہی مناسب سمجھا کہ سب خیریت ہے اب مجھے سو جانا چاہیے۔ چنانچہ میں میں سو گیا۔

آخر رات گزر ہی گئی۔ دن نکل آیا ہر طرف روشنی ہی روشنی ہوگئی۔ سورج ابھی تک بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ یہی بڑی غنیمت تھی کہ بارش رکی ہوئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ میں پہاڑوں میں جس بلندی پر پہنچ گیا ہوں وہاں اب بارش نہیں ہوگی بلکہ برف گرے گی۔ میں نے جلدی جلدی رات کی بچی ہوئی روٹی کھائی۔ پیالے میں تھوڑی سی برف ڈال کر اسے چراغ کی لو کے اوپر رکھ کر اس کا پانی بنایا اور پی کر خدا کا شکر ادا کیا۔ کیبن سے گھاس لا کر میں نے خچر کے آگے ڈال دی تھی جسے وہ بڑے مزے سے کھا رہا تھا۔ جب خچر میری طرح تازہ دم ہو گیا تو ہم دونوں نے اوپر کی جانب اپنا سفر شروع کردیا۔ دو پہاڑیوں کی ڈھلانیں جہاں آ کر ملتی تھیں وہاں برف پر ایک قدرتی پگ ڈنڈی بن گئی تھی۔ خچر اسی پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ میں خچر پر بیٹھا تھا اور میری نگاہیں اوپر ان تین برف پوش چٹانوں پر لگی تھیں جہاں مجھے پہنچنا تھا۔ پہاڑیوں میں برفانی راستوں پر سفر کرتے ہوئے کبھی یہ چٹانیں میری نظروں سے اوجھل ہو جاتیں اور کبھی اچانک سامنے آ جاتی تھیں۔ اسی طرح سفر کرتے کرتے آخر میں اس پگڈنڈی پر آ گیا جو سیدھی اوپر چٹانوں کی طرف جاتی تھی۔

میں نے اپنے دل میں سوچ لیا تھا کہ مجھے اوپر راج گرو کے پاس جا کر کیا کرنا ہوگا اور اس سے کیا کہنا ہوگا۔ یہ حقیقت میرے پیش نظر تھی کہ اگر وہاں پر پاروتی موجود ہوگی تو راج گرو نے اپنے خاص منتر کی مدد سے اس کی یادداشت گم کر کے اسے اپنے قبضے میں کر رکھا ہوگا اور وہ مجھے دیکھ کر بھی نہیں پہچان سکے گی کہ میں اس کا ساتھی اور دوست ہوں۔ خچر آہستہ آہستہ برفانی پگڈنڈی کی چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ تینوں چٹانیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ جب خچر اور میں ان چٹانوں کے نیچے پہنچ گئے تو میں خچر

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے اتر پڑا۔ اس کی باگ تھام لی اور برف پر احتیاط سے چلتا ہوا چٹانوں کے پیچھے آیا تو سامنے ایک چھوٹا سا مکان نظر آیا جس کی مخروطی چھت کے اوپر پیتل کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ یہ کوئی مندر ہے۔ یہ مکان نما مندر بھی پتھروں کے ایک چبوترے پر بنا ہوا تھا اور اس کے آگے بھی چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ آدمی کوئی نہیں تھا۔

ایک بات میرے حق میں بڑی اچھی ہوئی تھی کہ مندر میں راج گرو نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اسے یہ تو پتا چل گیا تھا کہ ایک نوجوان ناگن عورت کی لاش کے ٹکڑے لے کر مندر میں آیا ہے جس نے لاش کے ٹکڑے ڈبے میں ڈال کر تالاب میں لٹکا رکھے ہیں لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ نوجوان میں ہوں۔ بقول رکمنی کے راج گرو نے اپنے گیان دھیان سے میرے بارے میں پتا چلا لیا تھا اور وہ آدھی رات کے وقت وہاں پہنچا تھا اور پجاری سے مل کر لاش والا ڈبہ تالاب سے نکال کر اسی رات منہ اندھیرے وہاں سے واپس روانہ ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں بے دھڑک اوپر جارہا تھا کہ اگر راج گرو نے مجھے دیکھ بھی لیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تھا۔ جہاں تک پاروتی کا سوال تھا تو اس کی یادداشت راج گرو نے منتر پڑھ کر ضرور غائب کردی ہوگی۔ دوسری صورت میں وہ اس کے قابو آ ہی نہیں سکتی تھی اور یادداشت گم ہو جانے کی وجہ سے پاروتی کے لیے میں بھی اجنبی ہی ہوں گا۔ میں نے خچر کو ایک طرف چھوڑ دیا اور خود چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ کر راج گرو کے مندر کے برآمدے میں آ گیا۔ سامنے صحن میں پتھر کے سانپوں کے دو مجسمے بنے ہوئے تھے جن پر برف جمی ہوئی تھی۔

مندر کا دروازہ بند تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ تین چار بار دستک دینے سے ایک عورت نے دروازہ کھول کر مجھے گھور کر دیکھا۔

''کون ہو؟ کیا کام ہے؟''

یہ عورت تبتی کی لگتی تھی۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور نتھنے کشادہ تھے۔ درمیانی عمر کی عورت تھی۔ اس نے گرم لہنگا اور اونی چغہ پہنا ہوا تھا۔ وہ اردو ٹھیک ٹھاک بول رہی تھی۔ میں نے کہا۔

''راج گرو کے درشن کرنے بڑی دور سے چل کر آیا ہوں۔ میرا نام بھیکو ہے۔''

عورت نے کوئی جواب نہ دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ سردی بہت تھی مگر مجبور تھا۔ عورت مجھے کچھ کہے بغیر دروازہ بند کر کے چلی گئی تھی۔ مگر اس کی شکل سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اندر سے کسی کو بلانے گئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسی عورت نے دوبارہ دروازہ کھولا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اندر ایک نیم روشن ڈیوڑھی تھی۔ آگے ایک دالان تھا جس کے فرش پر چھت نہ ہونے کی وجہ سے برف جمی ہوئی تھی۔ سامنے ستونوں والا پرانی ٹائپ کا دالان تھا۔ عورت دالان کے کونے والے کمرے یا کوٹھری کے دروازے پر جا کر رک گئی۔ اس نے دروازے کے باہر لٹکی ہوئی تانبے کی چھوٹی سی گھنٹی کو ہاتھ سے بجایا۔ اندر سے کسی کی بھاری مگر کرخت آواز آئی۔

(باقی آئندہ ماہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM